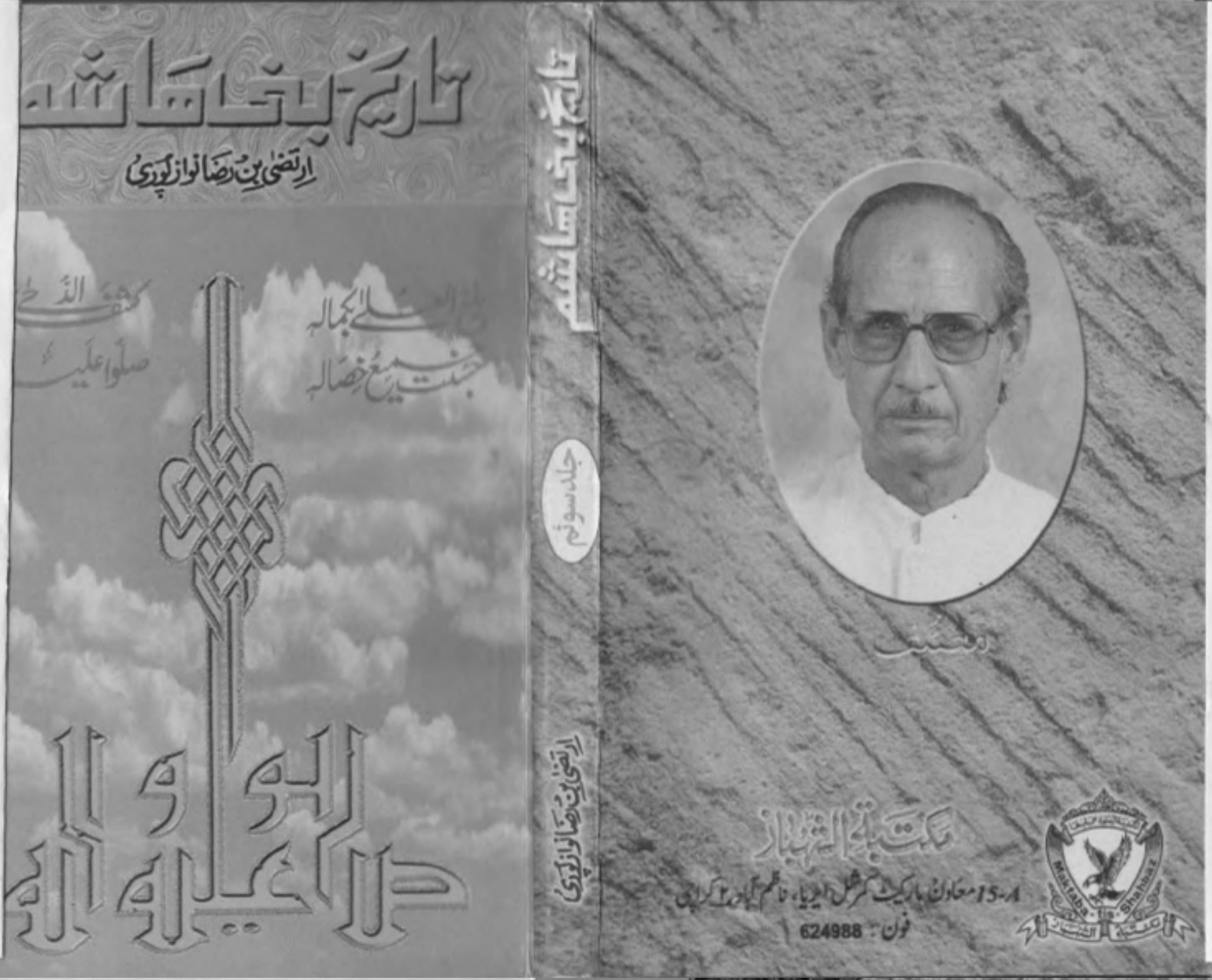

انتساب

میں اپنی اس کاوش کو خاندانِ بنی ہاشم کے ان شہیدوں کے نام منسوب کرتا ہوں جنہوں نے اسلام کی بقاء و سربلندی کیلئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔

ارتضیٰ نواز پوری

جملہ حقوق حق مصنف محفوظ ہیں

بار اول .... مارچ ۲۰۰۱ء
تعداد .... ایک ہزار
ناشر ....مکتبۃ الشہباز
طابع .... دلاور حسین زیدی
مطبوعہ ....لوکھائی پرنٹنگ پریس
قیمت .... =/90 روپے

برائے ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن رمضان علی
اختر النساء بنت علی جان
سید علی انصر ابن شبیر حسن
سیدہ حسنیٰ بنت اخلاق حسین

نگرانئ اِمام میں ھو گا یہ نیک کام
اچّھا ھے وقت خواب کی تعبیر کے لئے
محشر میں فاطمہؑ تجھے کر دیں گی سرخرو
اٹھ جنّت البقیع کی تعمیر کے لئے
آصف لکھنوی

JANNATULBAQI PDF
Join us for Pdf Books @ Telegram Link
http://t.me/jannatulbaqii
App:- JANNATUL BAQI on Google Play Store
Please intsall & registered your Condemn

مشمولات

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
انتساب	۳	اسوہ حسنہ	۵۱
مشعمولات	۴	لباس مبارک	۵۴
تقریظ	۷	ممانعت جامع حریر	۵۵
مولانا سید شبیہ الرضاصاحب		آداب طعام - مرغوب رنگ	۵۶
سخن ہائے گفتنی	۱۱	خوشبو سے خاص شوق	۵۶
ڈاکٹر پروفیسر عسکری حسن صاحب		نفاست پسندی	۵۷
ابتدائیہ	۱۴	شہسواری و نیزہ بازی	۵۷
خاتم تا دائم (باب سوئم مسلسل)	۱۷	معمولات روز و شب	۵۸
نبی آخر الزماں	۱۸	معمولات عبادت - نماز	۶۰
دعائے خلیل	۱۸	روزہ - زکواۃ	۶۳
نبوت و رسالت	۲۱	حج	۶۴
خصائص و لوازم	۲۳	خطابت	۶۵
صفات و شرائط	۲۶	صبروشکر	۶۷
وحی _ علامات نبوت	۲۹	اخلاق نبوی	۷۰
تقرر انبیاء	۳۱	حسن خلق	۷۳
معرفت الٰہی	۳۳	عدل و انصاف	۷۵
غرض بعثت	۳۴	جودوسخا - مساوات	۷۶
توریت کا بیان	۳۷	عزم و استقلال	۷۷
اطاعت رسولؐ	۳۷	جانشینی رسول	۷۸
ختم نبوت	۴۰	عقائد جانشینی	۷۹
مستشرقین اور اسلام	۴۲	امام و خلیفہ	۷۹
معمولات پیغمبرؐ	۴۸	غرض تعین امام	۸۰
شمائل	۴۸	تعین امام	۸۱
مہرنبوت	۴۹	سنت انبیاء	۸۲
رفتار مبارک - طرز گفتگو	۵۱		

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
شرائط و صفات امام	۸۶	محمد حنفیہ	۲۰۶
اطاعت امام	۸۷	نام و کنیت	۲۰۶
خلیفہ کا تقرر	۹۳	ولادت	۲۰۷
افضل و مفضول	۹۵	تربیت - شجاعت	۲۰۸
خلافت ظاہری	۱۰۲	قدرومنزلت	۲۱۱
تجویز و تائید	۱۰۲	شہادتِ حسینؑ کے اثرات	۲۱۳
بیعت خلافت	۱۰۳	وفات	۲۲۰
بیعت اہل کوفہ	۱۰۵	دعویٰ امامت	۲۲۱
ناصبیت	۱۰۷	اولاد	۲۲۳
ابن تیمیہ	۱۰۸	شجرہ	۲۲۶
اہلسنت کے ارشادات	۱۱۱	حضرت ابوالفضل العباسؑ	۲۲۸
فتوحات ملکی	۱۱۷	ولادت باسعادت	۲۲۸
القرآن	۱۲۵	القاب و کنیت	۲۲۹
حروف مقطعات	۱۲۸	قمر بنی ہاشم	۲۲۹
حضرت علیؑ قرآن کی روشنی میں	۱۳۰	ابوالقربۃ سقائے حرم	۲۳۰
قرآنی آیات	۱۳۱	عبدصالحؑ باب الحوائجؑ	۲۳۱
حضرت علی حدیث کی روشنی میں	۱۷۳	ابوالفضلؑ ابوالقاسم	۲۳۱
اولاد امیر المومنینؑ	۱۹۶	حسب و نسب	۲۳۲
دختران	۱۹۹	ام البنین	۲۳۲
فرزندان	۲۰۱	طفولیت و تربیت	۲۳۵
ابوبکر	۲۰۲	علم و علمداری	۲۳۶
عبداللہ عثمانؑ جعفرؑ محمد اوسط	۲۰۳	اولاد	۲۳۹
عونؑ محمد اصغرؑ ابوالفضل عباس	۲۰۴	عبیداللہ	۲۴۰
ایک اعتراض	۲۰۴	عباسؑ حمزۃ الاکبر	۲۴۱
		ابراہیم جروتہ	۲۴۲
		شجرہ	۲۴۳
		فضل	۲۴۳

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
عمراطرف	۲۴۵	قرآن	۲۹۷
نام و کنیت	۲۴۵	سنت	۲۹۸
وفات - اولاد	۲۴۸	اجماع - اصول دین	۲۹۹
شجرہ	۲۵۰	توحید	۳۰۰
حضرت زینبؑ	۲۵۲	عدل	۳۰۳
نام و کنیت - ولادت	۲۵۲	نبوت	۳۰۵
تعلیم و تربیت	۲۵۲	امامت	۳۱۰
عقد	۲۵۳	شیعہ فرقے	۳۱۴
فضائل و مراتب	۲۵۴	کیسانیہ زیدیہ	۳۱۶
جناب زینب کربلا میں	۲۵۵	زیدی اور زیدیہ	۳۱۸
جناب زینب کوفہ میں	۲۵۶	اسماعیلیہ	۳۱۹
خطبہ جناب زینب	۲۵۷	باطنیہ	۳۲۱
حضرت زینب شام میں	۲۶۰	قرامطہ	۳۲۳
خطبہ	۲۶۴	نزاریہ - مستعلیہ - دروزیہ	۳۲۴
وفات	۲۷۲	مقنع - چند حقائق	۳۲۵
جائے مدفن	۲۷۵	شیعت سے تعصب	۳۲۷
شیعہ و شیعت	۲۷۸	اکثریت کا برتاؤ	۳۲۹
دین - مذہب	۲۷۹	حجر بن عدی کا قتل	۳۳۲
مذہب شیعہ	۲۸۰		
تاریخ مذہب شیعہ	۲۸۱		
مذہب شیعہ امامیہ	۲۸۵		
مخصوص نظریات	۲۸۵		
عقائد شیعہ امامیہ	۲۹۱		
درجات قوت عقلیہ	۲۹۳		
علوم شرعیہ	۲۹۵		
دلائل شرعیہ	۲۹۶		

تاریخ بنی ہاشم پر ایک نظر

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدائی تدوین ملوکیت کے دسترخوان کے نمک خوار مورخین کے ہاتھوں انجام پائی جنہوں نے اسلام اور بانئی اسلام کے صحیح حالات و واقعات قلمبند کرنے کے بجائے ملوکیت کا حق نمک ادا کیا اور اسلام کی تاریخ کا چہرہ مسخ کر ڈالا۔

اس طرح اسلام کے پاکیزہ نظام کو ٹھیس پہنچی اور غضب یہ ہے کہ سیرت نگاروں نے بھی ہر طرح کا ظلم روا رکھا۔ غیروں نے اسلام کی مسخ شدہ تاریخ کو پڑھ کر اسلام کو دہشت گرد دین قرار دیا۔ لیکن خدائے ذوالجلال نے عالم اسلام پر رحم فرمایا اور اسی مسخ شدہ تاریخ میں اختلاف رائے کے ساتھ حقیقت بھی چھپی رہی۔ تاریخ کے جنگل میں جہاں کانٹے دار جھاڑیاں بودی گئیں وہیں حقیقت کا گلشن بھی پھلتا پھولتا رہا اور اس طرح گلچیوں نے ہر دور میں زحمت برداشت کر کے اسلام کے حقیقی خدوخال کو ابھارتے رہے یہانتک کہ غیر مسلم مورخین نے بھی اکثر مقامات پر غیر جانب دار ہو کر تاریخ اسلام کے صحیح خدوخال رقم کر دیئے۔

ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں خدا کے نیک اور صالح بندگان نے زحمات کو برداشت کیا اور تاریخ کے صحرا میں پیچیدہ پگڈنڈیوں سے حقیقت کی تلاش میں سفر جاری رکھا اور بالآخر انہیں سو فیصد نہ سہی ایک وسیع حد تک کامیابی ہوئی اور انہوں نے اسلام کی خدمت کرتے ہوئے وسائل کی پروا کئے بغیر نامساعد حالات میں بھی ہمت نہ ہاری اور اپنا سفر جاری رکھا اور فرزندان توحید

تک حقائق پہنچادیئے۔ یہ قسمت کی بات ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں آخرت کا متلاشی حق کیساتھ ملحق ہوجاتا ہے اور بعض بدقسمت افراد روزِ روشن کی طرح واضح ان دلائل کو اپنی فکر کی کورچشمی کے سبب نہیں دیکھ پاتے۔

آج کے ماحول میں بالخصوص ایشاء کے اس خطے میں جہاں ہم زندگی بسر کررہے ہیں کتاب خریدنے کا شوق بہت کم ہے۔ ویسے بھی ناولوں اور ڈراموں اور مختلف فلموں نے امت مسلمہ کا ذوق مطالعہ بالخصوص اسلامی کتب کے مطالعے کے شوق کو مردہ کردیا ہے ایسے میں مردان حق جوحق پسند ہیں وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ ایک ثمردار شجر کی طرح اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر علم کی روشنی پھیلائی اور اپنی زندگی کو کامیاب بنادیا۔

انہیں افر، بں سے جناب ارتضی بن رضا نواز پوری صاحب ایک ہیں جنہوں نے تاریخ بنی ہاشم جیسی کتاب لکھ کر آل محمد علیہم السلام سے حق مودت ادا کیا۔ اور ایک اچھوتے اندازِ فکر سے قلم کا حق ادا کیا۔

موصوف نے تاریخ بنی ہاشم کو ابواب میں تقسیم کیا اور اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر کتب و تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

تاریخ بنی ہاشم کی پہلی جلد حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر جناب عبداللہ بن عبدالمطلب پر تمام ہوتی ہے میں نے بعض موضوعات کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ موصوف نے خاصی محنت کیساتھ حتی الامکان تاریخ انبیاء اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کے بارے میں باطل نظریات کو مضبوط دلائل کیساتھ رد کیا ہے۔

ملوکیت کے ایماء پر لکھی جانے والی تاریخوں نے تو انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں بخشا۔ بھلا وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کو کیسے معاف کرسکتے تھے۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام جیسے صاحب ایمان اور محسن اسلام و مربی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی عظیم المرتبت شخصیت جن کے

احسانات کو قرآن تو بیان کرے لیکن ملوکیت کے دسترخوان پر پلنے والے مورخین نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ کسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے والد محترم اور نبی اکرمؐ و بی بی خدیجہ طاہرہ کے نکاح خواں کو کافر ثابت کردیا جائے۔ اور پھر جناب ابوطالب ہی کا کیا کہنا ان کے قلم سے انبیاء علیہم السلام بھی محفوظ نہیں رہے۔ خدا وند علیم و حکیم کے معصوم نمائندوں پر بھی گستاخانہ اور مجرمانہ حملے۔۔۔ کئے جن کو میرا قلم نقل کرنے سے قاصر ہے۔

بقول مولانا کوثر نیازی مرحوم کے کہ تاریخ نے حضرت علی علیہ السلام کا وہ حلیہ پیش کیا ہے کہ جو خوبصورت تو کجا قبول صورت بھی نہیں۔ یعنی بنی امیہ اور بنی عباس کے مورخین نے ہر طرح سے آل محمد علیہم السلام کی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔

پنجتن علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کے فرد امام حسن علیہ السلام پر بعض مورخین نے کثیر النکاح اور کثیر الطلاق ہونے کا الزام تراشا ہے۔ افسانۂ ازدواج امام حسن علیہ السلام میں کہیں ۱۰۰ بیویاں اور کہیں ۲۰۰ بیویاں اور سو کنیزیں لکھیں لیکن سچ کہا ہے کہ "دروغ گورا حافظہ نباشد" جھوٹے آدمی کا حافظہ نہیں ہوتا۔ ایسے متضاد بیان کہ "الامان الحفیظ" نہ تو وہ الزام تراش مورخ یہ بتا سکے کہ وہ عورتیں جن سے امام علیہ السلام نے ازدواج فرمایا وہ کس قبیلے سے متعلق تھیں انکے ماں باپ کون تھے کم از کم انکے نام ہی بتاتے۔ تاریخ میں ان کی کیا حیثیت ہے کن وجوہات کی بنیاد پر انہوں نے امام علیہ السلام کو اپنی بیٹیاں دیدیں جب کہ وہ جانتے تھے کہ یہ (نقل کفر کفر نہ باشد العیاذ باللہ) یعنی امام حسن علیہ السلام کثیر الطلاق بھی ہیں اور کثیر الزواج بھی' آخر ان لوگوں کو اپنی بیٹیوں سے کیا عداوت تھی کہ وہ ایسے شخص سے اپنی بیٹیاں بیاہ دیں جسکے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ کسی بھی وقت طلاق دے سکتے ہیں۔ خدا برا کرے تعصب کا کہ حسن مجتبیٰ علیہ السلام جیسے خلق کریمانہ اور حلیم الطبع عصمت مآب امام پر ایسی تہمتیں لگا کر آخرت

خراب کی۔ اور پھر طرفہ یہ ہے کہ یزید و مروان ایسے عیاش و مکار فاسق و فاجر کو نیک نام کرنے کیلئے ایسے فضائل گھڑے گئے کہ عقل سلیم محو حیرت ہے کہ شیطان ملعون نے کس طرح ان مورخین کے اوسان پر قبضہ جمایا ہے کہ عاقبت کی پرواہ کئے بغیر ان عقل کے اندھوں نے وہ کرتوت انجام دیئے کہ اسلام کو غیر مسلم نے سلامتی والے دین کے بجائے دینِ فساد سمجھا۔ خداوند عالم ایسے مفسد افراد سے امۃ مسلمہ کو محفوظ رکھے۔

"تاریخ بنی ہاشم" کی دوسری جلد جو گذشتہ سال شائع ہوئی اور تیسری جلد جو زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی ہے ان میں پیغمبر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی ذریت طیبہ اور خانوادہ عصمت و طہارت کے معصوم نما افراد کی سیرت پر روشنی ڈالنے کیساتھ ساتھ چند ایک ایسے اہم موضوعات پر بھی سیر حاصل بحث کی جو عام افراد کی دسترس میں نہ تھے بلکہ بعض متعصب افراد انہی مسائل کو چھیڑ کر عوام الناس اور سادہ لوح انسانوں کو فریب دینے کیلئے توڑ مروڑ کر بیان کرتے تھے جس میں جانشینی پیغمبرؐ قرآن حکیم اور لفظ شیعہ اور شیعت کے ابواب خاص توجہ کے حامل ہیں۔

ملت جعفریہ پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کا قرآن چالیس پاروں کا ہے جو امام زمانہؑ اپنے ساتھ غار میں لئے گئے ہیں اور جب ان کا ظہور ہوگا تب وہ اس قرآن کو پیش کریں گے۔

اس طرح مصنف نے اولاد آئمہ معصومین علیہم السلام کے حالات و واقعات جو متفرق کتب میں بکھرے ہوئے تھے ان موتیوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرودیا ہے۔

سید ارتضی بن رضا نواز پوری اس دور قحط الرجال میں قابل صد مبارکباد ہیں کہ جنہوں نے وسائل کی کمی کی پرواہ کئے بغیر ان جواہر کو جمع کرکے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ہے خداوند کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ چہاردہ

معصومین علیہم السلام کے صدقے موصوف کو صحت و سلامتی کیساتھ طول عمر عطا فرمائے اور زندگی کے آخری سانس تک اسطرح کی خدمات انجام دینے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ ساتھ ہی یہ بات اگر نہ کہوں تو حق تلفی ہوگی کہ موصوف نے اپنی اولاد کی تربیت بھی اس انداز میں کی ہے کہ انکے فرزندان بھی اس خدمت کی انجام دہی میں موصوف کے شانہ بہ شانہ مصروف عمل ہیں ورنہ اس دور خودغرضی میں اولاد کہاں ساتھ دیتی ہے۔ عزیزی مرتضی زیدی صاحب جو کہ مصنف کے فرزند اکبر ہیں اور ان کے بھائی ارشد حسین اور دلاور حسین بھی مخلصانہ خدمت انجام دے رہے ہیں خداوند کریم امت مسلمہ کو ان کتابوں کے مطالعے کا شوق عطا فرمائے اور حق آشنا بنائے۔ والسلام

سید شبیہ الرضا زیدی الحسینی
وکیل آیۃ اللہ العظمیٰ آقائی سید علی سیستانی دام ظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین
ایم اے۔ ایل ایل بی۔ فاضل ادب۔ پی ایچ ڈی۔

مجھے بڑی مسرت ہے کہ جناب ارتضیٰ زیدی نواز پوری کی تحریر کردہ تاریخ کی تیسری جلد منظر عام پر آگئی ہے۔ یہ تاریخ نہ صرف قوم کی امنگوں کی آئینہ دار کتب تاریخ اسلام میں ایک گرانقدر اضافہ اور تحقیق و تفکر کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ جناب ارتضیٰ زیدی کی یہ کاوش ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صداقت وحقائق کا روشن اور منور چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ آپ نے حضرت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ' سیرت و کردار' انداز تبلیغ اور تعلیمات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر کے اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ جو قارئین کیلئے معلومات کا ایک گراں بہا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے جانشینیٔ رسولؐ کے فکری مگر پیچیدہ موزوں پر جس طرح سیر حال تبصرہ فرمایا ہے اور جس کاوش و محنت اور دلائل سے اسے انتہائی سبق آموز اور دلچسپ انداز میں تحریر فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ قرآن حکیم کے نزول' اس کے مضامین' فصاحت و بلاغت' انداز خطابت پر انتہائی عالمانہ تبصرہ بھی اس کتاب کی عظمت کو چار چاند لگا رہا ہے۔

''حضرت علیؑ حدیث کی روشنی میں'' تحریر فرما کر لوگوں کی معلومات میں اضافہ اور حضرت علیؑ کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے اعلیٰ مرتبہ سے واقفیت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اولاد امیر المومنین کا باب وقت کی اہم ضرورت

ہے کیونکہ تجربہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان اس شجرۂ طیبہ کو بالکل بھولتے جا رہے ہیں حالانکہ واقع کربلا کے بعد خاندان رسالتؐ کے افراد نے جس طرح قربانیاں دیں اور جو جدوجہد کی اس کی مثال تاریخ اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان حضرات نے اسلام کی بقاء اور اس کے حقائق کو منظر عام پر لانے کیلئے جلاوطنی برداشت کی قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کیا۔ جانوں کے نذرانے پیش کئے غرضیکہ اسلام کی عظمت اور اس کے عالمگیر پیغام کو معدوم ہونے سے بچا گئے۔

یہ قربانیاں اتنی عظیم اور موثر تھیں کہ مسلمان سلاطین ان کو مٹانے اور ان کی راہ کو تبدیل کرنے کی از حد کوششیں کیں مگر وہ اپنے اسلام دشمن عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپنے ''شیعہ اور شیعت'' کا باب تحریر فرما کر مذہب حقہ پر وارد ہونے والے اعتراضات کا شافی و کافی جواب دیکر غیر جانبدار اور غیر متعصب قارئین کی معلومات میں بیش قیمت اضافہ فرمایا ہے۔ اور بعد میں ظہور پذیر ہونے والے مختلف مذاہب پر سیر حاصل تبصرہ فرما کر ان میں اور اصل شیعت میں ایک حد فاصل قائم کی ہے۔

فی الحقیقت یہ تاریخ جناب ارتضیٰ زیدی کے علم و تحقیق کی آئینہ دار ہے۔ میری گذارش ہے کہ حقیقی معلومات اور صحیح تاریخی واقعات کے متلاشی اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں اور اس خزانے میں جناب ارتضیٰ زیدی نے معلومات و تحقیق و کاوش کے جو جواہرات جمع کر دیئے ہیں ان سے ضرور استفادہ کریں کیونکہ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی آنکھوں کے روبرو صحیح اور حقیقی اسلام کی تصویر نظر آئے گی۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب ارتضیٰ زیدی کو تمام آفات سے محفوظ اور صحت مند رکھے تاکہ وہ ایسی ہی کتابیں تصنیف کر کے تشنگان علم کی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین)

ابتدائیہ

شکر ہے اس رب ذوالجلال کا جس نے اپنے کمزور و ناتواں بندوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے کی قوت و صلاحیت عطا فرمائی۔ الحمد اللہ کہ تاریخ بنی ہاشم کی تیسری جلد پایۂ تکمیل کو پہنچی اور یہ بندۂ ناچیز آج یوم عید قربان اس کتاب کا ابتدائیہ تحریر کرنے کے قابل ہوا۔

ہماری کوشش تھی کہ جناب رسالتمابؐ جناب علی مرتضیٰؑ اور جناب حسن مجتبیٰؑ کے تذکرے جلد دوئم ہی میں مکمل کر دیں لیکن ان متبرک و معزز ہستیوں کے حالات و واقعات اتنے کثیر ہیں کہ ان کی تحریر کے لئے ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہیں۔ لہٰذا ہماری ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی اور ہمیں جلد سوئم بھی انہی ذوات مقدسہ کے لئے مختص کرنا پڑی۔ گوکہ ہم نے جلد دوئم مین مرقوم واقعات کے بیان میں بھی انحصار سے کام لیا اور اب سوئم میں بھی چیدہ چیدہ حالات مختصراً تحریر کئے ہیں۔ اس طرح تاریخ بنی ہاشم کی جلد دوئم اور سوئم جناب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' جناب وصی رسول اللہ کرم اللہ وجہہ اور جناب سبط مصطفیٰ علیہ السلام کے اذکار سے مزین ہیں۔

تاریخ بنی ہاشم کی جلد دوئم کی تدوین کے وقت مضمون کی زیادتی کے

باعث جو کاٹ چھانٹ کرنا پڑی اس کی وجہ سے تصحیح کے باوجود کچھ غلطیاں رہ گئیں اس کے علاوہ کمپیوٹر کی مہربانی سے صحیح الفاظ کے حروف غائب ہو گئے۔ اس طرح ہماری خواہش اور کوشش کے باوجود اس جلد میں تصحیح کا معقول معیار قائم نہ رہ سکا جس کیلئے ہم اپنے جملہ قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

تاریخ بنی ہاشم کی جلد سوئم میں چند مقامات پر فقہی مسائل زیر بحث آئے ہیں چونکہ علم فقہ کی اصطلاحات اور عبارت کی بندش مخصوص ہوتی ہے اس لئے عام فہم زبان کی نسبت قارئین کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں قدرے دشواری پیش آتی ہے گوکہ ہم نے بہت حد تک اپنی عبارت کو آسان و سلیس بنانے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسے الفاظ و عبارت کا استعمال کرنا پڑا جو عام فہم نہیں ہے۔ اگر قارئین کرام تھوڑی توجہ فرمائیں گے تو مفہوم واضح اور بہتر طور پر سمجھ میں آجائیگا۔

چونکہ شرعی و فقہی مسائل کے بیان کی اصلاح ضروری تھی اور یہ کام علم فقہ رکھنے والی شخصیت ہی کر سکتی ہے لہٰذا ہم نے جناب قبلہ مولانا سید شبیہ الرضا صاحب دام اقبالہٗ سے درخواست کی جسے مولانا صاحب نے بہ خوشی قبول فرمایا کتاب کے اس حصہ کی اصلاح فرمائی جس میں فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ہم قبلہ مولانا صاحب مدظلہٗ عالی کے بے حد ممنون و مشکور ہیں اور قلب کی گہرائیوں سے بارگاہ رب ذوالجلال والاکرام میں دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم مولانا صاحب کو مفسدین و مخالفین کے شر سے محفوظ رکھے اور آپ کی عزت و مرتبہ میں بلندی عطا فرمائے۔ آمین

ہمارے مشفق و مہربان جناب ڈاکٹر مرزا عسکری حسین صاحب نے تاریخ بنی ہاشم کی جلد اوّل' جلد دوئم اور اب جلد سوئم کے مسودوں کو ملاحظہ فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی جس کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب کے انتہائی شکر گزار ہیں۔ انشاء اللہ تاریخ بنی ہاشم کی بقیہ دو جلدوں میں بھی ہم ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی و سرپرستی سے مستفید ہوں گے۔ گو کہ دور حاضر کی گوناگوں مصروفیات کے باعث ڈاکٹر صاحب سے اکتساب علم کا بہت کم موقعہ ملتا ہے لیکن پھر بھی مشفقانہ طرز تکلم اور تکلفات سے پاک بزرگانہ برتاؤ ڈاکٹر صاحب کے ایسے انداز ہیں جو انسان کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

آمین

ارتضیٰ بن رضا نواز پورتی

۹ مارچ ۲۰۰۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ

اے ہمارے پروردگار! مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

اور آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور ان (کے نفوس) کو پاکیزہ کرے، بیشک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے ——— (القرآن۔ ۲/۱۲۹)

باب سوئم (مسلسل)

حضرت **خاتم** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تا

حضرت **دائم** علیہ السلام

نبی آخر الزماں

دعائے خلیل: اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ہمیشہ پاک و پاکیزہ نفوس پیدا کرتا رہتا ہے جو اپنے کردار و عمل سے انسانوں کو صراط مستقیم کی راہ دکھاتے رہتے ہیں جبکہ اکثر و بیشتر لوگ ان کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' انکے پیغام حق کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں' ان کی دعوت دین پر توجہ نہیں دیتے ہیں اور ان کو مظالم کا شکار بنا کر راہ حق سے ہٹانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ان برگزیدہ ہستیوں پر صرف مخالفین ہی ظلم نہیں کرتے ہیں بلکہ انکے اپنے عقیدت مند بھی ان کی تعلیمات کو مسخ کر کے' ان کی ہدایات میں تغیر و تبدل کر کے' ان پر نازل کی ہوئی کتابوں میں تحریف کر کے اور انکی شخصیتوں میں خدائی کا رنگ بھر کر ان پر ظلم کرتے ہیں۔ مخالفین کے مظالم کا سلسلہ تو ان نفوس قدسیہ کی حیات تک ہی محدود رہتا ہے جبکہ عقیدت مندوں کے مظالم صدیوں تک جاری رہتے ہیں۔

دنیا میں جتنے بھی ہادی و رہبر مبعوث برسالت ہوئے ان میں صرف نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایسی ہے جو صدیاں گذر جانے کے بعد بھی الوہیت کی عجائب پسندی سے محفوظ و مامون رہی۔ باری تعالیٰ نے اپنے اس آخری نبی کے لئے ابتدائے بعثت ہی سے ایسا انتظام فرمایا کہ آپ کی تعلیمات و ہدایات کا سلسلہ منقطع نہ ہو سکے لہذا وصی رسول اور اہلبیت اطہار کو آنحضرت کی تعلیمات کا عملی نمونہ بنایا جنہوں نے بعد وفات پیغمبرؐ اپنی بے مثال قربانیوں کے ذریعہ دنیائے اسلام میں

تعلیمات نبوی کو اس طرح جاری و ساری رکھا کہ طاغوتی قوتیں کوشش کے باوجود اسے مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر قوم' ہر ملک اور ہر زمانہ میں ایسے پاکیزہ نفوس پیدا کئے جنہوں نے اللہ کے پیغام کو بندوں تک پہنچایا' نیکی کے فوائد سے آگاہ کیا اور ہر برائی و گمراہی کے نتائج بد سے ڈرایا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (سورہ النحل آیت :۳۶)

ترجمہ : اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا (جس کی تعلیم یہ تھی) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (یعنی سرکش قوتوں کی پیروی سے) اجتناب کرو۔

اللہ تعالیٰ نے بعثت انبیاء کے آخری مرحلہ میں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث برسالت فرمایا جو سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی ہیں اور جن کی بابت باری تعالیٰ نے متعدد جگہ ارشاد فرمایا ہے :

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ اے محمدؐ! یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔ (سورہ یٰس آیت :۳) هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۔ یہ (محمدؐ) بھی اگلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔ (سورہ النجم آیت :۵۶)۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اور محمدؐ تو صرف رسول ہیں (خدا نہیں) ان سے پہلے اور بھی بہتیرے پیغمبر گذر چکے۔ (سورہ العمران آیت :۱۴۴)

پیغمبر آخر الزماں کی دعوتِ تبلیغ کا محور بھی وہی تھا جو آپ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کا تھا آپ نے بھی اسی دین فطرت کی تلقین فرمائی جس کی تلقین ہر نبی اور ہر رسول نے کی تھی۔ ارشاد خداوندی ہے کہ

ترجمہ : (اور اے مسلمانو تم کہو) کہ ہم تو خدا پر ایمان لائے ہیں اور

اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا (قرآن) اور جو (صحیفے) ابراہیم واسحاق
ویعقوب اور اولاد یعقوب پر نازل ہوئے تھے (ان پر) اور جو (کتاب)
موسیٰ و عیسیٰ کو دی گئی (اس پر) اور جو دوسرے پیغمبروں کو ان کے
پروردگار کی طرف سے انھیں دیا گیا (اس پر) ہم تو ان میں سے کسی
ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو خدا ہی کے فرمانبردار ہیں۔

(سورۃ البقرہ آیت: ۱۳۶)

قرآن مجید کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پچھلے پیغمبروں میں سے کسی کی تکذیب یا ان کے لائے ہوئے پیغام کی تردید کرنے نہیں آئے تھے بلکہ آپؐ بھی اسی سچے دین کی تبلیغ کرنے کیلئے مبعوث کئے گئے تھے جس کی تبلیغ ابتدائے آفرینش سے ہادیان دین کرتے چلے آرہے تھے۔ البتہ بعد کے لوگوں یعنی ان ہادیوں کے پیروؤں اور عقیدت مندوں نے جو ملاوٹ کردی تھی اس کو رسالتمابؐ نے پاک کر کے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس ہادی برحق کی بابت ارشاد فرماتا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (سورہ العمران آیت: ۱۶۴)

ترجمہ: خدا نے تو ایمان لانے والوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے واسطے انھیں کی قوم کا ایک رسول بھیجا جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے اگرچہ وہ پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھی نبی آخر الزماں کے لئے دعا کی تھی کہ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔

(سورہ البقرہ آیت: ۱۲۹)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار اس امت مسلمہ میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ ان کے نفوس کو پاک وپاکیزہ کر دے۔ بے شک تو غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں چار خدمات کی سپردگی کیلئے اللہ تعالیٰ سے بعثت رسول کی التجا کی تھی جن کی بابت مولانا سید ظفر حسن صاحب نے تحریر کیا ہے کہ

۱۔ آیات الٰہیہ کو پڑھ کر سنانا۔ یہ تعلیم ہر اس شخص کیلئے تھی جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا تھا۔
۲۔ مطالب کتاب کو سمجھانا۔ یہ اوسط درجہ کے مسلمانوں کی تعلیم کا بندوبست تھا۔
۳۔ حکمت کی تعلیم دینا۔ یعنی حکمت نظری و عملی دونوں کو سمجھانا یہ تعلیم اہلبیت کیلئے مخصوص تھی۔
۴۔ نفسوں کو پاک وپاکیزہ کرنا: اس میں صاحبان زہد و تقویٰ کو شرکت حاصل تھی لیکن مکمل تزکیہ والے تو صرف وہ ہی لوگ تھے جنکی شان میں آیت تطہیر نازل ہوئی۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۲۱ ج: ۱)

نبوت ورسالت: لفظ نبی کے معنی خبر دہندہ کے ہیں۔ مادہ اس کا 'النباء' ہے جس کے معنی مفید خبر کے ہیں یعنی وہ خبر جو علم یا غلبہ ظن کا فائدہ دے۔ اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر پر اس وقت تک لفظ نباء کا استعمال نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں تین چیزیں موجود نہ ہوں۔ اولاً اس خبر کا نہایت مفید ہونا' دوئم اس سے علم یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا اور سوم

اس خبر میں کذب کا احتمال نہ ہونا۔ لہٰذا صرف وہ خبر نباء کہلائے گی جس میں یہ تینوں صورتیں پائی جاتی ہوں۔ اور اصطلاح اہل شریعت میں نبی اس شخص کو کہتے ہیں جو بلاواسطہ بشر خدا کی طرف سے خبر پانے والا ہو۔

اللہ تعالیٰ اور اسکے بندوں کے درمیان ان سے امور دنیوی واخروی میں خرابیوں کو دور کرنے کے لئے جو سفارت جاری ہوتی ہے اسے نبوت (النُّبوۃ) کہا جاتا ہے۔ اور نبی کو نبی اسلئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کی خبر دیتا ہے جن پر عقول سلیمہ مطمئن ہوتی ہیں۔ اور نبی بمعنی فاعل سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ لوگوں تک خبر پہنچانے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۱۵:۴۹) یعنی اے پیغمبر! میرے بندوں کو بتادو۔ اور یہ کہ نبی بمعنی مفعول بھی ہو سکتا ہے یعنی خبر دیا گیا۔ کیونکہ نبی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جاتی ہے۔ جیسے ارشاد ہوا: قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (۶۶: ۳) یعنی رسول نے کہا مجھے بڑے واقف کار خبردار (خدا) نے بتایا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ نبی کو نبی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے کیونکہ النبوۃ والنباوۃ کے معنی بلندی کے ہیں۔ [1] اگر کسی نبی کیساتھ شریعت بھی ہو تو وہ صاحب شریعت کہلائے گا ورنہ محض نبی ہوگا اور جب نبی مبعوث بشریعت ہو تو اتفاقی وجہ سے اس کو رسول یعنی پیغام خدا لانے والا کہتے ہیں۔ یہ لقب اس وقت ملتا ہے جب نبی صاحب کتاب آسمانی یا صاحب شریعت ہو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے جب کہ ہر نبی رسول نہیں ہو سکتا۔

اَلرَّسِلُ کے معنی آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَةٌ رِسْلَةٌ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اسی سے رسول ہے جس کے معنی

[1] المفردات ص: ۴۸۲

روانہ ہونے والا کے ہیں۔ مگر کبھی رسول کا لفظ پیغام کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے پیغام دیکر بھیجا گیا ہو۔ رسول کی جمع رسل ہے۔ قرآن میں رسول اور رسول اللہ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى یعنی جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے (۱۱-۶۹) اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا "وَمُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ یعنی اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ بس ایک رسول ہیں" الارسال (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری محبوب یا مکروہ چیزوں کیلئے بھی ہوتا ہے۔ کبھی یہ تسخیر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور کبھی کسی بااختیار وبااراده شخص کے بھیجنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

خصائص ولوازم: نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں' جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے۔ بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان افراد کی سعی ومحنت کا مرہون منت نہیں۔ اسی طرح نوع انبیاء کا نبی بن جانا ان افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں۔ ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔ مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کیلئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح قبول وحی کی استعداد اور تیاری کیلئے منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل ضروری ہیں۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت وریاضت میں زندگی بسر کی' ایک ایک مہینہ' ایک ایک جگہ اس طرح گذارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔ توریت میں حضرت موسیٰؑ کی

نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور نزول وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر ومراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا تاریخ سے ثابت ہے۔

اس عبادت وریاضت کے ساتھ نبوت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت' اعتدالِ مزاج' نشوو نما کی پاکی' حسن تربیت' طہارت نسب' کرم اخلاق' نیکئی طینت' متانت' تواضع' سنجیدگی' دوستان الٰہی کیساتھ نرم خوئی' اور دشمنان حق کے ساتھ شدتِ قوت پائی جائے' علاوہ بریں وہ راست گفتار' امانت دار' تمام برائیوں سے پاک' فضائل ومحاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہو۔ نیز ظلم کرنے والوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان' مظلوموں کی اعانت' فریاد خواہوں کی فریاد رسی اس کی طینت ہو' نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہو۔ تب تمام دنیا کی قوتیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سر نگوں ہو جائیں مزید برآں وہ مغرور' جابر' جفا پیشہ' بد خو اور درشت مزاج نہیں ہوتا' وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو۔ وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ معصوم اور اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو' اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے' اس

کو حق و باطل' خیر و شر اور نیک وبد امور کے درمیان فیصلہ اس طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ان نفوس قدسیہ کے اندر خاص قسم کا وجدان اور ذوقِ سلیم رکھ دیا ہے۔ جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو باربار کے تجربے سے اس کی صداقت وراست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے تصرفات صادر ہوتے ہیں جن سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے' تو ہر طرف سے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

انبیاء اور ان کے مشابہ اشخاص میں فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے۔(١) مبداء اور منبع کا فرق (٢) غرض وغایت کا فرق (٣) طریق دعوت کا فرق (٤) اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبداء ومنبع ماخذ اور سرچشمہ تعلیم ربانی' شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے جبکہ ایک حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیم انسانی' گذشتہ تجربہ' استقراء اور قیاس ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے۔ اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشاء اپنی شہرت طلبی' علم کا اظہار' قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ طریق دعوت کا فرق یہ ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں' مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے۔ مگر نبی اپنی دعوت کو خالق کی اطاعت' محبت اور رضاجوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم جو کہتا ہے اس کا کرنا اس کیلئے ضروری نہیں۔ لیکن نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اسکے لئے ضروری ہے وہ صرف جلوت کی میز پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت

اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط' افلاطون' ارسطو وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور محمدؐ دوسری طرف ہیں اور دونوں کی سوانح اور سیرتیں اور کارنامے ایک دوسرے سے واضح طور پر جدا نظر آتے ہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کشی کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں۔ تاکہ فتنہ وفساد رک جائے' فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتا ہے تاکہ ان کی بات تسلیم کر لی جائے۔ لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتا ہے کہ وہ ازخود بُرائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں۔ ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے احکام اور نصیحتوں کو جو پیغمبروں کے ذریعہ آتی ہیں بے چوں وچرا تسلیم کریں۔

غرض ہر شیریں نوا واعظ' ہر موثر البیان خطیب' ہر دقیقہ رس مقنن' ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم' بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شرائط ولوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اسکے ضروری اجزاء وعناصر ہیں۔

صفات وشرائط : اغراض بعثت کو پورا کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے نبی میں خصوصی صفات وشرائط کا ہونا لازم ہے ورنہ غرض بعثت ناتمام رہ جائے گی اور وہ منفعت جو اللہ اپنے بندوں کو پہنچانا چاہتا ہے وہ انہیں حاصل نہ ہو گی۔ نبی کی لازمی صفات وشرائط درج ذیل ہیں :

اول : سب سے پہلی بات یہ کہ معادی عالیہ یعنی ملکوت سے نبی کو اس درجہ اتصال وقرب روحانی ہو کہ بلاواسطہ تعلم وتعلیم دنیوی وہ امور غیبی سے مطلع ہو سکے یعنی اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہو' وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو' غیب کی

چیزیں دیکھتا ہو' غیب سے علم پاتا ہو اور عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو اگر ایسا نہیں تو علم وعمل دنیاوی ناقص ہو گا اور انسان کامل کی صفت میں داخل نہ ہونے سے نبی کا اثر دیگر نفوس پر قائم نہ ہو گا۔

دوئم : یہ کہ ہیولا خلقت عالم مختلف صورتوں کے قبول کرنے میں اس کے نفس کا تابع ہو یعنی اس کو تمام عالم میں وہ حکومت حاصل ہو جو کہ اپنے جسم میں حاصل ہے اسطرح کہ گویا تمام عالم اس کا جسم ہے۔ یعنی خداوند عالم اسکے نفس کو یہ قوت عطا کر دے کہ خلقت عالم کی تمام قوتیں اور مادے اسکے فرمان پذیر ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو شان نبوت اور علامت رسالت نہ ہونے سے دعوئے نبوت قابل قبول نہ ہو گا۔

سوئم : یہ کہ بوجہ قرب واتصال عالم وملائکہ کو دیکھ سکے اور کلام خدا بطریق وحی سماعت کر سکے ورنہ احکام ربانی کی صحت اور وثوق اس کو نہ حاصل ہو گا اور کارِ ہدایت ناتمام رہے گا۔

چہارم : یہ کہ نبی معصوم ہو یعنی خداوند تعالیٰ اس کو ایسا نفس طاہر عطا کرے کہ باوجود بشریت اور قدرت ارتکابِ معاصی بھی اس سے نہ تو قبل نبوت نہ بعد نبوت سہواً یا عمداً کوئی گناہ صغیرہ وکبیرہ سرزد نہ ہو کیونکہ اگر پیغمبر سے معصیت کا صدور ممکن ہو تو لوگ اس کی معصیت کی بھی پیروی کریں گے اور اس کی رسالت کا اعتبار پیدا نہ ہو گا۔ احکام الٰہی اور سزا وجزاء اخروی کی واقعیت کا اعتماد لوگوں کو نہ ہو گا اور غرض بعثت معطل ومجہول رہے گی۔ اس کے علاوہ حالت صدور معصیت ان کی متابعت ومخالفت ایک ہی وقت میں بندوں پر واجب ہو گی جو صراحتاً محال ہے۔ کیونکہ درجۂ نبوت پر فائز ہونے کے باعث نبی کی اطاعت لازم ہے اور معصیت صادر ہونے کے باعث ان کی مخالفت واجب ہے مزید براں اگر ان سے ارتکاب معصیت ہو تو ان کی سزا دہی واجب ہے لیکن پیغمبر کی سزا دہی وایذا رسانی حرام ہے۔ کیوں کہ جو فرستادۂ خدا اور معلم قانون

الٰہی ہو اس کی سزا دہی کا اختیار صرف خدا کو ہونا چاہئے نہ کہ عوام الناس کے حکم سے۔ پس وجوب سزا اور حرمت سزا ایک ہی وقت میں لازم آتی ہے۔ جو کہ محال ہے۔ پھر یہ کہ ان کی شہادت مقبول نہ ہو گی۔ ان کا وقار کسی دل میں پیدا نہ ہوگا۔ ان کو تحقیر و ذلت حاصل ہو گی اور ظاہر ہے کہ یہ سب امور شان نبوت کے خلاف ہیں لہٰذا عصمت انبیاء عقلاً واجب و لازم ہے۔

پانچویں: یہ کہ بہ اعتبار علم و فہم' عزت و مروت' شجاعت و عفت' امانت و دیانت وغیرہ نبی افضل اہل زمانہ ہونا چاہئے اور تمام مکارم واخلاق' محامد واوصاف اس میں جمع ہونا لازمی ہیں۔ ورنہ یہ لازم آتا ہے کہ جو شخص ان اوصاف انسانی میں پیغمبر سے افضل ہو وہ تابع اور پیغمبر جو ان اوصاف میں اوروں سے کم تر ہو وہ حکمران مقرر کیا جائے۔ یہ ترجیح خدا کی طرف سے تجویز ہو خلاف عقل اور محال ہے۔ لہٰذا درجہ نبوت کا وہی شخص سزاوار ہے جو تمام اوصاف و کمال انسانی سے آراستہ ہو اور تمام بنی نوع انسانی میں افضل ترین واکمل ترین ہو۔

چھٹے: یہ کہ عالی نسب و عالی حسب ہو یعنی اسکے سلسلہ نسب میں بدکاری و حرام خون شامل نہ ہوا ہو ورنہ لوگوں کی نگاہ میں اس کا شخصی وقار قائم نہ ہو گا۔ نیز نبی عالی حسب بھی ہو یعنی اسکے آباؤاجداد اوصاف حمیدہ میں نامور رہے ہوں اور ان میں سے کسی نے ذلیل پیشہ مثل حجامی و دھوبی وغیرہ نہ اختیار کیا ہو۔

ساتویں: یہ کہ عیوب باطنی مثل درشت خوئی' تند مزاجی' کینہ پروری' حسد' بغض' خلل وغیرہ نیز عیوب جسمانی مثل کوڑھ' جذام' برص وغیرہ سے محفوظ ہو کیوں کہ یہ عیوب لوگوں کے دلوں میں اس کی جانب سے نفرت و گریز پیدا کرتے ہیں۔

آٹھویں: یہ کہ سہو و نسیاں سے محفوظ ہو ورنہ تبلیغ احکام الٰہی اور اخبار غیبی کے لفظ بالفظ بیان کرنے میں دشواری ہو گی اور خدمات پیغمبر کے ادا کرنے میں حرج و نقص واقع ہو گا۔

وحی: وحی کے معنی القا یعنی دل میں ڈال دینے کے ہیں اور کبھی لفظ روح سے مراد وحی لیتے ہیں اسی مناسبت سے جبرئیل کو روح الامین کہتے ہیں کیونکہ ان کے سوا کوئی دوسرا فرشتہ پیغمبروں پر وحی نہیں لایا۔ اور الہام کے معنی تلقین یعنی تعلیم کے ہیں جو کہ خدا کی طرف سے بلاواسطہ جبرائیل پیغمبر کے دل میں پیدا ہو پس وحی اور الہام میں فرق یہ ہے کہ وحی بواسطہ فرشتہ ہوتی ہے اور الہام بلاواسطہ۔ وحی کی چند اقسام یہ ہیں۔

اول: خوابہائے صحیح' دوسرے: جبرئیل کا قلوب انبیاء میں القاء کرنا بغیر اسکے کہ انبیاء جبرئیل کو دیکھیں۔ تیسرے: جبرئیل بصورت انسان آکر وحی القاء کریں۔ چوتھے: غیب سے آواز سنائی دے اور کہنے والا دکھائی نہ دے۔ پانچویں: جبرئیل اپنی اصل صورت میں آکر کلام کریں۔ چھٹے: بغیر کسی وساطت کے خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر سے کلام کرے۔ ساتویں: بغیر کسی حجاب کے کلام خدا سنائی دے۔ یہ جملہ اقسام وحی ان صورتوں کے موافق قرار دیئے گئے ہیں جو انبیاء کو پیش آئیں اور جن کی صحت کا اعتبار ہم کو بذریعہ دلیل تواتر حاصل ہوا۔

علامات نبوت: چونکہ نبی فرستادہ خدا ہوتا ہے یعنی عالم روحانی سے احکام حاصل کر کے عالم جسمانی کی اصلاح و تکمیل بندگان کے واسطے مقرر ہوتا ہے لہٰذا خدا پر واجب ہے کہ اغراض بعثت کو پورا کرنے کیلئے کچھ خاص نشانات مقرر کرے تاکہ نبی اپنے تقرر اور غایت تقرر سے عام عقلوں پر قبولیت کا درجہ پیدا کر سکے۔ اور یہ علامات اس نوعیت کی ہونا چاہئیں جو اس بادشاہ علی الاطلاق کے قائم مقام کے واسطے زیبا ہوں جن کی تصریح حسب ذیل ہے۔

اول یہ کہ نبی مدعی نبوت ہو اور صاف طور پر اپنے کو فرستادۂ خدا بیان کرے۔ یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے والا لوگوں کو اعلانیہ بتائے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی ہے۔

دوسرے یہ کہ نبی اپنے ساتھ احکام ربانی یا کتاب آسمانی لائے۔ خواہ وہ کتاب محض ہدایات پر مشتمل ہو یا سیاست و تنسیخ احکام سابق پر۔

تیسرے یہ کہ نبی اپنی تصدیق رسالت اور عظمت خداوندی ثابت کرنے کیلئے کوئی معجزہ خدا کی طرف سے پیش کرے۔ پس اگر یہ سب علامات ظاہر ہو جائیں تو پھر اسکی نبوت سے انکار کرنا یقیناً خدا کی سرتابی و نافرمانی ہے۔

معجزہ: واضح رہے کہ معجزہ سے مراد وہ خرق (خلاف) عادت (یعنی امر عجیب) ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان بااقتضاء بشریت عاجز ہو۔ معجزہ کی چند شرائط ہیں اول یہ کہ دعویٰ کرنے کے ساتھ ظاہر کیا جائے اور مطابق دعویٰ کے وقت معین اور حد معین پر دکھایا جائے۔ دوئم یہ کہ اس کا معارضہ نہ ہو سکے یعنی اور لوگ مثل اس کے نہ دکھا سکیں۔ سوئم یہ کہ بلا اسباب و ذرائع خفی و جلی معجزہ دکھایا جائے ورنہ معجزہ نہ سمجھا جائیگا کیوں کہ لوگ حیرت انگیز امور بذریعہ اسباب و سامان مخصوصہ ظاہر کرتے ہیں جس کا نام سحر ہے یا بعض لوگ روحانیات کی قوت سے عجیب امور دکھاتے ہیں ان کا نام عزائم ہے۔ یا کوئی بقوت اجرام فلکی عجائبات دکھائیں تو ان کو دعوت کواکب کہتے ہیں۔ یا اگر بشرکت قوائے سماوی و ارضی کے کوئی عجوبہ دکھایا جائے اس کو نیر نجات کہتے ہیں یا اگر علوم ریاضی کے ذریعہ سے کوئی عجوبہ ہو تو اس کو حیل کہتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی امر معجزہ نہیں کہلائے گا۔ پس یہ خرق عادات یعنی امر عجیب جو منجانب اللہ عطا ہوتا ہے اور جسے سوائے انبیاء و اوصیاء کے کوئی دوسرا شخص نہیں دکھا سکتا۔ اگر یہ خرق عادات انبیاء و اوصیاء سے صادر ہو تو معجزہ ہے لیکن اگر اولیا سے صادر ہو تو اس کو کرامات کہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ معجزہ سے مراد خلاف عادات کسی امر کا اجراء منجانب اللہ دکھایا جانا ہے۔ جیسے حسب عادت مردہ زندہ نہیں ہو سکتا مگر اعجازی قوت سے روح دوبارہ جسم میں داخل ہو جائے۔ یا بیماری بغیر علاج کے بقوت اعجاز دفع کر دی جائے وغیرہ۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکار ہو جاتی ہے۔ خصوصاً قرآن پاک جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورہ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے انکے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں۔ انہی آیات میں ارشاد باری ہے کہ

قُل لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ٥

(سورہ انعام آیت: ۹۰)

"ترجمہ: اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا' یہ تو اہل دنیا کیلئے نصیحت اور یاد دلاتا ہے"۔

اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ نبی کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمع نظر نہیں ہوتا۔

تقرر انبیاء: انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ یکایک کسی راہ چلتے کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کیلئے مامور کر دیتا ہو یا کسی شخص کو اس طور پر اپنی پیغام بری کیلئے مقرر کرتا ہو کہ وہ منجملہ اپنے دوسرے کاروبار کے ایک پیغمبری کا کام بھی انجام دے دیا کرے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجنا چاہا تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی کام کیلئے پیدا کیا۔ اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی و روحانی قوتیں ودیعت کیں جو اہم ترین منصب کو سنبھالنے کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔ ایسے حالات میں اس کی پرورش کی جن میں اس کی استعداد نبوت ترقی کر کے فعلیت کی طرف بڑھتی ہے۔ اور جب وہ اپنے کمال کو پہنچ

گیا تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوت فیصلہ اور نورِ ہدایت عطا کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے۔

غرض نبوت کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک انسان جو تمام حیثیتوں سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکایک خدا کی طرف سے نزولِ وحی کیلئے چُن لیا جائے۔ اور بجز اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی رائے اس کے خیالات' اسکے اعمال' اس کے احکام اور اس کے فیصلے وغیرہ دیگر انسانوں سے ممتاز نہ ہوں۔ یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کیساتھ ساتھ اس کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی بتادی گئی ہوں۔ اور بقیہ وہ عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہو نیز نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذات بشریہ پر نبوت عارض ہوتی ہے اور ہم اس کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے صرف اس شعبہ کو اطاعت و اتباع کیلئے منتخب کرلیں جو نبوت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تینوں باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گذرنے کے بعد نبوت کے لئے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کار نبوت ہی کیلئے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ بشر ہی ہوتا ہے اور ان تمام حدود سے محدود ہوا کرتا ہے جو حق تعالیٰ نے فطرت بشریہ کیلئے مقرر فرمائی ہیں لیکن ان حدود کے اندر اس کی بشریت آخری اور انتہا درجہ کی کامل و اکمل بشریت ہوتی ہے۔ اسی کیساتھ ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اور یہی چیز ہے جو اپنی پختگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایت عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے علم کی مزید روشنی پاکر سراج منیر بنتی ہے۔ مصالح عامۂ بشریہ کیلئے تعلیمات اور احکام کا مہبط قرار پاتی ہے اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی

ہے۔ یہ نبوت دراصل ایک پیدائشی چیز ہے۔ اور نبی کی حیثیت ذاتی ہی اس کی حیثیت نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اس کی حیثیت نبوت بالقوہ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پھل' کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی پیدا ہوا ہے' لیکن پختگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی اس کی مٹھاس ظاہر ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے۔ اور یہ شانِ رسالت ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے۔ جس کے لئے آپ کو بھیجا گیا تھا۔

جناب ختمی مرتبتؐ کے تفویض رسالت اور تعین نبوت کے وقت تمام معاشی و معاشرتی تعلقات آپؐ کے گرد و پیش تھے۔ جو خدا کی طرف سے اسوۂ حسنہ بنا کر دنیا اور اہل دنیا کی تربیت و ہدایت کی غرض سے دکھلائے جانے والے تھے۔ اور رُہبانیت کے خلاف دنیا والوں کو یہ تعلیم دینی مقصود الٰہی تھی کہ دنیا کے تمام جائز اور مستحسن تعلقات سے وابستہ رہ کر بھی الٰہیات و دینیات کا مبلغ اور اخلاقیات و سیاسات کا معلم معرفت الٰہی کی کافی و شافی تعلیم دے سکتا ہے۔ اسی تعلیم کامل نے تمام بنی نوع انسان کے قلوب پر یہ زریں اصول نقش کر دیا کہ دنیا اگر اصول دین اور حدود شریعت کے اندر ہے تو عین دین ہے۔

معرفت الٰہی : نبی کی عصمت ذاتی جیسی قدیم سے ہے ویسی ہی اس کی معرفت الٰہی بھی قدیم ہے۔ اس کی فطرت نبویہ ابتداء ہی سے علم لدنیہ کے فیوض و مآثر پر فائز ہے۔ وہ ہدایت و ارشاد کیلئے ایک خاص مدت تک' جس کی مدت و مصلحت کا علم صرف ذاتِ باری تعالیٰ کو ہوتا ہے' ماذون و مامور نہیں کیا جاتا۔ ورنہ تفویض رسالت کے قبل ہی سے اس میں تمام اوصاف و علامات نبوت پائے جاتے ہیں۔ ہمارے رسول برحق نبی آخر الزماں کے

متعلق کتب سیرۃ و تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات مرقوم ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اکابر و عمائدِ عرب نے آپ کو دیکھ کر انہی محاسن اوصاف اور مکارم اخلاق و اطوار کے اعتبار سے آپ کے نبی اللہ ہونے کی صحیح بشارتیں دیں تھیں۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں ایسی خبروں اور واقعات کیلئے ایک علیحدہ باب قائم کیا ہے۔

آپکے چالیس برس کی عمر میں مبعوث برسالت ہونے کی بنا پر یہ لکھ دینا کہ جناب رسالتمآب کو چالیس سال تک خدا کا پتہ نہ تھا آپ چالیس سال بعد خدا سے آشنا ہوئے اسلام کے عقائد مسلمہ کے قطعی خلاف ہے۔ نعوذ باللہ اگر بفرض محال ایسا ہی ہے تو پھر چالیس سال تک آپ کس وجود کے قائل اور کس مسلک کے سالک تھے؟ مزید یہ کہ آپ میں اور ورقہ بن نوفل' عثمان بن جویرث وغیرہ کی ذات و صفات میں امتیازی فرق کیا باقی رہتا ہے؟

قبل از بعثت انبیاء و مرسلین کے قلوب نورانی پر احوال مخصوصہ مستولی ہوتے ہیں وہ ابتدا ہی سے خدا کے وجود کو یکتا اور اس کے ازلی و ابدی ہونے کا یقین کامل رکھتے ہیں اسی طرح ان کو خدا کی تمام ذات و صفات کا علم راسخ اور یقین راسخ ہوتا ہے۔ وہ رسالت و نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے عالم کائنات کی تمام اشیاء اور ان کے تمام افراد و اجزا سے اس صانع برحق اور قادر مطلق کی قدرت کا مشاہدہ اور ثبوت قائم کیا کرتے ہیں اور حقیقتاً اس عالم اور زمانہ میں وہ اپنی واقفیت علم کو یقین اور پھر یقین کو سکینۂ الٰہی کے انتہائی حدود تک پہنچاتے ہیں اور یہیں سے حدود انسانی کی انتہا اور فضائے ملکوتی کی ابتدا ہوتی ہے جس کا پہلا زینہ رسالت ہے۔

غرض بعثت : خداوند تعالیٰ عادل ہے لہٰذا اس سے نہ تو فعل قبیح سرزد ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ واجب کو ترک کرتا ہے۔ مخلوقات کو پیدا کرنے سے منشائے معبود انھیں نفع پہنچانا ہے اور جو امر ہر طرح موجب اصلاح و نفع

بندگان اور داخل لطف ہو اس کو عمل میں لانا خدا پر لازم ہے۔ پس کوئی نفع اس سے زیادہ نہیں کہ بندوں کو تعلیم دی جائے اور خدا کی طرف سے کوئی شخص ان کی ہدایت اور انتظام حال و اصلاح امور کیلئے مقرر کیا جائے تاکہ وہ بندگان خدا کو بہ استعداد و فہم و قوت عقل و ادراک اس درجہ کمال کی جانب لائے جو دنیا و آخرت میں نوع انسان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عالم کو بغیر تقرر انبیاء کے چارہ نہیں کیونکہ فہم انسانی میں اتنی لیاقت و قابلیت نہیں کہ وہ انبیاء کی مدد و ہدایت کے بغیر راہ راست حاصل کر سکے۔ ان انبیاء کو صاحب ناموس کہتے ہیں چونکہ ناموس کے معنی تدبیر سیاست کے ہیں لہٰذا شریعت 'ناموس اکبر ہے اس کے موافق انبیاء کا یہ کام ہے کہ بندوں کو علم و عمل پر آمادہ کریں اور قانون الٰہی کے امر و نواہی سے ان کو آگاہ کریں تاکہ ہر کام عدل کے موافق انجام پائے اور ہر امر میں راہ راست پر عمل کیا جائے۔ کیوں کہ عدل وہ صفت ہے جس میں تمام نیکیاں داخل ہیں۔ پس انبیاء جو کہ ایک جانب سے مبادی عالیہ یعنی عالم ملکوت سے اتصال رکھتے ہیں اور حقیقت اشیاء اور غیبی امور سے مطلع ہوتے ہیں اور دوسری جانب بوجہ ربط مادہ و صورت اپنے ہم جنسوں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا طریقہ فرمانبرداری احکام الٰہی جو کہ اصل غرض آفرینش بنی آدم ہے اسے انبیاء ہی خوب بتا سکتے ہیں اور انھیں کا قول و فعل معتبر و قابل سند ہو سکتا ہے۔ لہٰذا غرض بعثت انبیاء سے نفع بندگان ہے اور یہ نفع بغیر بعثت انبیاء حاصل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام دنیا کے انسانوں کی بہتری و منفعت کے لئے مبعوث فرمایا آپ کی بعثت نہ تو کسی ایک قوم کے لئے اور نہ ہی کسی ایک زمانہ کے لئے ہے۔ آپ تمام بنی نوع انسان کے لئے اور تمام زمانوں کے واسطے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ آپ کی بابت اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہ ارشاد فرمایا ہے مثلاً۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ۝ (سورہ الفتح آیت: ۲۸)

ترجمہ: وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب رکھے اور گواہی کیلئے تو بس خدا کافی ہے۔

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۝ (سورہ توبہ آیت: ۳۳)

ترجمہ: وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اسکو تمام دینوں پر غالب رکھے اگرچہ مشرکین برا مانا کریں۔

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ۨ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ۝ (سورہ اعراف آیت: ۱۵۸)

ترجمہ: اے محمد کہو' اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں' اس خدا کا جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جسکے سوا کوئی خدا نہیں جو مارنے اور جلانے والا ہے پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خدا اور اسکے فرامین پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو امید ہے کہ تم راہ راست پالو گے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (سورہ السبا آیت: ۲۸)

ترجمہ: (اے رسول) ہم نے تم کو تمام دنیا کے لوگوں کیلئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا ۝ (سورہ الاحزاب آیت: ۴۵'۴۶)

ترجمہ: اے نبی ہم نے تم کو (لوگوں کا) گواہ اور خوشخبری دینے والا اور (عذاب) سے ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے خدا کی طرف بلانے والا اور (ایمان و ہدایت کا) روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

توریت کا بیان: جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کے بارے توریت میں بیان کردہ تعریف کو متعدد راویوں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے جن کا مفہوم تقریباً یکساں ہے ہم یہاں زید بن اسلم سے مروی ایک روایت نقل کرتے ہیں جس کی بابت ان کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن سلام کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کی صفات توریت میں یہ ہے کہ:

"اے نبی ہم نے آپ کو شاہد (یعنی آپ کی شریعت کو موجود رہنے والا) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور امین کا محافظ بنا کر بھیجا ہے' آپ میرے بندے اور رسول ہیں' میں نے آپ کا نام متوکل (خدا پر بھروسہ کرنے والا) رکھا ہے' نہ تو وہ بد خلق ہوں گے نہ سخت کلام نہ رستوں میں شور و غل کرنے والے اور نہ برائی کے بدلے برائی کریں گے' لیکن معاف کردیں گے اور درگذر کریں گے' میں انھیں اس وقت تک نہ اٹھاؤں گا تاوقتیکہ انکے ذریعہ سے ٹیڑھے ہو جانے والے مذہب کو سیدھا نہ کردوں اس طرح سے کہ لوگ "لاالٰہ الااللہ" کہنے لگیں' انکے ذریعہ سے نابینا آنکھوں کو اور بہرے کانوں کو اور غلاف چڑھے ہوئے دلوں کو کھول دے گا"۔ (طبقات ابن سعد ص: ۱۹۴ ج: ۲)

الغرض اللہ کے رسول نے احکامات الٰہی کو اس بہترین انداز میں پیش کیا کہ بندگان خدا رہتی دنیا تک ان سے ہدایت حاصل کرتے رہیں گے اور یہی غرض بعثت ہے۔

اطاعتِ رسول: رسول اللہ کی اطاعت کی بابت مسلمانوں کے مختلف نظریات ہیں ایک گروہ کا خیال ہے کہ اطاعت و پیروی صرف اس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے رسول لے کر آتا ہے۔ تبلیغ کتاب کے بعد رسول کی

حیثیتِ رسالت ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخصی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص رسول کی ذاتی صفات کی بناء پر اسکی اطاعت کرتا ہے تو وہ اطاعت اختیاری ہوگی واجب نہیں۔ کتاب کے علاوہ اس کا کوئی عمل اور قول ہمارے اخلاق' معاشرت' معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جسکی پیروی ہم پر واجب اور مذہبی فریضہ ہو۔

دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ رسول کے ذمہ صرف کتاب پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کرکے بھی دکھانا تھا تاکہ امت اس نمونہ پر عمل کرے۔ لہٰذا عبادات و بندگی وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کے علاوہ رسول اپنی شخصی حیثیت میں ایک امیر' ایک مصلح اور ایک حاکم کی حیثیت سے انجام دے تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو دائمی اور عالمگیر ضابطہ و قانون بنانے والی ہو اور جس کی پیروی ہمیشہ کیلئے ایک دینی فریضہ ہو۔

تیسرے گروہ کا نظریہ ہے کہ رسول کی حیثیتِ رسالت اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی ہے۔ یہ گروہ اخلاق' معاشرت' معاملات احکام قضایا اور بہت سے دیگر معاملات میں رسول کے قول و فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کیلئے اسوۂ حسنہ ہیں مگر وہ حیثیت رسول اور حیثیت شخصی میں فرق کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے کچھ معاملات ایسے ضرور ہیں جو حیثیت رسول سے خارج ہیں اور قابل تقلید نمونہ نہیں اگرچہ یہ گروہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی کے امتیاز کی واضح نشاندہی کرنے سے قاصر ہے۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول جس وقت منصب رسالت پر سرفراز ہوتا ہے اس وقت سے مرتے دم تک ہر وقت اور ہر آن فرائض رسالت پر مامور ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے تمام معاملات خواہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی' قاضی کی حیثیت سے ہوں یا معلم کی' ایک شوہر کی حیثیت

سے ہوں یا باپ کی' ایک رشتہ دار کی حیثیت سے ہوں یا دوست کی' الغرض رسالت اس طرح جاری ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کیلئے بھی اس سے جدا نہیں ہوتیں حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے اس وقت بھی وہ اسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جسطرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ ان نظریات کے باوجود اس گروہ کا خیال ہے کہ نبی کے اقوال و افعال میں فرق مراتب ضرور ہے۔[1]

مذہب شیعہ کا عقیدہ ہے کہ اطاعت رسول ہر لمحہ اور ہر حال میں لازم ہے کیونکہ رسول ہر وقت رسول ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل احکام خداوندی کے تابع ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے نفس کے مطابق جس قول یا فعل کی پیروی چاہے کرے اور جس کی چاہے نہ کرے۔ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَمَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۝ (سورہ النساء آیت: ۸۰)

ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو کچھ خیال نہ کرو (کیونکہ) ہم نے تم کو کچھ پاسبان (مقرر) کرکے تو بھیجا نہیں۔

خداوند تعالیٰ نے رسول کی اطاعت کو اپنی محبت کی کسوٹی اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ۚ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ (سورہ آل عمران آیت: ۳۱)

ترجمہ: (اے رسول) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو کہ خدا (بھی) تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دیگا اور خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

[1] مزید تفصیل کیلئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "تفہیمات" ص: ۲۳۹ تا ۲۹۶ ملاحظہ ہو

تجربات شاہد ہیں کہ تکمیل ہدایت اور حصول علم کیلئے معلم و صالح کی اطاعت غیر مشروط لازمی ہے۔ اسی لئے رب العالمین نے بنی نوع انسان کیلئے لازمی قرار دیا کہ وہ اسکے بھیجے ہوئے پیغمبروں' رسولوں اور ہادیوں کی اطاعت غیر مشروط کریں تاکہ تکمیل ہدایت اور تعلیم دین اسلام کماحقہ' ہو سکے۔ اور ایمان والوں کے اعمال ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَطِیْعُوْا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْآ اَعْمَالَکُمْ ۝ (سورہ محمد آیت : ۳۳)

ترجمہ : اے ایمان والوں خدا کا حکم مانو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع مت کرو۔

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً مُّبِیْنًا ۝ (سورہ احزاب آیت : ۳۶)

ترجمہ : جس شخص نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ یقیناً کھلم کھلا گمراہی میں مبتلا ہو چکا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ رسولؐ کی اطاعت ہر وقت' ہر لمحہ اور ہر حال میں واجب و لازم۔ اللہ کے نزدیک رسولؐ کی اطاعت نہ کرنے والوں کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور کھلی گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ختم نبوت : عربی لغت اور محاورے کی رو سے "ختم" کے معنی مہر لگانے' بند کرنے' آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ خاتم کے معنی ڈاکخانے کی اس مہر کے نہیں ہیں جسے لگا کر خطوط جاری کئے جاتے ہیں بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو لفافے پر اسلئے لگائی جاتی ہے کہ نہ اسکے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے اور نہ باہر کی کوئی چیز اندر داخل ہوئے۔[1]

رسالتمآبؐ نے اپنے آخری نبی ہونے کی بات مختلف موقعوں پر' مختلف طریقوں سے اور مختلف الفاظ میں خود ارشاد فرمایا ہے۔ آپ کی ان

---

[1] لسان العرب' قاموس اور دیگر جملہ معتبر عربی زبان کی لغات میں لفظ خاتم کی یہی تشریح کی گئی ہے

احادیث کو بکثرت صحابہ نے روایت کیا اور جملہ محدثین نے قوی اسناد سے ان احادیث کو نقل کیا ہے۔ ان میں چند درج ذیل ہیں :

(۱) "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! نبی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے جب کوئی نبی مر جاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔ بلکہ خلفاء ہوں گے"۔ (بخاری "کتاب المناقب)

(۲) "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے۔ مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی تو وہ اینٹ میں ہوں"۔ (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پر کرنے کیلئے کوئی آئے)(بخاری۔ کتاب المناقب)

(۳) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی"۔

(ترمذی "کتاب الرویا۔ باب ذہاب النبوۃ" مسند احمد "مرویات انس بن مالک)

(۴) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ آیا) اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمھارے ہی اندر نکلنا ہے"۔ (ابن ماجہ "کتاب الفتن)

آنحضرتؐ نے خود خاتم الانبیاء ہونے کا جو دعویٰ کیا اس کی تائید میں قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ :

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا

"ترجمہ : بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کی مہر (یعنی ختم کرنیوالے) ہیں اور خدا تو ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (سورہ احزاب آیت : ۴۰)

جناب ختمی مرتبت کا یہ دعویٰ فی نفسہ ایک معجزہ ہے۔ کہ آئندہ روز قیامت تک کے لئے اس امر کی پیشن گوئی فرمائی کہ اب نہ تو کوئی پیغمبر مبعوث ہو گا اور نہ کوئی اور آسمانی کتاب نازل ہو گی بلکہ یہی آخری قوانین الٰہی نافذ رہیں گے۔ اور تمام اغراض بعثت پورا کرنے کے لئے یہی شریعت کافی ہے۔ پس بغیر علم غیب کے ایسی پیشن گوئی کرنا ممکن نہیں۔ اب اگر آپ کے بعد جو شخص بھی دعویٰ نبوت کرے وہ دجال و کاذب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور سلسلہ نبوت آپ پر ختم ہو چکا۔[2]

مستشرقین اور اسلام : مستشرق (Orientalist) لفظ اور نیٹ سے مشتق ہے جسکے معنی مشرق کے ہیں۔ عربی میں استشراق کے معنی بہ تکلف مشرقی بننے کے ہیں۔ اور مستشرق سے مراد "وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی ہو" اور لغت میں مستشرق کا مطلب "وہ فرنگی یا امریکانی ہے جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو" بیان کیا گیا ہے۔ لیکن عام اصطلاح میں مستشرقین سے مراد یورپی ممالک کے وہ غیر مسلم مصنفین ہیں جنہوں نے اسلام کے بارے میں کچھ لکھا ہو۔ جبکہ خصوصی طور پر اس سے مراد ان تمام غیر مسلم مصنفین کو لیا جاتا ہے جنہوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا ہے۔

اسلام کے قیام اور اسلامی ریاست کی تشکیل کے بعد ہی سے مشرکین کے مظالم' مسیحیت کی کشمکش اور یہودیت کے تصادم کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے اس جذبہ بغض و عناد میں شدت پیدا ہوتی گئی۔

---

[2] نوٹ : اس مضمون کی تیاری میں جن کتب سے ہم نے خصوصی استفادہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔ احسن العقائد مولفہ علامہ حلی علیہ رحمۃ' فلسفہ اسلام مولفہ محمد امام علی خان صاحب رئیس بھموا منو ضلع بارہ بنکی' فلسفہ شریعت اسلام مولفہ ڈاکٹر صبحی محمصانی اور نقش سیرت مولفہ پروفیسر نثار احمد صاحب۔

چونکہ دین اسلام کا نظریہ حیات اور نظام فکر و عمل دیگر ادیان و مذاہب سے بالکل مختلف ہے۔ نیز جناب رسالتمآبؐ نے دین حق کی جو دعوت پیش کی اس میں روز اول ہی سے ادیان باطلہ کی نفی کر دی تھی لہٰذا یہ امر قابل تعجب نہیں کہ مسیحیت' یہودیت اور مشرکین کے علمبردار اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں سخت متعصبانہ جذبات رکھتے ہیں اور اپنے بغض و عناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں۔ درحقیقت ان کا یہ رویہ نظریاتی اور فکری بنیادوں پر قائم ہے۔ البتہ یہودیوں اور مشرکین کی نسبت عیسائیوں میں جذبہ بغض و عناد کچھ کم ہے اور ایک حد تک وہ پیغمبر اسلام کی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

"لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَہُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَھُمْ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْآ اِنَّا نَصٰرٰی ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنْھُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُھْبَانًا وَّ اَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ" ۝ (سورہ المائدہ آیت : ۸۲)

"ترجمہ : (اے رسول) تم ایمان لانے والوں کا دشمن سب سے بڑھ کے یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے اور ایمانداروں کا دوستی میں سب سے بڑھ کے قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں' کیوں کہ ان (نصاریٰ) میں سے یقینی بہت سے عالم اور عابد ہیں اور اس سبب سے (بھی) کہ یہ لوگ ہرگز شیخی نہیں کرتے"۔

قرآن کریم کا یہ بیان تاریخی حقائق کے عین مطابق ہے۔ یہودی اور مشرکین تو روز اول ہی سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی دشمنی میں انتہائی متعصب و متشدد رہے ہیں اور آج بھی بدترین دشمن ہیں جبکہ نصرانی مخالفین میں یہ شدت نسبتاً کم ہے۔ چنانچہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ نجاشی بادشاہ حبشہ نے حضرت جعفر طیار سے قرآن سنا معجزات کو سماعت کیا اور ایمان لے آئے۔ نیز جب حضرت جعفر طیار حبشہ سے واپس ہوئے تو نجاشی نے ستر علماء اکے ہمراہ

کئے۔ جب وہ رسول اللہ صلعم کے پاس پہنچے توآپؐ نے انکے سامنے سورہ یٰسین کی تلاوت فرمائی وہ علماء سن کر بہت روئے اور ایمان لائے۔ اسی طرح قیصر روم نے آنحضرتؐ کی دعوت دین پر توجہ دی اور رسالتمآبؐ کی بابت استفسار کیا۔ نیز واقعہ مباہلہ کے موقع پر بنی نجران نے رسول خداؐ اور آپ کیساتھ آنے والوں کو دیکھ کر مباہلہ کرنے سے احتراز کیا۔ اور اسی طرح کثرت سے عیسائیوں کا مشرف بہ اسلام ہونا۔ تاریخ سے ثابت ہے۔

الغرض ان اسلام دشمنوں نے اپنے جذبہ انتقام کے اظہار میں ایسے بے سروپا قصے اور کہانیاں گھڑیں جنکے ذریعہ اسلام کو بدنام کرنا اور پیغمبر اسلام کی تحقیر و تذلیل کرنا مقصود تھا۔ ابتدائی دور میں گھڑی جانے والی ان دیومالائی کہانیوں نے یہودی' نصرانی اور مشرکین کی راویتوں کی حیثیت اختیار کرلی اور یہ روایتیں صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں پھر آہستہ آہستہ ضبط تحریر میں آنے لگیں۔ جب مستشرقین نے اسلام کی بابت لکھنے کا آغاز کیا تو انہوں نے یہود و نصاریٰ کی بیان کردہ انہی دیومالائی کہانیوں کو بنیاد بنایا کیونکہ ان مستشرقین کے گروہ میں نمایاں ترین عناصر یہود' نصاریٰ اور مشرکین ہی تھے اور ہیں انہوں نے اسلام و پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایسی نفرت انگیز' کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جو اہل مغرب کی ذہنی ایجاد و اختراع اور کذب وافترا سے عبارت ہے۔ حضرت ختمی مرتبت کی شان میں حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے طرح طرح کی الزام تراشیاں کی گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام اور پیغمبر اسلام کیلئے مستشرقین کا تعصب اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور انکی تحریروں میں بے باکی و گستاخی' فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی۔

مغرب نے اب تک دوبار اسلام سے براہ راست رابطہ کیا ہے ایک بار اندلس اور صقلیہ (سسلی) میں عربوں کے ساتھ اور دوسری بار مشرقی یورپ میں ترکوں کے ساتھ۔ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ دونوں بار

رابطہ اہلسنت کے طریقے پر ہوا تھا شیعہ مذہب کے ساتھ کوئی محدود رابطہ اگر ہوا بھی تو وہ بعض اسمٰعیلیہ مکاتب کے ساتھ یعنی صلیبی جنگوں کے دوران فلسطین میں اور شاید بعض دوسرے مکاتب کے ساتھ اندلس میں۔ ایسی صورت میں مستشرقین کے ماخذ کلی طور پر مذہب اہلسنت والجماعت سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں بنی ہاشم کی تحقیر و تذلیل میں کثیر مواد پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان مستشرقین کا بنیادی مقصد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو نشانہ تنقید بنانا تھا اور چونکہ جناب رسالتمآب کا تعلق خاندان بنی ہاشم سے ہے لہٰذا انہوں نے آپؐ کے قریب ترین عزیزوں کو جو آپؐ کے معاون و مددگار تھے ان کو بھی نشانہ ہدف بنایا۔ اور ان مستشرقین نے اپنے متعین مقصد یعنی مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنا' اسلام کو نیچا دکھانے کیلئے مناسب دلائل فراہم کرنا' اپنے مذہبی تقدس کے نقوش عالم اسلام پر قائم کرنا وغیرہ کے حصول کی خاطر خاندان رسول کے کردار اور رسول مقبولؐ کی سیرت پاک پر کذب وافتراء کی بھر مار کردی۔ مثلاً نشہ کی حالت میں حضرت حمزہ کا محمد صلعم کو اپنے باپ کا غلام کہنا۔[1] وغیرہ۔

مارگولیوس نے حضرت حمزہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے اسکے ماخذ تفصیل ہے جو صحیح بخاری وغیرہ میں درج ہے اور اسے شبلی نعمانی صاحب نے بھی سیرۃ النبی جلد اول میں نقل کیا ہے۔ جس پر فوق بلگرامی نے تفصیلی بحث کے ذریعہ صحیح صورتحال بیان کی ہے۔[2] اور اس بہتان عظیم پر انتہائی حیرت و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بحث کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ :

" یہ اسی اصول مبہم کا نتیجہ ہے جس کو خواہ مخواہ محض اغیار کی تائید کی غرض سے مذہبی عقائد میں داخل کر کے شان رسالت اور خاندان رسالت کی صاف صاف تنقیص و توہین کی جاتی ہے۔ حضرت حمزہ

[1] لائف آف محمد ص: ۴۵-۴۹ [2] اسوۃالرسول ص: ۱۸۹-۱۹۲ ج: ۱

کی شراب خواری کا واقعہ حضرت علی مرتضیٰ کی میخواری کا سنگ بنیاد ہے جس کو بخاری نے لکھا اور ابو داؤد نے جھوٹ کا پل باندھا۔

یہ وہی شرمناک لغویات ہیں جن کو یوروپین مصنفین کتب صحاح سے نقل کر کے اسلام کی معاشرت اور عادات و اخلاق پر اعتراض کا پورا موقع پاتے ہیں۔ اور انبیائے سابقین کے حواری' اصحاب اور اعزہ و اقارب میں اس ناہنجار عادات و اطوار اور جواز کی مثال انھیں اخبار و آثار اسلامی سے دکھلاتے ہیں جو حقیقتاً عقل و نقل دونوں ذریعوں سے سراپا لغو اور تمام و کمال افتراء ہے"۔ (اسوۃالرسول ص: ۱۹۳ ج: ۱)

مارگولیوس کی بابت مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ :

" مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ۶ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حروف پڑھا ہے اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا' لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سوانحعمری پر جو کتاب لکھی ہے' دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کذب وافتراء اور تاویل و تعصب کی مثال کیلئے پیش نہیں کر سکتی' اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا' صرف اپنی طباعی کے زور سے بد منظر بنا دیتا ہے"۔ (سیرۃالنبیؐ ص: ۹۶ ج: ۱)

ان تمام لغویات میں سب سے زیادہ شرمناک وہ واقعات ہیں جو ازواج مطہرات خصوصاً ام المومنین حضرت عائشہ سے منسوب کئے گئے ہیں۔ ہماری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ انکو نقل بھی کیا جائے۔ جناب فوق بلگرامی نے ان شرمناک واقعات میں سے چند کے نمونے دکھائے ہیں۔[1]

[1] اسوۃالرسول ص: ۱۹۲-۲۲۹ ج: ۱

جو اپنی عملی صورتوں میں لفظاً و حرفاً منافی شان رسالت اور مناقص عادات ازواج مطہرات ثابت ہوتے ہیں۔ اور ایسے خفیف و رکیک اور باعث تضحیک ہیں کہ نعوذباللہ ازواج مطہرات تو درکنار عام پاک دامن بیبیوں اور شریف گھرانے والیوں کی نسبت بھی ایسی خلاف فطرت نسوانی اور تہذیب انسانی کا ذکر کرنا کوئی بھلا آدمی گوارہ نہیں کر سکتا۔ یہ سب واقعات بے سروپا اور محض کذب وافتراء ہے۔

بعض مستشرقین خصوصاً یورپی دانشوروں نے گذشتہ چند صدیوں کے دوران اسلام کے مختلف پہلوؤں اور اسلامی تمدن کے بارے میں تحقیقات کی ہیں لیکن یہ تحقیقات بھی تعصب اور خود غرضی سے خالی نہیں کیونکہ ان میں اسلام کو منحرف کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان یورپی محققین کے تمام منابع اور ماخذ' حوالہ جات و دستاویزات جو اسلام کے بارے میں تحقیقات کیلئے استعمال میں لائے گئے ہیں وہ سب کے سب اہلسنت والجماعت کے ذخیرہ کتب کے ہیں اور جب بھی قرآن مجید' حدیث' سیرت' فقہ اور کلام کی بات ہوتی ہے تو عام طور پر اس کا مقصد اہلسنت والجماعت کا نظریہ ہی مدنظر ہوتا ہے۔

یاصاحب الجمال ویا سید البشر

من وجہك المنیر لقد نورّ القمر

لا یمکن الثنا، کما کا ن حقّہ

بعداز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

معمولاتِ پیغمبرؐ

شمائل : اللہ ذوالجلال واکرام دنیا کے عظیم کارہائے نمایاں انجام دینے والی ہستیوں خاص طور پر انبیاء اکرام کو غیر معمولی شخصیتوں سے آراستہ فرماتا ہے۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی رہنمائی اور تہذیبوں کی تعمیر نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خصوصی افکار و کردار سے بنتی ہے۔ اور کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت مدد دیتی ہے۔ انسان کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضاء کا تناسب خاص وغیرہ اس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً انسان کا چہرہ ایک ایسا قرطاس ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی پوری داستان لکھی ہوتی ہے۔

دنیا کی عظیم ترین شخصیت حضرت نبی آخرالزماں کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر تو موجود نہیں البتہ آئمہ اہلبیت ودیگر اصحاب رسول کی بیان کردہ روایات سے جو لفظی شبیہ مرتب ہوتی ہے اس کی بابت تمام متقدمین و متاخرین اہل سیرت نے کتب سیرۃ میں بلااتفاق یہی بیان کیا ہے کہ آپ کا قد مبارک میانہ (یعنی نہ زیادہ بلند نہ زیادہ پست) تھا۔ آپ کے اعضاء مناسب، پیشانی کشادہ، ابرو پیوستہ اور رنگ گورا سرخی مائل تھا۔ چہرہ ہلکا اور لانبا تھا (یعنی آپ اتنے کلے جبڑے والے نہ تھے) آنکھیں سیاہ وسرمگیں، بڑی بڑی پلکیں اور دہن مبارک چوڑا تھا، سر کے بال زیادہ گنجان نہ تھے، ریش مبارک گھنی تھی۔ شانے بھرے بھرے اور دونوں مونڈھوں کی ہڈیاں چوڑی

تھیں۔ سینہ اقدس سے لیکر ناف مبارک تک سیاہ بالوں کی ایک لکیر قائم تھی۔ شانوں اور کلائیوں پر بھی بال تھے۔ ہتھیلیاں چوڑی اور بھری بھری تھی۔ پاؤں کی ایڑیاں پتلی اور نازک تھیں۔[۱]

ابن سعد نے مختلف راویوں کے ذریعہ حضرت علیؑ کے ارشادات تحریر کئے ہیں جن میں آپ نے لوگوں کے دریافت کرنے پر جناب رسالتمآبؐ کے شمائل یعنی حلیہ مبارک بیان فرمایا ہے جو اس طرح ہے : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سرخی مائل خوب گورے رنگ کے تھے۔ آپ کی آنکھیں نہایت خوبصورت سیاہ تھیں۔ بال سیدھے (یعنی بغیر گھونگر کے) تھے، ریش مبارک خوب گھنی تھی۔ رخسار بھرے ہوئے نہ تھے۔ بال کانوں تک تھے (یعنی پٹے تھے)، سینہ و شکم کے بال باریک تھے، گردن چاندی کا لوٹا معلوم ہوتی تھی۔ سینہ سے ناف تک شاخ کی طرح بال تھے۔ ہتھیلی بھری ہوئی تھیں جب چلتے تو اس انداز سے کہ گویا اتر رہے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا پتھر کی چٹان سے اتر رہے ہیں۔ جب مڑتے تھے تو پورا مڑتے تھے یعنی صرف گردن پھیر کر نہیں دیکھتے تھے۔ آپ کا چہرہ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا۔ پسینہ کی خوشبو تیز خوشبو والی مشک سے بھی زیادہ پاکیزہ تھی۔ نہ پست قامت تھے نہ بلند وبالا، نہ کسی کام سے عاجز تھے اور نہ بد خلق۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ "میں نے آپ کا مثل نہ آپ سے پہلے دیکھا اور نہ آپ کے بعد"۔[۲] یہی شمائل متعدد راویوں نے مختلف طریقوں سے بیان کئے ہیں جو انہوں نے حضرت علیؑ سے سنے تھے۔

مہر نبوت : مہر نبوت کی اجمالی صورت صحیح مسلم میں یوں بتلائی گئی ہے کہ وہ شانہائے مبارک کے نیچے تخم کبوتر کے برابر ابھرا ہوا سرخ رنگ کا گوشت تھا۔ اس کی بابت صحیح ترمذی میں یہ الفاظ ہیں۔

[۱] اسوۃ الرسول ص: ۱ ج: ۳ بحوالہ شمائل ترمذی وحیات القلوب [۲] طبقات ابن سعد ص: ۲۰۶ ج: ۲

رایت الخاتم بین کعفی بیضه الحمامة

(راوی کا بیان ہے کہ) میں نے آنحضرت صلعم کے شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا تھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ بائیں شانہ کے قریب چند دانوں کا مجموعہ تھا جو ایک معلوم ہوتا تھا اور چھوٹے دائرے کی صورت میں گول ہو گیا تھا۔ اور اس پر بال نکل آئے تھے۔ ان دونوں روایتوں کی مطابقت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے نیچے جسم مبارک کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا اس پر تل کے دانے تھے اور بال بھی نکل آئے تھے۔

ابن سعد نے ابی رمثہ سے روایت بیان کی ہے کہ میں اپنے والد کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قریب گیا، والد نے زخم کی طرح کا ایک نشان رسول اللہ صلعم کے شانوں کے درمیان دیکھا تو عرض کی : یارسول اللہ میں بڑا طبیب ہوں، کیا اس کا علاج نہ کردوں ؟ فرمایا نہیں، اس کا طبیب وہی ہے جس نے اسے پیدا کیا۔[۱]

جناب فوق بلگرامی نے تحریر کیا ہے کہ بعض عقیدتمند محدثین نے اسی کو مہر نبوت ٹھرالیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اسکے دور (گرداگرد) میں کلمہ طیب لاالله الاالله ومحمد الرسول الله منقوش تھا۔ یہ حدیثیں بالکل ضعیف اور مقطوع الاسناد ہیں۔ ان خوش عقیدہ علماء نے غلط فہمی سے اس کو مہر نبوت سمجھا۔ باتفاق جمہور مہر نبوت چاندی کی ایک انگوٹھی تھی جس پر تین سطروں میں محمد رسول اللہ (ﷺ) لکھا تھا۔ رسالتمآبؐ اس انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ کی انگشت آخر میں پہنے رہتے تھے۔ وہ فرامین، خطوط اور دیگر معاہدو غیرہ پر مہر کرنے کے کام آتی تھی۔ یہ وہی انگشتری مقدس تھی جو حضرت عثمان کے ایام خلافت میں ان کے ہاتھ سے ایک کنویں میں گرپڑی اور پھر نہ ملی۔[۲]

[۱] طبقات ابن سعد ص: ۲۲۴ ج: ۲ [۲] اسوۃ الرسول ص: ۲ ج: ۳

رفتار مبارک : آپ میانہ رفتار تھے۔ لیکن ضرورت کے وقت جب سرعت سے چلنے لگتے تھے۔ تو رفتار اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ گویا آپ ڈھالوے مقام سے اتر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ فوق بلگرامی کا خیال ہے کہ یہ روایتیں صرف راویوں کی عقیدتمندی ہیں۔

طرز گفتگو : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فطر تاشیریں گفتار تھے اور نرم زبان گفتگو میں فقرہ فقرہ اور لفظ لفظ جدا جدا اور ٹھہر ٹھہر کر ادا فرماتے تھے۔ اسلئے کہ مخاطب کو ان کی تفہیم میں زحمت نہ ہو۔ افراط اخلاق کا اکثر اوقات اثنائے گفتگو میں یہ عالم ہوتا تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین مرتبہ فرماتے تھے۔ جس امر پر زور دینا ہوتا تھا بار بار اس کا اعادہ فرمایا جاتا تھا۔

آپ بلند آواز تھے۔ اور نہایت خوش اخلاق۔ حضرت ام ہانی فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ حرم محترم میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔ اور ہم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے تلاوتِ قرآن کے ثواب سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے۔

ہند ابی ہند سے مروی ہے۔ آپ اکثر اوقات متفکر رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا ایک ایک فقرہ اور لفظ صاف اور واضح ہوتا تھا۔ ہاتھ سے اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ اٹھاتے تو ہتھیلی کا رخ بدل دیتے۔ تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ہنستے بہت کم تھے۔ مسکراہٹ آپ کی ہنسی تھی۔

اسوہ حسنہ : حیات القلوب میں ابن شہر آشوب سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے زیادہ عقل و حکمت رکھنے والے۔ فرزانگی اور دانشمندی میں کامل۔ سب سے زیادہ حلیم اور عادل تھے۔ سب سے زیادہ شجاع اور مہربان تھے۔ بہت بڑے غیور

تھے۔ خود محض سادہ اور معمولی کھانا کھاتے تھے۔ مثل جو اور خرما وغیرہ کے۔ آپ سے جو مانگا جاتا تھا وہ آپ عطا فرماتے تھے۔ زمین ہی پر کھانا کھاتے تھے اور زمین ہی پر سوتے تھے۔ اور اپنے کپڑوں اور نعلین میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے تھے۔ اپنے گھر کے دروازے آپ کھولتے اور بند فرماتے تھے۔ دنبیوں کو اپنے ہاتھ سے دُوہتے تھے۔ اونٹوں کے پاؤں اپنے ہاتھ سے باندھتے تھے۔ رات کو سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر آرام فرماتے اور مجلس میں تکیہ لگا کر کبھی نہیں بیٹھتے تھے۔ اپنے عیال کی خدمت بذات خاص آپ فرماتے تھے۔ کھانے کے بعد انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے۔ اور جو شخص عام خواہ وہ غلام ہو یا آزاد آپ کی دعوت کرتا تھا اور آپ کو ضیافت میں بلاتا تھا تو آپ اُسے قبول فرمالیتے تھے اگرچہ وہ دعوت وضیافت ایک پارچہ گوشت ہی کی کیوں نہ ہو اور کسی کا بھیجا ہوا تحفہ اگرچہ وہ کتنا ہی قلیل ہو قبول فرمالیتے تھے مگر صدقے کی کسی شے پر نظر نہیں اٹھاتے تھے۔ آنکھوں میں آنکھیں ملا کر بہت کم باتیں کرتے تھے۔ اور محض دنیا کیلئے کسی پر عتاب نہیں فرماتے تھے۔ خدا کے حکم کے مطابق جو غضب کے قابل ہوتا اس پر البتہ عتاب فرماتے تھے۔ بھوک کی شدت سے پیٹ پر پٹی باندھے رہتے تھے اور جو آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا آپ تناول فرمالیتے تھے اور کسی چیز کے کھانے سے انکار نہیں فرماتے تھے۔ بردیمنی پہنتے تھے اور بالوں کا جُبّہ بھی۔ اور محض موٹے جھوٹے روئی کے بُنے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے علی الاکثر آپ کا لباس سفید رنگ کا ہوتا تھا۔ ہمیشہ فرق مبارک پر عمامہ باندھے رہتے تھے۔ اور جب آپ نیا کپڑا پہنتے تھے تو پُرانا کپڑا محتاج ومسکین کو دیدیا کرتے تھے۔ نفیس کپڑے کا بھی ایک جوڑا رکھتے تھے۔ اُسے جمعہ کے روز پہنا کرتے تھے۔ اور ایک عبا اپنے ہمراہ رکھتے تھے جہاں جاتے تھے وہاں چار تہہ کرکے بچھا لیتے تھے۔ چاندی کی ایک انگوٹھی سیدھے ہاتھ کے اخیر انگلی میں پہنے رہتے

تھے۔ خربزہ شوق سے کھاتے تھے۔ بدبودار چیزوں سے ہمیشہ نفرت فرماتے تھے۔ اور ہمیشہ وضو سے پہلے مسواک کرلیا کرتے تھے۔ جو سواری دستیاب ہو جاتی تھی بلا تکلف اس پر سوار ہو جاتے تھے۔ کبھی اپنے غلاموں میں سے کسی کو یا کسی اور کو سواری کے پیچھے بٹھالیا کرتے تھے اونٹ گھوڑے، خچر اور گدھے پر بغیر زین وپالان کے بھی سوار ہو جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی (عندالحاجت) پاپیادہ اور سر برہنہ بے رداو عمامہ گھر سے باہر نکل کر بیرون مدینہ تک مشایعت اور عیادت مریضان کی ضرورت سے تشریف لایا کرتے تھے۔ فقیر ومساکین کے ساتھ بلا تکلف بیٹھ جاتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا بھی تناول فرمالیتے تھے اصحاب علم وعقل اور ارباب اخلاق واشفاق سے محبت رکھتے تھے اور بزرگان قوم کی بڑی عزت فرماتے تھے۔ اپنے اعزا اور اقارب پر ہمیشہ احسان فرماتے تھے۔ اور کبھی ان کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور جو کوئی شخص عذر خواہ خدمت ہوتا تھا اسکے عذر کو قبول فرمالیتے تھے۔ علی الاکثر تبسم فرماتے تھے اور آواز سے بہت کم ہنستے تھے بلکہ ہنستے ہی نہ تھے لیکن موعظت امت اور نزول کتاب اللہ کے وقت چہرہ مبارک جلال قدرت سے سُرخ ہو جاتا اور اس وقت تبسم تک پاس نہ آتا تھا۔ غلاموں کیساتھ آپ کسی امر میں زیادتی نہیں فرماتے تھے۔ کبھی ان کو کلمات سخت وسست نہیں کہتے تھے اور جب کوئی غلام کنیز یا آزاد شخص آپ کو اپنی مدد کیلئے بلاتا تھا آپ فوراً اسکے ہمراہ ہو جاتے تھے۔ طبیعت میں درشتی ذرا بھی نہیں تھی۔ یہانتک کہ گفتگو میں بھی کبھی صدائے مبارک دُرشت وبلند نہیں ہوتی تھی بُرے لوگوں کیساتھ نیکی ضرور کی جاتی تھی۔ یہی ان کی جزا اور معاوضہ تھا۔ جو کوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ آپ پہلے اس کو سلام کرتے اور پہلے اس سے مصافحہ فرماتے۔ اور جس مجلس یا مجمع میں آپ بیٹھتے تھے۔ یاد خدا فرماتے تھے۔ اکثر آپ روبہ قبلہ ہو کر بیٹھتے تھے۔ جو آپ کے پاس آتا تھا آپ

اسکی قدر فرماتے تھے اور اعزاز واکرام فرماتے تھے۔ کبھی اپنی ردا اسکے لئے فرش کر دیتے تھے۔ کبھی اپنا تکیہ اسکے آگے بڑھا دیتے تھے حق بات کہنے میں آپ کو کسی وقت کسی کی خوشی یا کسی کے غم وغصہ کا ذرا بھی خیال نہ ہوتا تھا۔ ککڑی، جو یا خرمے کیساتھ کھائی جاتی تھی۔ کبھی نمک کیساتھ ترمیوون میں خربزہ اور انگور بہت پسند تھے۔ اکثر خوراک آپکی خرما اور پانی یا خرما اور دودھ ہوتی تھی۔ گوشت اور ثرید کو بھی بہت دوست رکھتے تھے۔ خود شکار نہیں فرماتے تھے مگر شکار کا گوشت بہت پسند فرماتے تھے۔ پنیر اور روغن بھی مرغوب خاطر تھا۔ گوشت میں دست وشانہ کا گوشت، شوربے میں کدو کا شوربا کھاتے تھے روٹی کیساتھ کھانے والی چیزوں میں سرکہ اور سبزی میں کاسنی اور بادروج زیادہ پسند تھا۔ (حیات القلوب مطبوعہ نول کشور ص: ۱۲۰-۱۲۱)

لباس مبارک: لباس کی نسبت نہ کوئی التزام تھا اور نہ پوشش وآرائش جسمانی کا کوئی انتظام۔ لباس رسالت صرف تین پارچون پر تمام تھا۔ چادر، قمیض اور تہمد۔ پاجامہ کبھی نہیں پہنا۔ لیکن امام احمد بن حنبل اور امام سنن اربعہ لکھتے ہیں کہ منیٰ کے بازار میں آپ نے ایک پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن القیم نے اسی پر قیاس کیا ہے کہ جب خریدا ہوگا تو پہنا بھی ہوگا۔ موزوں کی عادت نہیں تھی۔ مگر نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے وہ آپ نے پہنے تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا۔ کبھی تحت الحنک کی طرح لپیٹ لیا جاتا تھا عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا۔ عمامہ کے نیچے کی ٹوپی سر سے لپٹی ہوئی ہوتی تھی۔ اونچی ٹوپی کبھی نہیں استعمال کی گئی۔ عمامہ کے نیچے ٹوپی پہنا ضرور تھا اسلئے کہ ارشاد ہوتا تھا کہ عمامہ کے نیچے کی ٹوپی مشرکین اور منافقین کا معیار امتیاز ہے۔ ہم میں اور مشرکین میں یہی فرق ہے کہ وہ ٹوپیوں پر عمامہ نہیں باندھتے ہیں اور ہم باندھتے ہیں۔ لباس میں سب سے زیادہ یمن کی وہ لریدار (مخطط) چادریں بہت پسند تھیں۔ جن کو

...کہتے ہیں۔ شامی عبا بھی استعمال کی گئی تھی۔ مگر اسکی آستینین اتنی تنگ تھیں کہ وضو کرنے کے وقت آخر اتارنا پڑا۔ اسلئے طبوع خاطر نہیں ہوئیں۔ ...کو پسند نہ فرمانیکی یہی صورت ہوئی۔ قیصر رومی نے تحفہ میں پائجامہ بھیجا۔ پہن کر نماز پڑھی نشست وبرخاست نماز میں تکلف ہونے لگا اس لئے نماز پڑھ کر اتار دیا۔ پھر نہ پہنا۔ شامی عبا کے علاوہ نوشیروانی عبا بھی پہنی گئی ...جسکے جیب اور آستیوں پر دیبا کی سنجاف لگی تھی اور جب انتقال کیا تو گھر میں سوائے ایک کمبل اور ایک گزی کی تہمد کے کچھ اور نہ تھا۔ (سیرۃ النبی جلد ۲)

ممانعت جامہ حریر: جامہ حریر پہننے کی سخت ممانعت فرماتے تھے۔ ارشاد ہوتا تھا کہ جامہ حریر نہ پہنو کہ اس کی وجہ سے جلد کو آتش جہنم میں جلایا جائے گا۔ پشمینہ کے موٹے جھوٹے کپڑوں کے پہنے کی تاکید فرمائی جاتی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ میں پانچ چیزیں مرتے دم تک نہ ترک کروں گا۔ اوّل زمین پر بیٹھ کر غلاموں کے ساتھ کھانا کھانا۔ دوسرے قاطر پر بغیر جھول کے سوار ہونا۔ تیسرے بکری کو اپنے ہاتھ سے دوہنا۔ چوتھے بچوں کو سلام کرنا۔ پانچویں اون یا پشمینے کے کپڑے پہنا۔ ہاں پشمینہ کے کپڑے اظہار تمول اور تفاخر کے لحاظ سے پہنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں ایک گروہ ہوگا جو جاڑے گرمی میں پشمینہ کے کپڑے پہنا کریں گے اور یہ گمان کریں گے کہ ان کپڑوں کے پہنے سے ہمیں اوروں پر فضیلت اور رتبہ حاصل ہے۔ مگر اس گروہ پر آسمان وزمین کے فرشتے لعنت کریں گے۔

سفید رنگ کا لباس بہت مطبوع تھا۔ ارشاد فرماتے تھے کہ سفید کپڑے پہنا کرو کہ یہ رنگ سب سے عمدہ اور پاکیزہ ہے اور اپنے مُردوں کو بھی اسی رنگ کا کفن دیا کرو۔ زیادہ نیچے کپڑے پہنا، آستینین زیادہ لمبی رکھنا اور کپڑوں کو از رُوئے تکبر زمین پر گھسیٹتے چلنا مکروہ ومذموم بتلایا گیا ہے۔

آداب طعام : دستر خوان پر جو کھانا آتا تھا اگر وہ پسند خاطر نہ ہوتا تو صرف اس میں ہاتھ نہ ڈالا جاتا اور بس اس کی کسی طرح کی بُرائی یا خرابی نہیں ظاہر کی جاتی تھی۔ جو سالن سامنے ہوتا تھا اس میں ہاتھ ڈالا جاتا تھا اور گرد کے برتنوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا جاتا تھا۔ اس طریق سے اوروں کو بھی منع کیا جاتا تھا۔ کبھی تکیہ مسند یا دیوار وغیرہ پر ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے اور اس طریق سے کھانے کو بالکل ناپسند فرماتے میز یا خوان پر رکھ کر کبھی آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی عجم اسی پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے۔ چونکہ یہ فخر و امتیاز کی علامت تھی۔ یعنی امرا و اہل جاہ کیساتھ مخصوص تھی۔ اس لئے آپ نے اس پر کھانا پسند نہ فرمایا۔ بدبودار چیزیں مثل پیاز، لہسن، مولی وغیرہ پسند خاطر نہیں تھیں۔ (سیرۃ النبی جلد دوئم)

مرغوب رنگ : سرخ رنگ کسی وقت مطبوع خاطر نہ ہوا۔ اور نہ ازواج مطہرات کو سرخ رنگ کے کپڑے پہننے کی اجازت دی۔ سوائے سرخ رنگ کے اور سب رنگ مرغوب خاطر تھے۔ صرف لڑکوں کو زرد رنگ کے کپڑے پہنانے کی ممانعت کی جاتی تھی۔ سبز رنگ سے خاص شوق تھا۔ اس لئے کہ خاندان ہاشم کا یہ خاص رنگ ہے۔ سیاہ رنگ کے لباس بھی ہمیشہ مستعمل ہوتے تھے۔ عمامہ کبھی سبز ہوتا تھا اور کبھی سیاہ۔ سفید رنگ سب سے زیادہ پسند تھا ارشاد ہوتا تھا کہ یہ رنگ تمام رنگوں سے بہتر ہے۔

خوشبو سے خاص شوق : اکثر ارشاد فرماتے تھے کہ مجھ کو دنیا کی تمام چیزوں میں تین چیزیں پسند آئیں۔ دودھ، شہد اور خوشبو۔ خوشبو کا تحفہ کبھی واپس نہ دیا جاتا تھا۔ آپ ہمیشہ لباس میں خوشبو لگایا کرتے تھے۔ اسلئے جس گلی کوچہ میں نکل جاتے تھے تمام معطر ہو جاتا تھا۔ عرب میں اس وقت ایک قسم کا عطر ہوتا تھا۔ جس کو سُکہ کہتے تھے آپ ہمیشہ اسی کا استعمال فرماتے تھے۔ علامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ دستور

تھا کہ اگر جمعہ کے دن آنحضرتؐ کے توشہ خانہ میں خوشبو نہ ہوتی تھی تو اُمہات مومنین میں سے کسی کا رومال منگا لیتے تھے۔ جس میں خوشبو لگی ہوتی تھی اور اس کو تر کر کے روئے اقدس پر مل لیتے تھے۔

ایک دن عثمان ابن مظعون نے حاضر ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ میں چاہتا ہوں کہ میں خوشبو اور بعض اور لذت کی چیزوں کو ترک کر دوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ خوشبو نہ ترک کرنا کیونکہ فرشتے مومن کی خوشبو سونگھتے ہیں اور جمعہ کے دن تو کسی طرح بھی ترک نہ ہو۔ یہ بھی فرمایا کہ خوشبو میں جو رقم صرف ہو وہ داخل اسراف نہیں ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روپیہ کھانے سے زیادہ خوشبو میں اٹھتا تھا۔ آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کے لگانے کی خوشبو ایسی ہو جس کی بو ظاہر اور رنگت مخفی ہو۔

(ترجمہ حلیۃ المتقین ص: ۱۶۵)

نفاست پسندی : مزاج میں بڑی نفاست اور صفائی تھی۔ ذرا سی کدورت دیکھنی بھی طبع مبارک پر ناگوار تھی۔ اہل عرب کی طبیعت صفائی پسند نہیں تھی۔ بادیہ و صحرا کے رہنے والے مکان کی صفائی کیا جانیں۔ مسجد میں نماز یا خدمت رسولؐ میں اظہار نیاز کی غرض سے آتے تو عین حالت عبادت یا مابین مکالمت مسجد کی دیواروں اور مسجد کی زمین پر بلا تکلف تھوک دیتے۔ آنحضرتؐ ان کے اس غیر مہذبانہ طریقے کو ازحد ناپسند فرماتے تھے اور خود چھڑی کی نوک سے زمین و دیوار کے دھبے کھرچواتے تھے۔

شہسواری و تیر اندازی : جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسپ درانی اور شہسواری کا بہت شوق تھا۔ ویسے تو آپؐ کو تمام سواریوں کی مشق و عادت تھی مگر گھوڑے کی سواری خاص طور پر پسند فرماتے تھے۔ اور آپ گھوڑ سواری میں بڑے مشتاق تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ

الخیل معقود فی نواصیھا الخیر یعنی نیکیاں گھوڑوں کی پیشانیوں سے گندھی ہیں۔ آپؐ کے خاص گھوڑے کا نام لحیف تھا جس کو بروایت عام ذوالجناح اور بروایت ناسخ التواریخ مرتجز کہتے تھے۔ آپؐ کے گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دلدل تھا۔ آپؐ کے اونٹوں کے نام قصوا اور عضبا تھے۔

جناب رسالتمآبؐ تیر اندازی و نیزہ بازی کے فنون میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے حالانکہ آپؐ نے ان فنون میں سے کسی کو بھی اکتساباً حاصل نہیں کیا تھا یعنی یہ فنون حرب آپؐ نے کسی انسان سے نہیں سیکھے تھے۔

معمولات روز و شب : جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوقات و مشاغل روز و شب کی تفصیل فریقین نے امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی روایت سے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ ایک حصہ ذکر و عبادت الٰہی کے لئے مخصوص تھا، دوسرا حصہ خلق خدا کی افادیت اور تعلیم امت کیلئے مخصوص تھا اور تیسرا حصہ آپؐ کی اپنی خاص ضروریات کیلئے مختص تھا۔

آپ کے روزانہ معمولات تھے کہ آپؐ نماز فجر کے بعد مصلہ ہی پر دو زانو بیٹھے رہتے تھے یہانتک کہ آفتاب طلوع ہو جاتا تھا اور لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہونے لگتے تھے حتیٰ کہ مخلصین و معتقدین سے مجلس رسالت مُد ہو جاتی تھی۔ یہی دربار نبوت ہوتا تھا اور یہی وقت دربار رسالت تھا۔ آپ کی جائے نماز جس پر آپ جلوہ فرما ہوتے تھے وہی مسند رسول ہوتی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے آپ تمام اہل اسلام کے ہر خاص و عام کو عزت بخشتے تھے، وہیں پر معرفت و حقیقت کے دربار موجزن ہوتے تھے اور وہیں پر ارشاد و ہدایت کا سحاب رحمت برس رہا ہوتا تھا۔ اسی محفل میں واعظ و نصیحت کے بعد روزمرہ کی گفتگو کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ حاضرین باہمی ذکر و اذکار کرتے تھے

آنحضرتؐ بھی اکثر ان کی بات چیت پر توجہ فرماتے تھے۔ لوگ اشعار بھی پڑھتے اور جاہلیت کے پشتینی کارنامے بھی بیان کرنے لگتے تھے۔ آنحضرتؐ ان کو سنتے اور کبھی کسی خوشگوار واقعہ پر تبسم بھی فرما دیتے تھے۔

اکثر و بیشتر تقسیم غنائم اور وظائف کا بھی یہی وقت ہوا کرتا تھا۔ ان تمام امور سے فراغت کے بعد جب خوب دن چڑھ جاتا تب آپ بیت الشرف تشریف لے جاتے اور وہاں اپنے ذاتی امور و گھریلو کام کاج میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان مشاغل میں ظہر کا وقت ہو جاتا، آپ مسجد میں تشریف لیجاتے، نماز ظہر اور عصر ادا فرماتے تھے درمیانی وقفہ میں پند و وعظ فرماتے لوگوں کو ہدایت و معرفت کی باتیں بتلاتے تھے بعد فراغت تمام ازواج کے حجروں میں تھوڑی دیر بیٹھتے باتیں کرتے یہانتک کہ مغرب کا وقت آجاتا۔ آپ پھر مسجد میں تشریف لے جاتے۔ مغرب سے عشاء تک نماز اور باقی وقت میں پھر وہی تعلیم دین کا سلسلہ قائم ہو جاتا۔ نماز عشاء کے بعد جس معظمہ کے جانا ہوتا ان کے ہاں تشریف لے جاتے، دیگر ازواج بھی وہیں پر آجاتیں اور کچھ دیر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد وہ محترمات واپس جاتیں تب آپ استراحت فرماتے تھے۔

سونے سے قبل آپ قرآن مجید کا کوئی سورہ ضرور تلاوت فرماتے تھے جس کے بعد یہ دعائیہ کلمات کہتے : اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیٰ ترجمہ : خدایا تیرا ہی نام لیکر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں۔ اسی طرح جب آپ نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے : اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَحیَا مَا بَعدَ مَا اَمَا تَنَا وَاِلَیہِ النُّشُوْرُ ترجمہ : شکر ہے اس خدا کا جس نے موت کے بعد پھر زندہ کیا اور اسی کی طرف حشر ہوگا۔

جناب رسالتمآبؐ کا یہ معمول تھا کہ آپ ہمیشہ داہنی کروٹ سوتے اور دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھتے تھے۔ البتہ دوران سفر منزل پر جب

آرام فرماتے تو دایاں ہاتھ اونچا کر کے چہرہ کو اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہر نیند آجائے۔ نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی۔ آپ کیلئے پلنگ و بستر کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا آپ زمین پر ہی سو جاتے تھے۔

معمولات عبادات: معمولات عبادات کیا کہنا ہے محبوب الٰہی کی عبادت کا اور کیا ذکر ہو اس عبادت گذار کی طہارت و عصمت کا کہ جس کو معبود حقیقی "طٰہٰ" کے لقب سے مخاطب کرے۔ کیا شان ہے ختمی مرتبت کی کہ جنکے معمولات عبادات کی تفصیل ہم تک پہنچی ورنہ سابقہ انبیاء و مرسلین کے طریقہ عبادت کی معلومات انتہائی ناکافی ہیں اور جو ہیں بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر۔ ویسے تو توریت میں حضرت آدمؑ تا حضرت موسیٰ علیہم السلام کے حالات مندرج ہیں مگر ان میں سے کسی بھی نبی کے طریقہ عبادت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حضرت عیسیٰ کے طریقہ عبادت کی بابت صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپ دعائیں مانگا کرتے تھے جبکہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ عبادت یعنی تکبیر و تہلیل، قیام و قعود، رکوع و سجود اور تحمید و تسبیح کی مکمل تفصیل کتب سیرت و احادیث میں مرقوم ہے۔

جناب ختمی مرتبت کی عبادت کا سلسلہ بعثت نبوت سے نہیں ہوا بلکہ قبل از رسالت بھی آپؑ عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ یہ عبادت بقول علامہ عینی فکر و عبرت پذیری تھی جسے محدثین کی اصطلاح میں "تحنث" کہتے ہیں۔ اور بقول مولانا شبلی نعمانی "یہ وہی عبادت تھی جو آپؐ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کی تھی"۔ بعثت رسالت کے ساتھ رب ذی الجلال نے آپ کو طریقہ عبادت کی تعلیم دی لہٰذا اس وقت سے وہی طریقہ عبادت آپؐ نے قائم فرمایا۔

نماز: حیات القلوب میں ابو سعید خدری کی زبانی نبی آخر الزماں کی نماز کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ آپکے وضو کا پانی آپ کے سرہانے رکھا رہتا تھا

اور پانی کا ظروف کپڑے سے ڈھانک دیا جاتا تھا اور مسواک بچھونے کے نیچے رکھ لیجاتی۔ تھوڑی دیر آرام فرماتے تھے۔ اٹھتے تھے تو آسمان کی طرف دیکھتے اور سورۂ آل عمران کی آخری آیتیں پڑھتے پھر مسواک کرتے اور وضو فرما کر چار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ رکوع و سجود میں قرائت کے انداز سے طول فرماتے تھے۔ نماز پڑھ کر پھر فرش خواب پر استراحت فرماتے اور تھوڑی دیر سو رہتے تھے۔ پھر اٹھتے اور آسمان کی طرف نگاہ فرماتے تھے اور انھیں آیتوں کو پڑھتے تھے پھر مسواک کر کے وضو فرماتے اور اسی طرح چار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ پھر فرش خواب پر جا کر تھوڑی دیر کیلئے سو رہتے تھے۔ پھر اسی طرح چار رکعت نماز پڑھتے پھر سو رہتے تھے۔ پھر بیدار ہو کر اسی طرح اعمال بجالاتے پھر نماز نافلہ صبح ادا فرماتے اور پھر مسجد میں تشریف لیجاتے تھے۔[1]

جناب عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کے معمولات نماز شب کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے ایک روز وہ اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر میں اس روز رہے جب حضرت میمونہ کی باری کا دن تھا اور آنحضرتؐ وہاں قیام فرما تھے۔ جناب عبداللہ بن عباس نے اپنا مشاہدہ اسطرح بیان کیا ہے کہ

> "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ زمین پر فرش بچھا ہوا ہے اس پر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرماتے تھے۔ میں آپؐ کے مقابل آڑا ہو کر سویا۔ رات گئے آپ آنکھیں ملتے ہوئے بستر خواب سے اٹھے۔ آل عمران کی آخری دس آیتیں تلاوت فرمائیں۔ پاس ہی مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ اتارا اور وضو فرمایا پھر نماز شروع کی۔ میں بھی وضو کر کے آپؐ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب کر لیا۔ آپ نے اس وقت تیرہ رکعتیں پڑھیں۔ اس کے بعد فرش استراحت پر لیٹ گئے تاپنکہ سونے کی آواز آنے لگی اتنے

[1] بحوالہ اسوۃ الرسول ص: ۱۸ ج: ۴

> میں صبح ہو گئی۔ بلال کی آواز سن کر بیدار ہوئے۔ فوراً فجر کی سنتیں ادا کیں اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے تھے۔" (اسوۃ الرسول ص: ۱۷ ج: ۴)

لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ آپ نے صبح کی نماز میں ساٹھ سے لیکر ایک سو آیتوں تک کی تلاوت فرمائی ہے نماز فجر کی نسبت ظہر و عصر کی نمازوں میں طویل تلاوت نہیں فرماتے تھے۔

تفویض رسالت کے بعد ایک زمانہ تک جناب رسالتمآبؐ نے عبادت الٰہی میں بڑی محنت شاقہ اٹھائی۔ دن رات نماز میں کھڑے کھڑے آپ کے پیروں پر ورم آگیا تھا۔ محبوب الٰہی کا کوئی وقت ذکر الٰہی سے خالی نہ ہوتا تھا خواہ صحابہ کی مجلس ہو یا ازواج کی خلوت گاہ جوں ہی اذان کی آواز سنی فوراً کھڑے ہو گئے اور ذکر الٰہی میں محو ہو گئے۔ آپ کی عبادات اللہ کے اس ارشاد کے عین مطابق تھیں کہ "جو خدا کو اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے یاد کرتے ہیں جن کو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

علامہ باقر مجلسی نے حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی اسناد سے آنحضرتؐ کی کثرت عبادت کا ایک واقعہ اس طرح تحریر کیا ہے۔

> "در حدیث معتبر از حضرت امام زین العابدین صلوٰۃ اللہ علیہ منقول است کہ فرمود پدر و مادرم فدائے جدم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باد کہ باں منزلت کہ اورا نزد حق تعالیٰ ہم رسیدہ وآں وعدہائے کرامت کہ باو دادہ شد اہتمام و سعی در بندگی خدا ترک نہ کردہ تا آنکہ ساق پائے مبارکش باد کردہ وقدم محترمش ورم کردہ پس گفتند با آنحضرت صلعم کہ چرا بخود رنج و تعب میفرمائی و حالانکہ خدا گناہ گذشتہ وآئندہ ترا آمرزیدہ است۔ فرمود کہ آیا بندہ شکر کنندہ خدا نباشم۔

ترجمہ: حدیث معتبر میں امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا آپ نے کہ میرے ماں باپ فدا ہوں جناب رسول خدا

> صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ باوجود ان مراتب جلیلہ کے جو منجانب خدا آپکو تفویض فرمائے گئے تھے اور باوجود ان کرامتوں کے جو آپ کو عطا کی گئی تھیں آپ نے تاہم اہتمام خاص اور کوشش ہائے بلیغ تمام عمر خدا کی عبادت میں ترک نہ فرمائی۔ یہانتک کہ کثرت عبادت سے آپ کی پنڈلیاں اینٹھنے لگیں اور پاہائے مبارک پر ورم آگیا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے عرض کی کہ آپ اپنی جان پر اتنی مشقت کیوں کرتے ہیں حالانکہ آپ کے تو گناہاں گذشتہ و آئندہ سب کے سب معاف ہو چکے ہیں۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ خدا کا بندہ شکر گزار نہ کہا جاؤں۔" (اسوۃ الرسول ص: ۵۳ ج: ۴)

اسی بات کو ابن سعد نے مغیرہ بن شعبہ اور ابو سلمہ سے روایت کیا ہے۔[1] ماہ رمضان میں آپ کی عبادات اور زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ رمضان کے پورے مہینہ کی راتیں آپ ادائے نماز اور ذکر الٰہی میں بیدار رہ کر کاٹ دیتے تھے۔ اور اس ماہ مبارک کے آخری دس روز مسجد میں حالت اعتکاف گذارتے تھے۔

روزہ: نماز کے بعد واجبات میں روزہ کا شمار ہوتا ہے جناب رسالتمآبؐ جس کثرت سے نماز پڑھتے تھے اسی کثرت سے آپ روزے بھی رکھتے تھے۔ رمضان المبارک کے پورے مہینہ کے علاوہ شعبان کا مہینہ بھی آپ کا روزوں ہی میں گذر جاتا تھا۔ سال کے بقیہ دس مہینوں میں ہر ماہ کی تیرہ' چودہ اور پندرہ تاریخوں میں جنہیں اصطلاح محدثین میں ایام بیض کہتے ہیں آپ ضرور روزہ رکھتے تھے۔ نیز ہر دو شنبہ یعنی پیر اور ہر پنجشنبہ یعنی جمعرات کو بھی آپ کا روزہ ہوتا تھا اس کے علاوہ بھی اکثر روزہ سے ہوتے تھے۔

زکوٰۃ: جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیرات و مبرات کرنا تو آپ کی فطرت صالحہ تھی۔ عام بخشش اور داد و دہش آپکے خاص اوصاف تھے اس وقت یہ اندازہ کرنا بالکل ناممکن ہے کہ آپ نے کرم و ایثار میں کتنی رقم خدا

[1] طبقات ابن سعد ص: ۱۸۳ ج: ۲

کی رلو میں مستحقین اور عام فقراء و مساکین کو عنایت فرمائی۔ اسی کیساتھ یہ تجسس و تلاش بھی بیکار ہے کہ رسول اللہ صلعم کے پاس اتنی کثیر رقم کہاں سے آئی۔ اس کے متعلق اتنا یقین کر لینا کافی ہو گا کہ خدا دینے والا تھا اور رسول لینے والا۔ جب خدا کے جیسا دینے والا ہو تو پھر کیا کمی۔

مولانا شبلی نعمانی نے زکوۃ کی بابت تحریر کیا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات و مبرات کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہ نے شہادت دی ہے۔ اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس نہیں رہنے دیتے تھے۔ جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے۔ لیکن بایں جہ زکوۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں۔ اس سے بعض فقہا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوۃ فرض نہیں ہوتی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ زکوۃ کے دو مفہوم ہیں ایک مطلق صدقہ و خیرات۔ اور اس بات میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ چاندی، سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حالت اصلیہ سے زائد ہو اور سال بھر ایک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کی جائے۔ مصطلحہ زکوۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی۔ کاشانہ نبوت میں کوئی قابل زکوۃ چیز سال بھر تک تو کیا رہتی یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گذر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اس قدر زیادہ آئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہو سکی۔ آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا اور کاشانہ اقدس میں اسوقت تک قدم نہیں رکھا جب تک کہ حضرت بلال نے یہ آکر اطلاع نہیں دی کہ یا رسول اللہ صلعم خدا نے آپ کو سبکدوش کر دیا۔[1]

حج: بیت اللہ اور عبادت خانہ ابراہیمی کی عظمت و حرمت ہمیشہ سے آپ کے دل میں جاگزین تھی۔ بعثت نبوت سے قبل آپ حج ادا کرتے تھے مگر ان کی

[1] سیرۃ النبی ص: ۲۰۵ ج: ۲

تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ابن اثیر نے قیاس کی بنیاد پر تحریر کیا ہے کہ قریش معمولاً ہر سال حج ادا کیا کرتے تھے اس لئے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہونگے۔ زمانہ رسالت میں صرف ایک حج ثابت ہے جو ۱۰ھ ہجری میں ادا کیا گیا اور جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ حج کے علاوہ آپ نے متعدد عمرے بھی کئے۔ شبلی نعمانی صاحب نے جن کی تعداد چار بتلائی ہے۔ ان تمام عمروں میں آپ کا وہ عمرہ جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی مشہور و معروف ہے۔

خطبات: حضرت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقرر قدرت تھے۔ آپکی خطابت اعلیٰ ترین معیار کی سلاست و نفاست کا نمونہ تھی۔ آپ کی قدرت زبانی اور صداقت بیانی نے عرب کے مشہور و معروف خطیبوں اور بڑے بڑے زباندانوں کی زبانیں بند کر دیں تھیں۔ جناب رسالتمآب کا یہ اعلان کہ بعثت بجوامع الکلام یعنی میں تو اصناف کلام کا مجموعہ بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ ایسا جامع و بر حق اعلان تھا جسکو دنیائے عرب کے ارباب زبان اور اصحاب بیان نے متعدد بار آزمایا اور خطبات رسالت کو اصناف کی جامعیت کے مطابق پایا۔ عام طور سے اہل عرب میں قریش اور ہوازن دو قبیلوں کی زبان سب سے بہتر و مستند مانی جاتی تھی مگر جناب رسالتمآب کی زباندانی کے سامنے ہر دو قبائل کے زباندانوں کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں۔ رسالتمآب صلعم کا ارشاد ہے کہ

"انا اعربكم الامن قريش ولسانى لسان بنى سعد بن بكر"

ترجمہ: میں تم میں سب سے زیادہ فصیح ہوں اس لئے کہ میں قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد بن بکر کی زبان ہے۔"

جناب رسالتمآبؐ کے ارشاد کا طریقہ بالکل سادہ، عام فہم اور واضح ہوتا تھا آپ کے خطبات میں نہ تو مبہم و مغلق الفاظ ہوتے تھے اور نہ ہی استعارات، تلمیحات و تشبیہات کا استعمال ہوتا تھا۔ آپؐ ہمیشہ شستہ، آسان اور عام فہم الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔ آپؐ کے کلام میں ترتیل و ترسیل کا خاص

اہتمام ہوتا تھا یعنی جملوں کی ترتیب بہت خوب ہوتی تھی اور آپ ان جملوں کو بہت ٹھہر ٹھہر کر بیان فرماتے تھے۔ آپؐ کے انداز بیان کی خوش اسلوبی و مرغوبیت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سامعین اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے جو ایک بار مجلس میں بیٹھ گیا وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

جناب رسالتمآبؐ کے خطبات کے اجراء کیلئے نہ کوئی خاص اہتمام و انتظام ہوتا، نہ ہی کسی سامان کی حاجت ہوتی اور نہ ہی کسی خاص تمہید و عنوان کی ضرورت پیش آتی تھی۔ آپؐ کے خطبات کی مجلس میں ہر قوم و قبیلہ اور ہر مذہب و ملت کے افراد بلا کسی روک ٹوک کے شرکت کرتے تھے اسطرح دوست دشمن سب یکساں طور پر فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ خطبات رسالت کیلئے کسی مخصوص جگہ یا مکان کی احتیاج نہیں تھی بلکہ سفر، حضر، مسجد، گھر یا کوئی بھی جگہ و مقام ہو اجرائے ہدایت و ارشاد کیلئے سب موزوں و مناسب تھے۔ حتیٰ کہ جناب رسالتمآبؐ نے اونٹ کی پشت پر بیٹھے بیٹھے خطبات ارشاد فرمائے اور معتقدین نے وہیں پر ارشاداتِ ہدایت سماعت کئے۔

جناب رسالتمآب کا انداز خطابت مضمون کی مناسبت سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کی حیثیت مختلف خصوصیات کی حامل تھی آپ مبشر بھی تھے اور مبلغ بھی، معلم بھی تھے اور ناصح بھی، فاتح ممالک بھی تھے اور داعی مذہب بھی، سالار لشکر بھی تھے اور سردار قوم بھی، خدا کے پیغمبر بھی تھے اور دین و دنیا کے رہبر بھی، خدا کی رحمت خاص بھی تھے اور حاکم قتال و قصاص بھی لہٰذا جس غرض خاص سے متعلق موضوع پر خطاب فرماتے اس کا ایک خاص انداز اختیار فرماتے تھے تاکہ حاضرین و سامعین آپ کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے بھرپور اثر حاصل کریں اور ان کے قلوب آپؐ کے ارشادات کو قبول کریں۔ دوران بیان اکثر جذبات رسالت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ آپ کا چہرہ گلگوں ہو جاتا تھا۔ آواز معمول سے زیادہ بلند ہو جاتی، انگشت

مبارک بھی بار بار متحرک ہوتی جاتی تھی، دست مطہر بھی رہ رہ کر مرتفع ہو جاتے، کبھی کبھی رحمت عالم کی جبین مبارک پر غیض و غضب کے آثار بھی نمایاں ہوتے، نورانی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتیں، رخسار مبارک سرخ ہو جاتے، سراپاء مبارک میں حرکت پیدا ہو جاتی، جسم ہائے مبارک بھی گلابی ہو جاتی تھیں اور اس عالم خاص کے اثر سے آپ بار بار جھومنے لگتے تھے اس وقت آپ کے اس خاص انداز سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ آپ معتقدین کی عزت افزائی نہیں فرما رہے بلکہ ایک عظیم الشان فوج کو کسی سخت اور دشوار مہم کے سر کرنے پر آمادہ فرما رہے ہیں۔

جب آپؐ کا موضوع تخاطب تعلیم دینیات اور معارف الٰہیات کے بتلانے سکھلانے اور سمجھانے سے متعلق ہوتا تو آپ پر خوف الٰہی اور خشیۃ لامتناہی کا یہ عالم ہوتا کہ جسم مبارک میں رعشہ پڑ جاتا، گلگوں چہرہ زرد ہو جاتا، عظمت و جلال کے باعث کبھی دست مبارک سینہ پر رکھتے کبھی عذاب و عتاب کے تصور میں آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ آپؐ کی اس کیفیت کی تفصیل ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمر کی زبانی تحریر کی ہے۔

جب خطبہ کا موضوع دینیات و اخلاقیات کی تعلیم سے متعلق ہوتا تو آپؐ کا انداز بالکل مختلف ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اشفاق و اخلاق، تسکین و تشفی اور دلجوئی و خوشخوئی کے الفاظ ارشاد فرماتے تھے تاکہ بدترین مخالفین اور دشمنوں کے دل بھی آپؐ کے ارشادات کی قبولیت کیلئے کشادہ ہو جائیں۔

جناب رسالتمآب صلعم کے خطبات جملہ کتب سیرۃ واحادیث میں منقول ہیں ان میں فتح مکہ اور حجۃ الوداع کا آخری خطبہ تاریخ کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ہماری مجبوری ہے کہ صفحات کی کمی کے باعث ہم ان خطبات کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

صبر و شکر : انسانی زندگی دو متضاد جذبات و کیفیات کا مجموعہ ہے۔ خوشی، غم، فکر و استغنا اور تنگی و فراخی حیات انسانی کے لازمات ہیں۔ شادی و غمی کے مسلم اصول سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ انسان کے کمالِ روحانی کا تقاضہ ہے کہ وہ ان جذباتی کیفیتوں میں اپنے آپے سے باہر نہ ہو جائے نہ تو نعمت و مقصد کے حصول پر اترائے اور نہ ہی رنج و بلا کے نازل ہونے پر مضطرب ہو بلکہ ہر دو کیفیات میں صبر و سکوت سے کام لے اور کشادہ دلی سے برداشت کرے اور سمجھ لے انسان کے اختیار میں سعی و عمل کے سوا کچھ نہیں لیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَاسَعیٰ یعنی انسان کے پاس سوائے عمل کے اور کچھ نہیں۔ انسان کے مقاصد میں کامیابی اور ناکامی کسی بالاتر اور قوی تر ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی بابت قرآن کریم میں ارشاد ہے :

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (سورۃ الحدید آیت : ۲۲-۲۳)

ترجمہ : "جتنی مصیبتیں روئے زمین اور خود تم لوگوں پر نازل ہوتی ہیں (وہ سب) قبل اس کے ہم انھیں پیدا کریں کتاب (لوح محفوظ) میں (لکھی ہوئی) ہیں بے شک یہ خدا پر آسان ہے تاکہ جب کوئی چیز تم سے جاتی رہے تو تم اس کا رنج نہ کیا کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترایا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے تمام مقاصد و مطالب میں ایسی کامل ولاجواب کامیابیاں حاصل ہوئیں جو دنیا میں کسی فرد کو نصیب نہیں ہوئیں لیکن اس کے باوجود فخر دو عالم ان پر کبھی بھی فخر و غرور

کا سایہ تک نہیں پڑا۔ آپ کا یہ ارشاد انا سید ولد آدم ولا فخر یعنی میں اولاد آدم کا سردار ہوں لیکن مجھے اس پر فخر نہیں ہے۔ اس حقیقت کی واضح مثال ہے۔ دنیا کے فاتحین ملکی کا یہ دستور ہے کہ جب انھیں کوئی فتح نصیب ہوتی ہے تو فخر و غرور سے ان کا سر اونچا ہو جاتا ہے لیکن خیبر و مکہ کا فاتح اعظیم اپنے مفتوحہ شہر میں اس شان سے داخل ہوتا ہے کہ سر نیاز بارگاہِ رب العزت میں جھکا ہوا ہے اور زبان مبارک پر خدا کی حمد و ثنا ہے۔

روحانیت سے محروم دنیا کی تمام کامیاب ہستیاں اپنی تمام کامیابیوں کو اپنے حسن تدبر اور قوت بازو کا نتیجہ سمجھتی ہیں جبکہ روحانیت کے شناساہوں کے نزدیک یہ سوچ شرک و کفر کے مساوی ہے۔ روحانی اقدار کے عالمین اپنی تمام تر کامیابیوں کو عطا کرنے والا قادر مطلق کو قرار دیتی ہیں جس کے دست عطا کوئی نہیں دیکھتا۔ آنحضرتؐ کے پاس جب کوئی خوشخبری آتی تو آپؐ خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرنے کیلئے آپ فوراً سر بسجود ہو جاتے تھے۔

صبر اور شکر دو متضاد اوصاف ہیں اور جناب رسالتمآبؐ کی ذات ستودہ آیات میں یہ مجتمع ہو گئے تھے اور آپؐ اپنے حسن عمل سے ان دونوں اوصاف کا نمایاں اظہار فرماتے تھے۔ آپکی حیات طیبہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ولادت سے قبل والد ماجد نے رحلت فرمائی بچپن ہی میں مادر گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا کی شفقت ماں باپ کی جگہ کفالت کیلئے معین ہوئی۔ انھوں نے بھی قضا کی دادا کے بعد چچا ابو طالب کفالت کے امین ہوئے۔ جو بعثت نبوت کے بعد قریش کے مظالم و مفاسد کے محافظ رہے۔ انہوں نے بھی انتقال فرمایا۔ مونس و غمگسار شریک حیات ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کو بھی قضائے الٰہی نے آپ سے جدا کر دیا۔ آپؐ کے بچوں نے صغر سنی میں قضا کی۔ باپ کے قلب پر فرقت اولاد کا جو زخم ہوتا ہے وہ عمر بھر اچھا نہیں ہوتا۔ متعدد اولاد میں صرف ایک دختر جناب فاطمۃ الزہرا سلام

اللہ علیہا زندہ رہیں باقی سب نے آپؐ کے سامنے قضا کی۔ فطرت انسانی کے تقاضہ سے ان واقعات پر کبھی کبھی آپؐ کی چشم مبارک نم ہو جاتی تھیں مگر زبان و دل پر ہمیشہ صبر و سکون کی مہر لگی رہتی کبھی کوئی حرف شکایت لب مبارک سے نہ نکلا جو مخالف صبر و شکر ہوتا۔ جب آپؐ کے فرزند جناب ابراہیم نے انتقال کیا تو آپ کی آنکھوں سے اشک جاری ہوئے عبدالرحمٰن بن عوف نے استفسار کیا یا نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ رحمت و شفقت ہے عبدالرحمٰن نے دوبارہ عرض کی۔ جواب میں ارشاد فرمایا ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الاما یرضی ربنا وانا بفراقك یاابراهیم المحزونون۔ آنکھ اشک ریز ہے دل غمگین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کی مرضی ہو اے ابراہیم ہم تمہارے فراق میں بہت غمگین ہیں۔

اکثر واقعات وقتی ہوتے ہیں جن کا اثر انسان پر ایک خاص مدت تک رہتا ہے لیکن کچھ واقعات مسلسل ہوتے ہیں ان نہ ختم ہونے والے مصائب کو اس طرح برداشت کرنا کہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے انتہائی دشوار ہے۔ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں مشرکین نے دعوت اسلام اور خود خیر الانام کے ساتھ جو ظلم و زیادتیاں کیں وہ تاریخ کا حصہ ہیں حتیٰ کہ ہجرت پر مجبور کر دیا پھر مدینہ میں آٹھ یا نو سال دشمنوں کے قتل و خونریزی کے اندیشے ایسے مصائب تھے جن پر رسالتمآبؐ نے صبر و سکون سے کام لیا الغرض جناب ختمی مرتبت نے اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن ہر ایک کی تکلیف دہی و ایذا رسانی کے ہر ہر موقع پر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور ہر حال میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتے رہے۔

اخلاق نبوی : اخلاق وہ صفت ہے جو فطرت صالحہ رسالت کا جزو اعظم قرار دے گئی ہے اس صفت میں حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات اقدس جملہ انبیاء و مرسلین میں خاص امتیاز رکھتی تھی۔

ابوداؤد میں منقول ہے کہ حضرت عائشہؓ سے آنحضرتؐ کے اخلاق

کی بابت دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ان خلق رسول اللہ صلعم کان القرآن یعنی آپ کا اخلاق ہم تن قرآن تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے تحریر کیا ہے کہ : جب حضرت امام حسین علیہ السلام سے رسالتمآبؐ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا گیا تو آپ نے اپنے پدر بزرگوار حضرت علیؑ جو آنحضرتؐ کے تربیت یافتہ اور آغاز نبوت سے آخر عمر تک تقریباً تیس برس آپ کی خدمت اقدس میں رہے' کے حوالے سے بیان کیا کہ آپؐ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے۔ سخت مزاج اور تنگ دل نہیں تھے۔ بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی برا کلمہ منہ سے نہیں نکالتے تھے۔ عیب جو اور تنگ گیر نہیں تھے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو آپ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے کوئی آپ سے امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور منظوری ظاہر فرماتے تھے (یعنی صراحتاً انکار و تردید نہیں فرماتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے) اور مزاج شناس آپ کے تیور سے آپ کا مقصد سمجھ لیتے تھے۔ نفس سے تین چیزیں آپ نے بالکل دور کر دی تھیں۔ بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا۔ جب آپ کلام کرتے صحابہ اس طرح خموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا انکے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں جب آپ چپ ہو جاتے تو وہ پھر آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپ بھی مسکرا دیتے تھے۔ جن پر لوگ تعجب کرتے آپ بھی کرتے۔ کوئی باہر کا آدمی اگر بیباکی سے گفتگو کرتا تو آپ تحمل فرماتے۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اگر کوئی آپکے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ اسکی بات درمیان سے نہیں کاٹتے

تھے۔ نہایت فیاض تھے نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے اگر کوئی دفعتہً آپ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے آشنا ہو تا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔ (سیرۃ النبی جلد دوئم حوالہ اسوۂ رسول ص: ۸۰ ج: ۲)

حسن اخلاق کی تعلیم کا پہلا سبق یہ ہے کہ جس اخلاقی عمل کو اختیار کیا جائے اس میں عملی مداومت پیدا کی جائے اور اس استحکام، شدت اور استقلال کے ساتھ کہ وہ عمل اس کی طبعیت ثانیہ معلوم ہونے لگے۔ عادات کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مخلوقات کی فطرت کا لازمیہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو مخصوص طرز عمل کا عامل بنایا گیا ہے مثلاً نباتات میں ہر پھول ایک خاص خوشبو دیتا ہے اس کا یہی طرز عمل ہے اسی طرح ایک ترکاری دوسری سبزی کا ذائقہ نہیں دے سکتی۔ حیوانات اپنے نوعی افعال واخلاق میں بالکل محدود ہیں۔ باربرداری کا گھوڑا جنگی صفوں میں کام نہیں دے سکتا۔ خچر اونٹ کی طرح بار نہیں اٹھا سکتا۔ بیل کی طرح گدھوں سے ہل نہیں چلائے جاسکتے اعلیٰ ہذا القیاس جملہ مخلوقات اپنے اپنے مخصوص طرز عمل پر عامل ہے لیکن اسکے برخلاف انسان کو جملہ اقسام عملیہ کے استعمال پر قادر اور وہ ہر قسم کے طرز عمل کا مختار بنایا گیا ہے۔ لیکن انسان باوجود اپنی خود مختاری اور آزادی کے اپنے اعمال وافعال میں ہمیشہ حسن اخلاق کا پہلو اختیار کرے اور اس پر استقرار سے عمل کرے۔ اپنے اس طرز عمل میں ایسا مسلسل وغیر منقطع طریقہ پیدا کرے کہ وہ فطرتاً اس طرز عمل کی تعمیل پر مجبور سمجھا جائے۔ اور اس کا یہ طرز عمل اس اہمیت اور شدت کیساتھ ہو کہ ہر شخص یہ سمجھے کہ اس طرز عمل کے سواء اس سے دوسرا ممکن ہی نہیں۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقیات میں مداومت فی العملیات کی یہی شان نظر آتی ہے۔ حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ والہ ۔ جس کام کو جس طریقہ سے شروع فرمایا آخر وقت تک اس میں نہایت شدت کیساتھ مداومت قائم رکھی گئی یعنی ہمیشہ جاری رکھا گیا۔

حُسنِ خلق : جناب رسالتمآب کا ہمیشہ سے یہ معمول تھا کہ کسی سے ملتے وقت آپ خود سلام اور مصافحہ فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص کان میں سرگوشی کرتا تو آپ اس وقت تک اپنا کان نہ ہٹاتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے۔ یہی حال مصافحہ کرنے کا بھی تھا یعنی آپ مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک کہ وہ خود آپ کا ہاتھ نہ چھوڑ دے۔

اکثر لوگ آپ کی خدمت اقدس میں پانی لاتے کہ آپ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ وہ تبرک ہو جائے اگرچہ سخت جاڑے کے دن ہوتے اور سخت سردی ہوتی مگر آپ کبھی انکار نہ فرماتے، ہمیشہ بلا تامل پانی میں ہاتھ ڈال دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے کچھ لوگ آئے تو آپ نے انہیں اپنے ہاں مہمان رکھا اور مہمان داری کے تمام فرائض خود بنفس نفیس انجام دیئے۔ صحابہ نے عرض کی کہ یہ خدمت ہم انجام دیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے اس لئے ان کی خدمت گذاری میں خود کروں گا۔

ایک دن ابو شیعب انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ چند مسلمانوں کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ ابو شیعب نے دیکھا کہ آپ کے چہرے سے بھوک کے تاثرات نمایاں ہیں وہ واپس گئے اور اپنے ایک غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو وہ خدمت رسول میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اپنے اصحاب کے ہمراہ قدم رنجاں فرمائیں یہ کل پانچ افراد تھے لیکن راستہ میں ایک اور شخص ان کیساتھ ہو لیا۔ جناب رسالتمآبؐ نے ابو شیعب سے کہا کہ یہ شخص بغیر کے ساتھ ہو لیا ہے اگر تم اجازت دو تو اسے ساتھ رکھیں ورنہ رخصت کر دیں۔ انہوں نے کہا آپ انھیں بھی ساتھ رہنے دیں۔

انس بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نہ تو گالی دیتے تھے، نہ فحش بات فرماتے تھے اور نہ لعنت کرتے تھے، ہم میں سے کسی سے ناخوش ہوتے تو فرماتے کہ "اسے کیا ہوا" یا "اس کی پیشانی خاک آلود ہو"۔[۱]

حسن معاملگی کا یہ عالم تھا کہ نبوت سے قبل جن لوگوں سے آپ کے تاجرانہ تعلقات تھے انہوں نے ہمیشہ آپ کی دیانت اور حسن معاملگی کا اعتراف کیا ہے آپؐ کی اسی خوبی کے باعث تمام قریش آپ کو امین کہتے تھے اور بعثت نبوت کے بعد اگرچہ قریش کے دل آپؐ کے بغض وکینہ سے لبریز تھے لیکن پھر بھی وہ اپنی دولت کیلئے مامون ومحفوظ مقام آپ ہی کے کاشانہ کو سمجھتے تھے۔

بعثت نبوت کے بعد کثیر عطا اور جود وسخا کے باعث آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے اور چونکہ مدینہ میں یہودی ہی دولت مند تھے لہٰذا آپ انہیں سے قرض لیتے تھے اور تاخیر کی صورت میں ان سخت گیر وبد مزاج یہودیوں کی بد زبانیوں اور بد مزاجیوں کو برداشت فرماتے تھے۔

آپ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے دریافت فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ صاحب میت مقروض ہے تو صحابہ سے کہتے کہ تم جنازہ کی نماز پڑھادو۔ آپؐ خود شریک نہ ہوتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے خیر آنے دو۔ جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو آپ نے نہایت نرمی کیساتھ اس سے گفتگو فرمائی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بد زبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔

حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی رسول تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے انکو بلوایا وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے، آپ اس

[۱] طبقات ابن سعد ص: ۱۷۱ ج: ۲

وقت لیٹے ہوئے تھے۔ ابوذر کو دیکھ کر کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا۔ جب واپس کیا تو اس سے تیز اونٹ واپس کیا اور فرمایا "سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کریں۔"

الغرض اسی طرح کے بے شمار واقعات کتب حدیث وسیرت میں مرقوم ہیں جن سے آپؐ کے حسن خلق کا پتہ چلتا ہے۔ حتیٰ کہ سنگدل اور دشمن اسلام یہودیوں کیساتھ بھی رحمت عالمؐ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے تھے۔

عدل وانصاف : جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلقات ہر طبقے کے اعلیٰ وادنیٰ سے تھے اور آپ کو عرب کے تمام جنگجو اور ناقابل اطمینان قوم وقبائل کے معاملات میں اپنے احکام صادر فرمانا ہوتے تھے۔ آپ ان کے امور میں کمال انصاف وعدالت سے ایسے فیصلے فرماتے تھے کہ کسی کو لب کشائی کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ آپ کے عدل وانصاف سے متعلق کتب میں بیان کردہ واقعات میں چند بطور نمونہ پیش ہیں۔

ایک دفعہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کی عزت کی خاطر لوگ چاہتے تھے کہ اسکو سزا نہ ملے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے لہٰذا وہ حضرت اسامہؓ بن زید کے پاس گئے اور ان سے سفارش کرنے کو کہا۔ حضرت اسامہؓ نے آنحضرتؐ سے معافی کی درخواست کی جناب رسالتمآبؐ نے غضب آلود ہو کر فرمایا "بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر حد جاری کرتے اور امرا سے درگذر کرتے تھے"۔

صلح ہونے کے بعد خیبر کے یہودیوں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی۔ ایک دفعہ عبداللہ بن سہل کھجوروں کی بٹائی کے لئے اپنے چچازاد بھائی محیصہ کے ہمراہ خیبر گئے تو کسی نے ان کو قتل کر دیا اور لاش کو ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ محیصہ نے آکر رسول اللہ صلعم کے پاس استغاثہ کیا۔ جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا "تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا"۔

انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا' یہود سے حلف لیا جائے"۔ آنحضرت نے فرمایا "یہودیوں کی قسم کا کیا اعتبار' وہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھالیں گے"۔ آپ اس امر سے بھی واقف تھے کہ خیبر میں یہود کے سوا کوئی دوسری قوم آباد نہیں تھی لہٰذا یہ یقینی تھا کہ عبداللہ بن سہل کو یہودیوں ہی نے قتل کیا تاہم عینی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے رسول نے یہودیوں سے تعرض نہیں فرمایا اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوادیئے۔

جناب رسالتمآبؐ اپنے ذاتی معاملات میں بھی عدالت کا وہی معیار رکھتے تھے جو دوسروں کیلئے قائم تھا۔ ایک مرتبہ آپ مال غنیمت تقسیم فرمارہے تھے لوگوں کا ہجوم گرد و پیش تھا کہ ایک شخص منہ کے بل آپؐ پر گر گیا۔ آپؐ کے دست مبارک میں ایک لکڑی تھی آپ نے اس سے اس شخص کو ہٹایا۔ اتفاق سے لکڑی کا سرا اسکے منہ پر لگ گیا اور اس کو خراش آگئی۔ عدل مجسم رحمت عالم نے فرمایا "مجھ سے انتقام لے لو" اس شخص نے عرض کی "یارسول اللہ صلعم میں نے آپ کو معاف کیا"۔

جود و سخا: بخشش و سخاوت جناب رسالتمآبؐ کی عین فطرت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال پہ نہیں کا لفظ زبان مبارک پر نہیں آیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے انما انا قاسم و خازن واللہ یعطی (بخاری) یعنی میں تو صرف تقسیم کرنے والا اور خزانہ دار ہوں' دینے والا اللہ ہے۔

مساوات: عدل رسالت اور انصاف نبوت کا اصل مدعا یہی تھا کہ امیر و غریب اور غلام و آقا سب مساوی قرار دیئے جائیں۔ اسی لئے صہیبؓ و بلالؓ جو اسلام سے پہلے قریش کے غلام تھے' اسلام کے بعد شرفائے مہاجرین و انصار کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے اور بے تکلفانہ رُو بہ رُو گفتگو کرتے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ ایک دفعہ بلالؓ و سلمانؓ بیٹھے تھے اتفاق سے

ابو سفیان وہاں سے گذرے۔ ان لوگوں نے کہا کہ "ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے"۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان لوگوں سے کہا سردار قریش کی شان میں یہ الفاظ۔ پھر آپ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا آپ نے ارشاد فرمایا "کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا۔ ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا"۔ حضرت ابو بکرؓ نے واپس جاکر ان بزرگوں سے کہا بھائیو "آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں" ان لوگوں نے کہا "نہیں' خدا تم کو معاف کرے"۔

جناب رسالتمآبؐ جس مجلس میں بھی تشریف لیجاتے پائیں مجلس میں بیٹھتے تھے اور لوگوں کو بھی ہمیشہ تاکید فرماتے کہ مجلس میں بالا نشینی کی تلاش و جستجو نہ کریں۔ جناب رسول خداؐ مجلس کے تمام لوگوں پر ایسی مساویانہ نوازش فرماتے تھے کہ ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ آپ کے سب سے زیادہ قریب تر ہے۔

عزم و استقلال: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کبار کے عزم و استقلال کی قرآن میں مدح فرمائی ہے چونکہ رسالتمآب خاتم الرسول ہیں لہٰذا خداوند عالم نے آپ میں یہ وصف بدرجہ اولیٰ ودیعت فرمایا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک آپ کی تمام تبلیغی خدمات اور تعلیمی ارشادات و ہدایات آپ کے عزم و استقلال کے تفصیلی دفتر ہیں۔ جب کفرستان عرب میں آپ نے یکہ و تنہا دعوت حق کی صدا بلند کی تو پورا عرب آپ کا مخالف ہو گیا لیکن وقار نبوت اور عزم رسالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قیام مکہ کی بارہ سالہ مدت میں آپ کو مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن کبھی خوف و ہراس پاس نہ آیا اور بالآخر جناب رسالتمآبؐ کی وہی تنہا ذات جب دنیا سے مفارقت کرنے والی تھی تو آپ کے جانثاروں اور فدائیوں کی کثیر جماعت موجود تھی۔

جانشینی رسولؐ

یہ امر قابل غور ہے کہ سب مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ایک ہے۔ یعنی ہر مسلمان اللہ تعلیٰ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہے۔ اسی طرح سب مسلمان اس پر بھی متفق ہیں کہ جنت حق ہے' جہنم حق ہے۔ ان کا اس پر بھی یقین ہے کہ یوم حشر اللہ تعالیٰ اعمال کے حساب کتاب کیلئے سب مُردوں کو زندہ کرے گا۔ سب مسلمانوں کا قرآن حکیم پر ایمان ہے' حضرت محمد بن عبداللہ خاتم الانبیاءؐ پر ایمان ہے۔ الغرض سب مسلمانوں کا دین ایک ہے' قبلہ ایک ہے' رسول ایک ہے اور کتاب ایک ہے۔ لیکن پھر بھی ملت اسلامیہ باہمی چپقلش و انتشار کا شکار ہے اور مختلف نظریات و عقائد کے باعث گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر گروہ نے اپنے اپنے نظریہ کے مطابق ان عقائد کا مفہوم نکالا جس کے باعث تفرقہ پیدا ہو گیا اور ہر گروہ اپنے اپنے عقیدہ کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے کوئی بھی معقولیت کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ عقائد مختلف کلامی' فقہی اور سیاسی مکاتب فکر کی جولان گاہ بن گئے۔ ہر اختلاف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا خواہ وہ فقہ کے بارے میں ہو' قرآن کی تفسیر کے بارے میں ہو یا سنت نبوی کو سمجھنے کے بارے میں ہو اس کا منشا اور سبب ایک ہی ہے اور وہ ہے مسئلہ خلافت و نیابت۔ یہ مسئلہ خلافت و جانشینی رسول ہی ہے جس کے باعث ملت انتشار کا شکار ہوئی اور دین نحیف و ناتواں ہو گیا۔

عقائد جانشینی: اہلسنت کا مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی حیات میں کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا لہٰذا آپ کی وفات ہوتے ہی اہل حل و عقد نے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ رسول چن لیا۔ جب کہ اہل تشیع کا واضح عقیدہ ہے کہ رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین' وصی و خلیفہ مقرر فرمایا اور مختلف موقعوں پر اس کی تصریح بھی کردی تھی جن میں سب سے مشہور و معروف اعلان غدیر خم ہے۔

مورخین اہلسنت اپنے عقیدہ کی بڑے شد و مد سے تبلیغ کرتے رہتے ہیں لیکن یہی مورخین جب آغاز اسلام سے وفات پیغمبرؐ تک کی تاریخ رقم کرتے ہیں تو دعوت ذوالعشیرہ سے لے کر اعلان غدیر خم کے دوران رسول مقبولؐ کے ان ارشادات کو بھی قلمبند کرتے ہیں جو آپ نے اپنے خلیفہ' وصی و جانشین کے تقرر کی بابت فرمائے تھے۔ جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

امام و خلیفہ: امامت کے لفظی معنی پیشوائی کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد خلافت ہے یعنی پیغمبر خدا صلعم کی قائم مقامی و جانشینی اور امت کے معاملات دنیا و دین میں اولیٰ بہ تصرف (کام کرنیکا سب سے بہتر واسطہ) اور صاحب اختیار ہونا۔ اسی کو امارت (حکومت) عامہ کہتے ہیں۔ لیکن پیغمبر خدا کی جانشینی کی شرط کے باعث اس سے مراد وہ حکومت عامہ ہے جو ان نوامیس الٰہی (احکام الٰہی) کے موافق ہو جن پر نبی مبعوث ہوا ہے۔ اگر اس کے خلاف ہو تو وہ بادشاہت ہو گی خلافت ہرگز نہ ہو گی۔

حنفی فقہ کے مشہور فقیہہ ابو بکر الجصّاص (م: ۹۸۰ء) سورۃ البقرہ کی آیت: ۱۲۴ کی تشریح سے قبل تحریر کرتے ہیں کہ اگرچہ لغت میں امام سے مراد وہ شخص ہے جس کی پیروی کی جائے خواہ حق میں ہو یا باطل میں' لیکن اس آیت میں امام سے مراد صرف وہ شخص ہے جو اتباع کا مستحق ہو اور اس کی پیروی لازم ہو۔ اس اعتبار سے امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر انبیاء ہیں'

پھر راست رو خلفاء' پھر علماء اور قاضی یا ایسا عہدیدار ہو جس کی بات کا ماننا امورِ دین میں لازم ہو۔ اس آیت کی دلالت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا' اور اگر وہ اپنے آپ کو اس منصب پر مسلط کر دیے تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں۔[1]

غرض تعین امام: امام کے تعین کی اغراض بھی وہی ہیں جو اغراض بعثت انبیاء کے لئے ضروری ہیں کیونکہ امامت ایک رکن اعظم نبوت کا ہے جس طرح نبوت رکن اعظم وحدانیت کا ہے۔ یعنی جس طرح وحدانیتِ خدا اور اس کے احکام کی معرفت کے بغیر بعثت انبیاء ممکن نہیں اسی طرح کارِ رسالت کی عملاً انجام دہی تعین امام کے بغیر ناقص و ناتمام ہے۔ رتبہ کے لحاظ سے امامت کو نبوت سے وہی نسبت ہے جو ولایت عہد کو بادشاہت سے ہوتی ہے۔ نبی حامل نوامیس شریعت (احکام الٰہی) ہوتا ہے اور امام بعد از نبی ان نوامیس کا عملاً کارپرداز ہوتا ہے۔ امام کی ضرورت حیات پیغمبر میں بھی حیثیت وزارت ہوتی ہے اور بعد وفاتِ پیغمبر تو امام کے بغیر کوئی چارہ نہیں تاکہ نوع بشری کی اصلاح و تکمیل کے امور منقطع نہ ہو جائیں اور دنیا و دین کے معاملات معطل نہ رہیں بلکہ حسب منشاء خدا اور سول پورے ہوتے رہیں۔

پس جو حاجت بندگان خدا کو بعثت انبیاء کی تھی یعنی دنیا و آخرت کے امور کی اصلاح اور نفس کی تکمیل' وہی حاجت بعد وفات پیغمبر بھی باقی ہے جسکا پورا کرنا عقلاً خدا پر واجب ہے لہٰذا امام کا تعین خدا پر اپنی مصلحت کے موافق واجب ہے تاکہ بعد وفات پیغمبر ہدایت و اصلاح خلق کا سلسلہ بر قرار رہے۔ اگر خدا نے ایسا نہ کیا اور بندوں کی رائے پر اس معاملہ کو چھوڑ دیا تو غرض بعثت انبیاء ناتمام رہی اور خدا سے امر واجب کا ترک عمل میں آیا مگر یہ امر خدا کی ذات پر محال ہے یعنی خدا کبھی امر واجب کو ترک نہیں کرتا۔ لہٰذا ثابت ہوا

[1] احکام القرآن ص: ۷۹–۸۰ مطبوعہ مصر حوالہ خلافت و ملوکیت ص: ۳۹

کہ خداوند تعالیٰ پر امام کا تعین واجب ہے۔

تعین امام: چونکہ خدا کی طرف سے امام کا تعین واجب ہے لہٰذا حکم الٰہی کے مطابق رسول خدا پر بھی امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ رسول اپنی حیات میں کارِ رسالت کے اجراء کیلئے اور وفات کے بعد حفاظتِ شریعت کے لئے اپنا جانشین مقرر کرے اور اس امر کو اختلاف رائے و باہمی نزاع کے لئے امت کے اختیار میں نہ چھوڑ جائے جس کے باعث کارِ شریعت معطل و مجہول اور غرض بعثت ناقص و ناتمام رہے۔ چنانچہ سیرت و عادات انبیاء اسی طرح جاری رہی ہے کہ انھوں نے اپنی حیات میں کارِ رسالت کو پورا کرنے کے لئے اپنے اپنے جانشین متعین کئے۔

پیغمبر آخر الزماں کے واسطے امام کا تعین خاص طور پر ضروری تھا۔ کیونکہ آپؐ تمام خلق پر روزِ قیامت تک کیلئے مبعوث ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے آسمانی کتاب اور مستحکم شریعت لائے تھے۔ فرائض وراثت' قضایا' معاملات' احکام فقہ اور آداب و دیگر تمام امور جو اخلاقی' خاندانی و تمدنی ضروریات کے متعلق تھے وحی خدا کے بموجب معین فرما چکے تھے۔ پھر مدت بعثت آنحضرت کی بہت کم تھی یعنی ان احکام کی پورے طور پر نفاذ و تعلیم آنحضرتؐ کی حیات میں دشوار تھی۔ کیونکہ ایک طرف تو جہاد و اشاعت دین میں آپؐ کی مشغولیت اور دوسری طرف مخالفین و منافقین کی کثرت۔ پس ایسی حالت میں خدا اور سول دونوں پر واجب تھا کہ امر ہدایت و تعلیم دین کی تکمیل کے لئے کسی شخص کو محافظ ملت و شریعت اور نگہبان کتاب و سنت نامزد کرتے۔ خصوصاً ایسی کتاب جس کے بہت سے آیات مجمل و مشکل ہیں اس کو امت میں اس حالت پر نہ چھوڑ جاتے کہ ہنوز اس کی ترتیب بھی نہ ہوئی تھی اور ہر شخص اپنے مطلب کے موافق اس میں معنی لگانے کیلئے تیار تھا۔ پھر یہ کہ خود رسول اللہ کی احادیث بے ترتیبی کی حالت

میں تھیں۔ الغرض ان تمام امور کو مسلمانوں کے بھروسہ پر چھوڑ کر جانا خدا کے اس لطف و مہربانی کے خلاف تھا جو اس کو عموماً اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ نیز پیغمبر خدا کی اس شفقت و مہربانی کے بھی خلاف تھا جو کہ آپ کارِ امت میں انواع و اقسام کی ایذ و تکلیف اٹھا کر ظاہر فرما چکے تھے۔ پس یہ کسی طرح سے بھی ممکن نہ تھا کہ آپؐ اپنے بعد کارِ امت کو بلا تعین خلیفہ معطل و مجہول چھوڑ جاتے اور وصی کے وجوب سے غافل رہتے۔ حالانکہ ایک معمولی عقل کا آدمی اگر اپنی جائیداد و معاملات کا انتظام اپنے بعد کیلئے نہ کرے تو عقلاً و عملاً مورد اعتراض و الزام ہوتا ہے اور بعد میں پیدا ہونے والے تنازعات کا سبب قرار پاتا ہے چہ جائیکہ پیغمبر خدا سا حاکم و عاقل' صاحبِ ناموس و شریعت یہ قبیح فعل اپنے واسطے کیونکر گوارا کر سکتا تھا جبکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ زمانہ حیات میں آپ کو جب کبھی سفر کا اتفاق ہوا تو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا پھر یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ سفر آخرت اختیار کرتے وقت آپؐ ایسے امر واجبی کو ترک فرماتے۔

لہٰذا تمام شواہد حالات و واقعات تاریخ اور استدلالات عقلی و نقلی پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کا تقرر منجانب رسولؐ ان کی حیات میں پیغمبر پر واجب ہے اور اس وجوب کو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ترک کرنا محال تھا لہٰذا آپؐ نے اس کو ہرگز گوارا نہیں فرمایا اور ضرور بہ ضرور اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کیا۔

سنتِ انبیاء: حضرت آدمؑ سے حضرت خاتمؐ تک کوئی ایک نبی بھی ایسا نہیں جسے لوگوں نے انتخاب کے ذریعہ مقرر کیا ہو اور کوئی جانشین نبی ایسا نہیں ہوا جو اجماع یا شوریٰ سے چنا گیا ہو۔ ذیل میں ہم مورخین کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ تا حضرت خاتمؐ جتنے بھی مشاہیر انبیاء اور رسول گذرے ہیں انہوں نے اپنے وصی

و جانشین کا تقرر خود فرمایا ہے۔ حضرت آدمؑ کے وصی مقرر کرنے کی بابت علامہ ابن جریر طبری تحریر فرماتے ہیں:

> "ان ادم علیہ السّلام مرض قبل موتہ احد عشر یوماً واوصی الیٰ ابنہ وکتب وصیۃ ثم رفع کتاب وصیۃ الیٰ شیث"
>
> ترجمہ: حضرت آدمؑ موت سے پہلے گیارہ دن بیمار رہے اور اپنے فرزند شیث کو وصی مقرر کیا اور اس نامہ کو لکھ کر حضرت شیث کے حوالے کیا۔"
>
> (الطبری ص: ۷۶ ج: ۱)

جناب شیث کی بابت طبری کا بیان ہے:

> "اسی طرح جناب شیث نے اپنے بیٹے انوش کو اور انوش نے اپنے بیٹے قینان کو اور قینان نے مہلائیل کو اور مہلائیل نے اپنے بیٹے یارد کو اور اس نے اپنے فرزند ادریس کو وصی مقرر کیا اور ادریس نے متوشلخ اور متوشلخ نے اپنے بیٹے لمک کو اپنا وصی و خلیفہ اور جانشین مقرر کیا جو حضرت نوح علیہ السلام کے والد بزرگوار تھے"۔
>
> (الطبری ص: ۸۷ ج: ۱' تاریخ الکامل ص: ۲۰ ج: ۱)

حضرت نوحؑ نے اپنا وصی مقرر کیا:

> "جب حضرت نوح علیہ السلام کا وقت وفات قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سام کو وصی قرار دیا"۔
>
> (الکامل ص: ۲۶ ج: ۱' روضۃ الصفا ص: ۳۰ ج: ۱)

حضرت ابراہیمؑ کا وصی مقرر کرنا:

> "اسکے بعد یہی سلسلہ چلتا ہوا حضرت ابراہیمؑ تک پہنچا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسحاق اور اسحاق نے یعقوب اور جناب یعقوب نے اپنے بیٹے یوسفؑ کو وصی و خلیفہ مقرر فرمایا۔ بعد ازاں جناب یوسف علیہ السلام نے جس روز انتقال کیا انہوں نے اپنے بھائی یہودا کو وصی بنایا"۔ (الطبری ص: ۱۷۲ ج: ۱' روضۃ الصفا ص: ۶۳ ج: ۱)

حضرت ایوب کا اپنا جانشین مقرر کرنا۔

"حضرت ایوبؑ کی عمر تیرانوے سال کی ہوئی اور اپنی موت کے وقت انھوں نے اپنے بیٹے حویل کو اپنا جانشین مقرر کیا اور انکے بعد ان کا بیٹا عبد انکی وصیت کے مطابق خلیفہ ہوا"۔ (الطبری ص: ۱۹۸ ج: ۱)

حضرت موسیٰ کا وصی مقرر کرنا

"حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنا جانشین خود مقرر کیا۔ اول حضرت ہارون کو اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو پھر یوشع بن نون کو وصی بنایا"۔ (الطبری ص: ۲۲۵ ج: ۱)

جناب یوشع بن نون کا خلیفہ مقرر کرنا:

"خداوند عالم کی اس سنت پر عمل کرتے ہوئے حضرت یوشع بن نون نے کالب بن یوحنا اور انھوں نے اپنے فرزند یوساموسس کو خلیفہ بنایا"۔ (الکامل ص: ۷۰ ج: ۱، روضۃ الصفا ص: ۱۳۵ ج: ۱)

جناب الیاس پیغمبر اور ان کے بعد الیسع اور جناب شعیا وغیرہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ

"وتوفی قبل ان یستتم بنائه واوصیٰ الیٰ سلیمان"

ترجمہ: "حضرت داؤدؑ نے اپنی عمارت مکمل کرنے سے قبل ہی انتقال کیا اور خلافت کی وصیت اپنے بیٹے سلیمان کی طرف کی۔

حضرت عیسیٰؑ کا وصی مقرر کرنا:

ترجمہ: "حضرت عیسیٰؑ کے وصایا میں سے ایک وصیت یہ بھی تھی کہ خداوند عالم نے انھیں شمعون کو وصی مقرر کرنیکا حکم دیا۔ اور حواریوں نے شمعون کی خلافت کو قبول کیا"۔ (روضۃ الصفا ص: ۱۸۴ ج: ۱)

علامہ مسعودی نے انبیاء علیہم السلام کے اوصیاء کے تقرر کی بابت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اپنے کلام کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ

"فکانت الوصیة جاریة منتقلة من قرن الیٰ قرن الیٰ ان ادی الله النور الیٰ عبدالمطلب وولده عبدالله الیٰ رسول الله صلی الله علیه و اله وسلم"۔ (مروج الذہب ص: ۳۹ ج: ۱)

ترجمہ: "پس یہ وصیت ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ تک منتقل ہوتی رہی یہانتک کہ خداوند عالم نے اس نور کو صلب عبدالمطلب میں اور حضرت عبداللہ والد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ودیعت کیا"۔

مورخین و محدثین کے بیانات سے بالکل واضح ہو گیا کہ حضرت [...] سے حضرت خاتمؐ تک کسی ایک موقع پر بھی نبی کے جانشین کا انتخاب [...] وں کے سپرد نہیں کیا گیا۔ بلکہ خداوند عالم نے اپنے خاص اہتمام سے اس امر کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان انبیاء میں ایسے نبی بھی تھے جنہیں حکومت حاصل نہیں تھی اور ایسے بھی تھے جو صاحب حکومت واقتدار [...]۔ یہ قائدہ بلا استثناء جاری رہا۔ ہر نبی وہر رسول اپنا جانشین حکم خدا [...] مقرر کرتا چلا آیا یہی سنت الٰہیہ رہی ہے اور اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی [...] کہ ارشاد باری ہے۔ "لَنْ تجد لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلاً" پھر یہ کیونکر ممکن [...] کہ رسالتمآبؐ اپنی امت کو بغیر کسی سرپرست کے چھوڑدیں خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ رسالتمآب کو خود اپنی امت میں تفرقہ کا اندیشہ تھا۔[1] اور یہ ڈر تھا کہ کہیں لوگ الٹے پاؤں نہ پھر جائیں۔[2] [...] کے حصول میں ایک دوسرے پر بازی لیجانے کی کوشش نہ کرنے [...]۔[3] ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگیں۔ اور یہود ونصاریٰ کے [...] طریق کی پیروی نہ کرنے لگیں۔[4]

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ بن خطاب زخمی ہوئے تو ام المومنین حضرت عائشہ نے آدمی بھیج کر انھیں کہلوایا تھا کہ "اپنے بعد امت محمدیہ کا کوئی خلیفہ مقرر کر دیجئے اور اسے اپنے بعد بے یار ومددگار نہ چھوڑیئے کیونکہ مجھے فتنے کا اندیشہ ہے"۔[5] اسی طرح کا مشورہ جناب

---

[1] مسند احمد بن حنبل ص: ۳۳۲ ج: ۲، [2] صحیح بخاری ص: ۹۰۲ ج: ۷، [3] ایضاً ص: ۹۳ [...]، [4] ایضاً ص: ۱۴۴ ج: ۴، [5] الامامۃ والسیاسۃ ص: ۲۸ ج: ۱

عبداللہ بن عمر بن خطاب نے اپنے والد کو دیا تھا۔ پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ رسالتمآب کو اس مصلحت کا علم نہیں تھا جس سے حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر کو تھا اور دیگر سب بھی لوگ آگاہ تھے۔

شرائط و صفاتِ امام: جب امام کا تعین منجانب اللہ اور منجانب رسول اللہ ثابت ہو گیا تو لازم ہے کہ خلیفۂ رسول ان سب صفات وشرائط سے آراستہ ہو جو پیغمبر کے واسطے لازم ہیں ماسوائے درجۂ نبوت کے جو امام کیلئے عقلاً مناسب نہیں ہے کیوں کہ امام تو شریعت جاری کرنے والے پیغمبر کا کارندہ ہوتا ہے لہٰذا اس کے لئے درجہ نبوت درکار نہیں بقیہ تمام صفات نبوت اگر اس میں نہ ہوں تو تجویز خدا ورسول پر اعتراض فعل قبیح لازم آئیگا جو محال ہے۔ امام کی صفات وشرائط کی تصریح حسب ذیل ہے:

اول: یہ کہ منصوص (حکم صریح دیا گیا) منجانب خدا ورسول ہونا چاہئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا یعنی حکم صریح معین کیا جائے۔

دوسرے: یہ کہ اس کے اختیار واضح طور پر بیان کر کے اس کا درجہ ورتبہ ظاہر کیا جائے۔

تیسرے: یہ کہ معصوم ہو ورنہ احکام شرع وخلاف شرع کو مخلوط کر کے نوامیس (شریعت) الٰہی کو ابتر کر دیگا بلکہ ہوائے نفسانی کے سبب پابندی شریعت میں دشواری ہو گی اور کار ہدایت بے ثمر و بے اثر رہے گا اور چونکہ عصمت ایک امر باطنی ہے جس کو سوائے علام الغیوب کے دوسرا نہیں جان سکتا لہٰذا وہی اپنی تجویز سے ایسا شخص مقرر کر سکتا ہے۔

چوتھے: یہ کہ عملاً وعلماً افضل اہل زمانہ ہو ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور خدا ورسول کی تجویز پر الزام جہل وقبح عائد ہو گا چنانچہ اسی سے متعلق آیہ قرآنی میں خداوند تعالیٰ نے ایک عقلی دلیل بیان فرمادی۔

"اَفَمَنْ يَهْدِیْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّیْ اِلَّآ اَنْ

يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○

ترجمہ: "آیا وہ شخص جو راہ راست بتائے وہ سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ شخص جو کہ راہ راست نہ بتا سکے بلکہ وہ خود محتاج راہ راست بتائے جانے کا ہو تم کو کیا ہو گیا ہے کیسا حکم لگاتے ہو"۔

پانچویں: یہ کہ نسبی وحسبی اخلاقی اور جسمانی عیوب سے پاک ہو اسی دلیل کی بنا پر جو نبوت کے شرائط میں بیان کئے گئے۔

چھٹے: یہ صاحب معجزات وکرامات ہو تا کہ اپنا تقرر منجانب اللہ ثابت کر سکے اور منجانب رسول یہ ظاہر کر سکے کہ علوم نبوت اور کمالات بشری کو نفس رسول سے ایسا جذب کیا ہے کہ خلافت روحانی وجسمانی کا مستحق قرار دیا گیا۔

اطاعتِ امام: امام وقت کی اطاعت بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح نبی کی اطاعت واجب ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اَطِيْعُوا اللهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

"ترجمہ: یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔ (سورہ النساء آیت: ۵۹)

لفظ اطاعت اس آیت میں عام ہے لہٰذا معاملات دنیا ودین دونوں میں شامل ہے اس آیت میں ایمان داروں کیلئے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے اول اطاعت خدا جو کہ جملہ امور معاش ومعاد میں شامل ہے۔ اور اللہ کے مقررہ قواعد کے مطابق اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ دوسری اطاعت رسول کی ہے جو ہر لمحہ اور ہر حال میں لازم ہے کیونکہ رسول احکام شریعت کے مطابق بندوں کو علم وعمل پر آمادہ کرتا ہے اور قانون الٰہی کے امر ونواہی سے آگاہ کرتا ہے۔ تیسری اطاعت اولی الامر کی ہے جس سے مراد امام وقت ہے جو کہ بے کم وکاست موافق شریعت انور وسیرتِ پیغمبر احکام جاری کرے۔ اس بارے

میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اولی الامر سے مراد کون ہیں۔ کوئی کہتا ہے بادشاہانِ وقت مراد ہیں' کوئی کہتا ہے امرائے سرایا مراد ہیں' کوئی کہتا ہے علمائے وقت مراد ہیں' کوئی کہتا ہے اس سے وہ معصوم ہستیاں مراد ہیں جو اہلبیت رسولؐ کہلاتی ہیں لہٰذا ہم اس آیت کریمہ کی وضاحت کیلئے مولانا سید ظفر حسن صاحب کی بیان کردہ تفسیر کو درج کرتے ہیں:

۱) اس آیت میں لفظ اطیعوا دو جگہ لایا گیا ہے۔ پہلے سے مراد اللہ کی اطاعت ہے دوسرے اطیعوا کے تحت میں دو اطاعتیں ہیں۔ ایک رسولؐ کی دوسرے اولی الامر کی۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ جسطرح رسولؐ کی اطاعت 'اطاعتِ مطلقہ ہے یعنی ہر امر میں انکی اطاعت واجب ہے خواہ وہ دنیوی معاملات ہوں یا دینی اسیطرح اولی الامر کی اطاعت ہے۔

۲) اولی الامر کی اطاعت اس وقت تک اطاعتِ مطلقہ نہیں ہو سکتی جب تک وہ رسولؐ کی طرح معصوم نہ ہوں۔ کیونکہ غیر معصوم کی اطاعت باعثِ فتنہ و فساد ہو گی۔

۳) اصحابِ رسولؐ میں سے سوائے اہلبیتِ رسولؐ نہ کسی نے خود معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے نہ کسی کو اُمت نے بنایا ہے۔

۴) یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت وقتی نہیں' کسی ایک جماعت سے مخصوص نہیں بلکہ قیامت تک باقی رہے گی۔ آپس میں جھگڑے ہمیشہ ہوتے رہیں گے لہٰذا اگر رسولؐ موجود نہ ہوں تو اولی الامر میں سے کم از کم ایک شخص ہر زمانہ میں ضرور موجود رہنا چاہئے تاکہ عدل و انصاف سے بے غرض ہو کر ہر نزاع کا فیصلہ کرے۔

۵) دینی مسائل میں اگر اختلافی صورت پیدا ہو تو اس کا فیصلہ یا تو رسولؐ کر سکتے تھے یا پھر اولی الامر۔ یہ کام علماء کے بوتے کا نہیں کیونکہ ان کے درمیان تو ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور رہے گا۔

۶) اگر اولی الامر سے مراد بادشاہانِ وقت ہوں تو اسلام کا بیڑا غرق ہو جائے گا کیونکہ کہیں عیسائی بادشاہ ہے کہیں بدھ کہیں ہندو کہیں مسلمان۔ ایسی صورت میں کس کی اطاعتِ مطلقہ کی جائے گی اور اگر سب کی اطاعت کی جائے تو یہ ناممکن۔

۷) اگر کہا جائے کہ صرف مسلمان بادشاہوں کی اطاعت کی جائے تو مسلمان بادشاہ ظالم' فاسق' فاجر ہر قسم کے ہوئے ہیں ایسی صورت میں ان کی اطاعت مطلقہ کیسے ہو سکتی ہے۔

۸) رہے امرائے سرایا تو وہ بھی معصوم نہ تھے۔ ان سے بار بار غلطیاں ہوئی تھیں۔ فوجیوں کو ان سے شکایات رہتی تھیں وہ لوگوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ غارتگری کرتے تھے۔ زناکاری کرتے تھے۔ اس صورت میں ان کی اطاعت مطلقہ کا حکم کیسے دیا جا سکتا تھا۔

۹) رہے علماء تو ان حضرات کی مہربانی سے ایک دین تہتر فرقوں میں تقسیم ہوا اور رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے صرف ایک فرقہ ناجی ہو گا بہتر دوزخ میں جائیں گے اس صورت میں کس فرقہ کے علماء کی اطاعت تمام مسلمان کریں گے۔ اس مصیبت سے بچانے کیلئے رسولؐ اللہ نے صاف لفظوں میں اپنی امت کو بتا دیا کہ میرے اہلبیتؑ کی مثال سفینہ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جس نے رُوگردانی کی ڈوب گیا اور ہلاک ہو گیا۔

۱۰) رسولؐ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اُس نے اپنے امامِ زمانہ کو نہ پہچانا وہ کفر کی موت مرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے اور اس کی معرفت اس زمانہ کے لوگوں پر واجب ہے۔ نیز یہی ولی امر کہلاتا ہے۔ ہر شب قدر ملائکہ احکامِ الٰہی اس کے پاس لے کر آتے ہیں جو نہیں مانتے وہ بتائیں

کہ شب قدر جو ہر سال آتی ہے اس میں ملائکہ کس پر نازل ہوتے ہیں۔ رسولؐ کے بعد سے اب تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ غیر معصوم کے پاس ملائکہ آتے ہی نہیں اور نہ وہ اس کا اہل ہے کہ احکامِ الٰہی اس پر نازل ہوں۔

۱۱) آیت بتاتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں نزاعی شکل پیدا ہو تو اس میں اللہ کی طرف رجوع کرو یا رسولؐ کی طرف یعنی کتاب و سنت کی طرف۔ لیکن کتاب و سنت یعنی احادیث خاموش ہیں۔ ان سے ہر شخص اپنے مقصد کے مطابق دلیل لاتا ہے۔ جب دونوں فریق قرآن و حدیث سے اپنی اپنی دلیلیں پیش کر رہے ہوں تو اس کا فیصلہ کون کرے کہ حق کس طرف ہے۔ عقلی فیصلہ یہی ہو گا کہ ان کے درمیان حق کا فیصلہ کرنے والا وہی ہو گا جو معصوم ہو اور قرآن و حدیث کا سب سے بڑا عالم ہو۔ اور رسولؐ نے جس کو اپنے بعد ایسے مسائل حل کرنے کا ذمہ دار بنایا ہو۔ جس کا فیصلہ ہر امر میں ناطق ہو۔ یعنی فیصلہ میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ پس ایسا شخص اہلبیت رسولؐ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان کا علم وہبی تھا اکتسابی نہ تھا۔ وہبی علم میں غلطی واقع نہیں ہوتی۔ سامنے کی مثال ہے کہ حضرت علیؑ نے ہزارہا فیصلے عہدِ رسالت سے لے کر اپنی سلطنت کے آخر تک کیے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی غلط ثابت نہ کیا گیا حالانکہ ان کے دشمن اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کوئی غلط فیصلہ ان سے صادر ہو۔

۱۲) ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کی اطاعت نہ کرنے سے کوئی کافر نہیں ہو سکتا لیکن امامِ زمانہؑ کی اطاعت نہ کرنے والا کفر کی موت مرتا ہے۔ جیسا کہ حدیث مَن مَاتَ سے ظاہر ہے۔

۱۳) خدا فرماتا ہے اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (اے رسول تم

ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے) لہٰذا اس ہادی کی اطاعت رسولؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہونی چاہئے۔

۱۴) اہلبیتؑ رسول کا معصوم ہونا آیتِ تطہیر سے ظاہر ہے پس جب وہ طہارت میں شریکِ رسولؐ ہیں تو رسولؐ کی طرح معصوم ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اطاعت رسولؐ کی سی اطاعت ہے۔

۱۵) اولی الامر کا اطلاق بارہ اماموں پر ہوتا ہے جن کے نام ایک ایک کر کے آنحضرتؐ نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ کو بتا دیئے تھے۔

۱۶) کوئی یہ نہ کہے کہ جب ان کی اطاعت مثل اطاعتِ رسولؐ امت پر واجب تھی تو ان کے نام کیوں نہ ذکر کیے تو جواب یہ ہے کہ جہاں ذکر کیا تھا وہ کب رہ گئے جو یہ رہ جاتے دوسرے قرآن میں تو بہت سی چیزیں ذکر نہیں کی گئیں جیسے رکعات نماز' زکوٰۃ کا نصاب' مناسکِ حج' پس جیسے ان باتوں کو رسولؐ سے پوچھا گیا اسی طرح اولی الامر کو بھی معلوم کرنا امت کا فرض تھا۔ (تفسیر القرآن ص: ۳۰۷ ج:۱)

سورہ النساء کی آیت :۵۹ میں مذکورہ "اولی الامر" سے متعلق ایک حدیث اس طرح بیان کی گئی ہے:

"عن جابر بن عبداللہ الانصاری قال لمانزلت هذه الاية قلت رسول الله عرفنا الله ورسوله فمن اولوالامر الذين قرنهم الله طاعتهم لطاعته فقال هم خلفائے يا جابر وائمة المسلمين من بعدى اقلهم على ابن ابى طالب ثم الحسن ثم الحسين ثم على بن الحسين ثم محمد بن على المعروف فى التورٰة بالباقر ستدركه يا جابر فاذا القيته اقرمنى السّلم ثم الصّادق جعفر بن محمد ثم موسىٰ بن جعفر ثم على بن موسےٰ ثم محمد بن على ثم على بن محمد ثم الحسن بن على ثم

سیمی محمد وکنیہ حجۃ اللہ فی ارضہ وبقیہ فی عبادہ ابن الحسن بن علی ذاک الذی یفتح اللہ علی یدیہ مشارق الارض ومغاربہا ذاک الذی یغیب عن شیعتہ واولیائہ غیبۃ لایثبت فیہا علی القول بامامتہ من امتحن اللہ قلبہ للایمان قال جابر فقلت لہ یا رسول اللہ فہل لشیعتہ الانتفاع بہ فی غیبتہ فقال ای والذی بعثنی بالنبوۃ انہم یستضیئون بنورہ وینتفعون بولایتہ فی غیبتہ کانتفاع الناس بالشمس وان تجلاھا سحاب یا جابر ھذا امر مکنون سر اللہ ومخزون علم اللہ فاکتمہ الاعن اہلہ ."

"ترجمہ : جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہتے ہیں کہ :

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ میں خدا کو اور رسول کو تو جانتا ہوں مگر اولی الامر کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں۔ فرمایا کہ اے جابر وہ میرے خلفاء ہیں اور میرے بعد مسلمانوں کے امام ہیں۔ اول ان کا علی ابن ابی طالب ہے اور بعد اس کے حسنؑ ہے اور بعد اس کے حسینؑ ہے اور بعد اس کے علی ابن حسینؑ ہے اور بعد اس کے محمدؑ بن علی ہے کہ توریت میں وہ باقرؑ مشہور ہے۔ اور تو اس کو پائے گا اور جس وقت تو اس کو دیکھے گا تو میرا اسلام اس کو پہنچانا۔ بعد اس کے رسولؐ خدا نے باقی کے آئمہ معصومین حضرت جعفرؑ بن محمدؑ پھر موسیٰؑ بن جعفرؑ پھر علیؑ بن موسیٰ پھر محمدؑ بن علی پھر علیؑ بن محمدؑ پھر حسنؑ بن علی معصومینؑ ہر ایک کا نام فرمایا۔ یہاں تک کہ جس وقت حضرت صاحب العصر والزمان کے نام پر پہنچے تو فرمایا کہ نام میرا نام اس کا ہوگا۔ اور کنیت میری ہوگی۔ اور وہ حجت خدا ہے زمین خدا میں اور بیٹا حسنؑ بن علی کا ہے۔ اور وہ شخص ہے کہ فتح کرے گا خدا اس کے ہاتھوں پر مشارق اور مغارب زمین کو اور غائب ہوگا۔ وہ اپنے شیعوں سے اور دوستوں سے یہاںتک کہ بسبب درازی مدت کے کوئی

تصدیق اس کی امامت کی نہ کرے گا۔ مگر وہ شخص کہ امتحان کیا ہے خدا نے دل اس کے واسطے ایمان کے۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہؐ شیعوں کو ان کی غیبت میں کچھ ان سے فائدہ ہوگا۔ فرمایا قسم ہے خدا کی جس نے مجھ کو پیغمبر کر کے بھیجا ہے شیعہ اس کے نور سے روشنی پائیں گے۔ اور فائدہ حاصل کریں گے اس کی خلافت سے اس کی غیبت میں جیسے کہ فائدہ پاتے ہیں۔ آدمی آفتاب سے اگرچہ زیر ابر ہوتا ہے جابر وہ سر مکنون خدا اور مخزن اس کے علم کا ہے اور جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس کو اپنے دل میں نگاہ رکھ اور کسی کے روبرو اس کو بیان مت کر مگر ان لوگوں سے کہ جو اس کے اہل ہیں۔"

(تفسیر صافی ص : ۱۰۸' خلاصہ منہاج الصادقین ص : ۱۱۸'
تفسیر عمدۃ البیان جلد : ۲ ص : ۲۳۱)

اس حدیث رسول اللہؐ سے قطعی طور پر واضح ہو گیا کہ اولی الامر سے کون لوگ مراد ہیں۔ یہاں پر یہ بھی جاننا چاہیئے کہ صاحب حکومت دنیاوی یعنی بادشاہ وقت اگرچہ وہ دینی اولی الامر نہیں ہوتا پھر بھی جان ومال وآبرو کی حفاظت کی خاطر اسکی فرمانبرداری واطاعت ضروری ہے ورنہ معاملات دنیوی میں خلل پڑے گا جو موجب فساد ہوگا خصوصاً ایسے بادشاہ عدالت پناہ کی اطاعت جس نے فی زمانہ مذہبی آزادی اور ادائے مراسم دینی میں کسی طرح کا خلل نہیں ڈالا بلکہ انکے بجالانے میں ہر طرح ہمارا معاون ومددگار ہے بدرجہ اولیٰ لازم ہے۔

خلیفہ کا تقرر : جہانتک جانشین کے تقرر میں شوریٰ کا تعلق ہے تو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اللہ کے رسولؐ نے اپنی پوری عملی زندگی میں کبھی ایک دفعہ بھی کسی غزوہ یا سریہ کے کمانڈر کا تعین کرتے وقت اپنے اصحاب سے مشورہ نہیں کیا خصوصاً اپنی حیات کے آخری ایام میں جب اسامہ بن زید کو امیر لشکر مقرر فرمایا تو ان کی نوعمری کے پیش نظر کچھ صحابہ نے اعتراض کیا لیکن آپ نے انکے اعتراض کو رد کرتے ہوئے تمام اصحاب کو حکم دیا کہ اس لشکر

میں شریک ہوں اور آپ نے ان لوگوں پر لعنت کی جو اس لشکر میں شامل ہونے سے گریز کریں (الملل والنحل) نیز مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے وقت کسی سے مشورہ کئے بغیر جس کو مناسب سمجھا اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اسی طرح جب وفود آتے اور اپنے اسلام کا اعلان کرتے تو اس وقت بھی کسی سے مشورہ کئے بغیر ان میں سے جسکو چاہتے ان کا سربراہ مقرر فرمادیتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ امارت' ولایت اور خلافت میں لوگوں کی مشاورت کا دخل نہیں بلکہ یہ معاملہ رسول اللہؐ کے حکم سے طے ہوتا ہے اور رسول کا حکم اللہ کا حکم ہے۔

چنانچہ اسی سنت الہیہ کے مطابق خداوند عالم نے خاتم الانبیاء کے خلفاء اور جانشینوں کا مسئلہ حل فرمایا اور وصایت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ ارشاد ہوا :

" لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ "۔

"یعنی امت محمد کے خلفاء کو بھی اسی طرح مقرر کروں گا جس طرح کہ سابقہ انبیاء کے اوصیاء و خلفاء کو مقرر کر چکا ہوں"۔

لہٰذا اللہ جل شانہ کے اسی اصول تقرر اور سنت انبیاء ماسبق کے مطابق (جس کی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں تحریر کر آئے ہیں) جناب سرور کائنات نے بھی اپنے وصی کا تقرر فرمایا۔ جناب رسالتمآب کو اپنی بعثت کے اوائل میں قرآن مجید کی آیت[1] کے تحت حکم ملا کہ اپنے خویش واقارب کو دین کی طرف بلائیں لہٰذا آپ نے خاندان بنی ہاشم کو دعوت دی جو دعوت ذوالعشیرہ کہلاتی ہے اسی دعوت کے موقع پر آپ نے پہلی مرتبہ حضرت علی ابن ابیطالب کی وصایت وخلافت کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا

" قال ھذا اخی و وصی وخلیفتی فیکم "[2]

ترجمہ : فرمایا اے لوگو! یہ میرا بھائی میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے۔"

[1] سورۃ الشعراء آیت : ۲۱۵-۲۱۳' [2] تاریخ ابوالفدا ص : ۱۱۶ ج : ۱' تاریخ طبری ص : ۲۱۷ ج : ۲' تاریخ کامل ص : ۲۰۲ ج : ۲' البدایہ والنہایہ ص : ۳۹ ج : ۳' ابن کثیر ص : ۴۰ ج : ۳' کنز العمال ص : ۳۹۲ ج : ۶' مسند احمد بن حنبل ص : ۳۳۱ ج : ۱' مستدرک حاکم ص : ۱۳۳ ج : ۳ وغیرہ

اس کے بعد متعدد مواقع پر آپؐ نے بہت سی مستفیض اور متواتر احادیث و روایات کے ذریعہ جو شیعہ و سنی دونوں ذرائع سے ہم تک پہنچی واضح طور پر حضرت علیؑ کی وصایت کا اعلان فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا :

" لِكُلِّ نَبِيٍّ وَصِيٌّ ' وانا وَصِيَّ عَلِيُّ بن ابي طالب "

(ابن عساکر تاریخ دمشق ص : ۵ ج : ۳' مناقب خوارزمی ص : ۴۲'
ینابیع المودۃ ص : ۷۹)

" ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ میرا وصی علی ابن ابی طالب ہے"۔

کبھی حضرت علیؑ سے فرمایا :

" انتَ مِنّي بِمنزلةِ هارُونَ من مُوسىٰ إلّا انّه لا نبيَّ بعدي "

(صحیح بخاری باب فضائل علیؑ' صحیح مسلم ص : ۱۲۰ ج : ۷)

" یعنی جو نسبت ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی وہی نسبت تمہیں مجھ سے ہے بس یہ فرق ہے میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

وصایت علیؑ ابن ابیطالب کی ان نصوص صریحہ کے علاوہ قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص متواترہ اس مدعا پر روشن دلیل ہیں۔ جن میں سے آیت ولایت' حدیث ولایت' حدیث منزلت' حدیث غدیر اور حدیث ثقلین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افضل و مفضول : فضیلت ایک ایسی صفت ہے جو وجود خارجی نہیں رکھتی بلکہ اس کے کچھ علامات واسباب ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے اسے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی جس شخص میں فضیلت کی مخصوص علامات پائی جائیں وہی افضل ہوتا ہے اور بقیہ سب مفضول ہوتے ہیں۔ اور یہ امر ثابت شدہ ہے کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی خلافت وامامت درست نہیں جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔ نیز ہر رسول کا خلیفہ منصوص من اللہ ہوتا ہے کسی نبی یا رسول کو اپنا جانشین وخلیفہ اپنے طور پر

مقرر کرنے کا حق خدا نے نہیں دیا بلکہ وہ تو اس امر کیلئے خدا سے صرف سفارش کر سکتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی بابت ارشاد خداوندی ہے :

" وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِيْ ۝

ترجمہ : اور میرے کنبہ والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر (بوجھ اٹھانے والا) بنادے۔" (سورہ طٰہٰ آیت : ۲۹-۳۰)

اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رسول کی خلافت اس کے خاندان والوں ہی میں مخصوص ہوتی ہے اور وہ بھی قریب ترین رشتہ دار سے۔ اس کے علاوہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ کام امت کے سپرد کر دیا گیا ہو کہ تم جسے چاہو خلیفہ بنالو۔

آیۂ استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف وعدہ فرمایا ہے کہ اے امت محمدیؐ! خاتم الانبیاء کے بعد میں تم میں سے ہی ان لوگوں کو خلیفہ بناؤں گا جن میں اوصاف افضلیت پائے جاتے ہوں گے۔ آیۂ استخلاف کا ایک حصہ اوپر بیان کر کے یہ بتایا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے جانشین و خلیفہ متعین کرنے میں سنت الٰہیہ کیا رہی ہے اب ہم پوری آیت پیش کر کے اس کے بقیہ حصہ پر روشنی ڈالیں گے۔ ارشاد باری ہے کہ :

" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ " ۝ (سورہ النور آیت : ۵۵)

" ترجمہ : (مسلمانوں) تم میں سے جو ایمان والے ہیں اور جنہوں نے اعمال صالحہ کئے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں زمین پر اسطرح خلیفہ بنایگا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور جس

دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اس پر ان کو پوری قدرت دیگا اور انکے خوفزدہ ہونے کے بعد انکے خوف کو امن سے بدل دیگا تاکہ وہ میری عبادت اطمینان سے کریں گے اور میرا شریک کسی کو نہ بنائیں گے۔ جو اسکے بعد بھی انکار کرے تو ایسے لوگ بدکار ہیں"۔

سورہ نور کی مذکورہ آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے جانشین رسول یعنی خلیفہ کے چار اوصاف بیان کئے ہیں۔ (۱) ایمان کامل ہونا۔ (۲) جمیع اعمال کا صالح ہونا۔ (۳) عبادت الٰہی میں ممتاز ہونا۔ (۴) شرک جلی و خفی سے پاک و مطہر ہونا۔ جس شخص میں یہ چاروں اوصاف پائے جائیں گے وہ افضل ترین امت ہوگا اور وہی منصوص من اللہ خلافت رسول کا جائز وارث و حقدار ہوگا۔ آیئے دیکھیں کہ اسلام میں وہ کون سی افضل ترین شخصیت ہے جس میں مذکورہ صفات پائی جاتی ہیں۔

۱) ایمان کامل : بلاشبہ اس وقت کے مسلمانوں میں بہت سے صاحب ایمان بھی تھے لیکن ان کے ایمان کو ایمان کامل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ کامل الایمان وہ شخص ہوتا ہے جس کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایمان سے خالی نہ ہو۔ جب کہ ان مسلمانوں میں کوئی چالیس سال، کوئی تیس سال اور کوئی ستائیس سال کی عمر میں ایمان لائے۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ اسلام لانے سے قبل انہوں نے رسومات جاہلیت کے مطابق زندگی بسر کی لہٰذا ان کا ایمان کسی طرح بھی ایمان کامل نہیں کہا جاسکتا ہے۔ جب کہ مورخین تاریخ اسلام تو کیا ادیان عالم کا کوئی بھی مورخ و محقق حضرت علیؑ ابن ابیطالب کے بارے میں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہے کہ آپ نے اپنی پیدائش کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی بت پرستی کی ہو، جاہلیت کے لہو و لعب میں مشغول رہتے ہوں، شرک و کفر سے ہمدردی کی ہو، یا خدا کی حرام کردہ اشیاء کو حلال سمجھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے ذوالجلال نے بزبان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بروز جنگ احزاب (خندق) حضرت علیؑ کی شان میں ارشاد فرمایا بَرَزَ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ اِلَى الْكُفْرِ كُلِّهٖ یعنی کُل ایمان کُل کفر کے مقابلہ میں جارہا ہے۔ کیا دنیائے اسلام کے کسی بھی فرد کیلئے ایمان کامل کی ایسی سند خدا یا رسولؐ کی جانب سے عطا ہوئی؟ اس کے علاوہ جناب رسالتمآبؐ کی متفق علیہ حدیث ہے کہ اَنَا وَعَلِيٌّ مِّنْ نُّوْرٍ وَّاحِدٍ یعنی میں اور علی ایک ہی نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نور الٰہی کے ایمان میں شک کیا جائے؟ اگر نعوذ باللہ جناب رسالتمآبؐ کے ایمان کامل میں شک کیا جاسکتا ہے تو جناب علی مرتضٰی کے ایمان میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ دونوں ایک ہی نور سے ہیں۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ علی نے دس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا تو ہم اس سے یہی کہیں گے کہ ختمی مرتبتؐ نے چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت فرمایا تھا۔ چالیس سال کی عمر تک آپ کیا تھے؟ مزید برآں آنحضرتؐ نے متعدد بار فرمایا کہ "میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ آب و گل میں تھے" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "جب کچھ نہ تھا تو میں تھا" یعنی صرف خدا اور خدا کا محبوب۔ اور اب فرمارہے ہیں کہ "میں اور علی ایک ہی نور سے پیدا ہوئے" اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح جناب رسالتمآبؐ نے چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت فرمایا اسی طرح جناب علی مرتضٰیؑ نے دس سال کی عمر میں اعلان اسلام فرمایا۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علی ابن ابیطالب ہی ایمان کامل کے درجہ پر فائز تھے اور آپ اس صفت میں جملہ اصحاب سے افضل و برتر ہیں۔

۲) عبادت الٰہی : عبادت تو سب مسلمان ہی کرتے تھے اور خوب کرتے تھے مگر حضرت علیؑ ابن ابیطالب کی عبادت الٰہی کی بابت جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی حضرت عبداللہ بن عباس کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے کہ :

" جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ مجھ پر اور علی پر سات برس تک فرشتے درود بھیجتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے کہ بجز میرے اور علی کے آسمان کی طرف کسی کی لا الٰہ الا اللہ پر شہادت دینے کی آواز بلند نہیں ہوتی تھی"۔ (ارجح المطالب ص : ۴۸۹)

کیا کہنے اس کامل الایمان بندے کی عبادت کے جس کی بابت حبیب خدا کبھی ارشاد فرمائیں " علی کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔" کبھی لوگوں میں اعلان فرمائیں " علی کا ذکر عبادت ہے"۔ اور اسی طرح مختلف موقعوں پر اظہار فضیلت فرماتے تھے۔ لیکن یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ متعدد احادیث کی موجودگی کے باوجود ناصبی ذہنیت کے مورخین و محققین حضرت علیؑ کی شان کو گھٹانے کیلئے طرح طرح کی الزام تراشیاں کرتے ہیں مگر پھر بھی دنیا کا کوئی مورخ یا محقق یہ ثابت نہیں کر سکا کہ آپ نے ایک پل کیلئے بھی عبادت الٰہی سے منہ موڑا ہو اور کسی غیر اللہ کے سامنے سر جھکایا ہو۔ اس کے برعکس جملہ مورخین نے جنگ خندق کے واقعات کے ذیل میں حضرت ختمی مرتبتؐ کے یہ کلمات تحریر کئے ہیں کہ :

"ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝

"ترجمہ : یوم خندق علی کی ایک ضربت روز قیامت تک کے تمام جن وانس کی عبادت سے افضل ہے۔"

کیا کوئی ہمسری کر سکتا ہے علی ابن ابیطالب کی جن کی بابت اللہ کے رسول ارشاد فرمائیں کہ روز قیامت تک کے تمام جن وانس کی عبادت سے یوم خندق حضرت علیؑ کی ایک ضربت، جو انہوں نے عمرو بن عبدود کو لگائی، افضل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عبادت الٰہی کی صفت میں بھی حضرت علی ابن ابیطالب ممتاز ترین و افضل ترین امت ہیں۔

۳) **جمیع اعمال کا صالح ہونا:** بے شک عہد رسالتمآبؐ کے مسلمانوں میں سے کچھ نے بہت سے اعمال نیک کئے جو قابل قدر بھی ہیں اور قابل تعریف بھی لیکن قرآنی اصطلاح میں انھیں اعمال صالح نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ جاہلیت کے دور میں کئے جانے والے اعمال ہرگز نیک نہیں کہے جاسکتے اس طرح ان کے کل اعمال نیک نہ تھے یہاں خلافت کیلئے جمیع اعمال یعنی کل کا صالح ہونا شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پوری زندگی افعال صالح پر عمل کرتے گذری آپ سے کبھی کوئی غیر صالح عمل سرزد نہیں ہوا۔ آپ کے جملہ اعمال چاہے وہ دعوت ذوالعشیرہ ہو' شب ہجرت بستر رسولؐ ہو' احد و حنین کی جنگیں ہو' فتح مکہ کے موقع پر بت شکنی ہو' تکفین و تدفین رسول ہو' بعد رسول دین کی بقا کے لئے صبر و سکوت ہو' خلافت ظاہری کے دوران دین کی تبلیغ و ترویج ہو۔ الغرض آپ کا ہر ہر عمل' عمل صالح تھا۔ انہی اعمال صالح کے باعث باری تعالیٰ نے سورہ تحریم آیت : ۴ میں آپؑ کو "صالح المومنین" کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کا اللہ رب العزت مومنین میں سے مرد صالح کہہ کر تعارف کرائے وہ افضل ترین عبد ہی ہوگا اور پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جسے اللہ رب العزت مرد صالح کہے اس کے اعمال غیر صالح ہوں۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علی ابن ابیطالب کے جمیع اعمال صالح تھے لہٰذا آپ اس خصوص میں بھی افضل ترین امت ہیں۔

۴) **شرک جلی و خفی سے مطہر ہونا:** دعویداران خلافت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اعلان بعثت کے وقت تک اپنے آبائی دین پر کاربند رہتے ہوئے رسومات جاہلیت میں شریک۔ نہ رہا ہو اور شرک و کفر میں مبتلا نہ رہا ہو۔ جب کہ حضرت علی ابن ابیطالب کرم اللہ وجہہ ولادت سے قبل پاک صلب سے پاک رحم کی طرف منتقل ہوئے' پیدا ہوئے خانہ کعبہ میں' آنکھ کھولی

دست رسالت پر' دنیا میں پہلی غذا ملی لعب دہن رسول' پرورش پائی گہوارۂ نبوت میں' تربیت پائی آغوش محمدؐ میں' بیٹھے تو عبادت الٰہی میں' سوئے تو بستر رسول پر' اٹھے تو نصرت خدا اور رسول میں' چلنا سیکھا تو سیرت رسول پر' بولنا سیکھا تو حمایت خدا ورسول میں بولے' سوار ہوئے تو خانہ کعبہ میں دوش رسول پر' جنگ کی تو حفاظت کلمہ توحید کیلئے' صبر کیا تو ایسا کہ خانہ زہراؑ کو آگ لگے اور جلال نہ آئے۔ الغرض آپ کی پوری زندگی میں شرک وبت پرستی کا کوئی شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ آپ کا علم و فضل ایسا کہ نصوص قرآنی اور احادیث نبوی کی مہر تصدیق ثبت ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب شرک جلی و خفی سے پاک و مطہر تھے لہٰذا اس خصوص میں بھی افضل ترین امت مسلمہ ہیں۔

مذکورہ بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوا کہ فضیلت کی چاروں صفات میں فضیلت کے اعتبار سے پوری امت محمدی میں صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی کی ذات گرامی افضل ترین ہے اور اپنی خصوصیات کے باعث رسول اللہ کے واحد و جائز جانشین' وصی' ولی اور خلیفہ بلا فصل ہیں۔

جناب امام شافعی علیہ رحمۃ نے حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے :ع

عَلِیٌّ حُبُّہٗ جُنَّہ قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃ
وَصِیُّ الْمُصْطَفٰی حَقًّا اِمَامُ الْاِ نْسِ وَالْجِنَّہ

(ینابیع المودۃ ص :۸۶)

ترجمہ : علی کی محبت گناہوں کے لئے ڈھال ہے۔ علی جنت و دوزخ کے تقسیم کرنے والے ہیں۔ وہ محمد مصطفیٰؐ کے حقیقی وصی اور جن وانس کے امام ہیں۔"

خلافت ظاہری

تجویز و تائید: جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ راشد مملکت اسلامیہ کے دارالخلافہ میں پندرہ یا سترہ ذی الحجہ ۳۵ھ کو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تو چونکہ لوگوں کو بلا امام چھوڑ دینا ممکن نہ تھا اس لئے مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی تلاش و جستجو ہوئی جو ان کا امام اور خلیفہ بنے۔ اس غرض کے لئے مدینہ کے تمام مہاجر و انصار مسجد نبوی میں جمع ہوئے اور باہم صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ لوگوں نے اپنے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ان میں سے حضرت عمار بن یاسر نے بآواز بلند کہا کہ :

" اے انصار و مہاجرین تم عثمان کو اچھی طرح دیکھے ہوئے ہو کہ تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا رہا۔ اب اپنے آپ کو سنبھالو کہ اس جیسے شخص سے پالا نہ پڑ جائے۔ اس وقت علی مرتضٰی تم میں موجود ہیں۔ انھیں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو قرابت ہے وہ تم سب کو معلوم ہی ہے اور یہ بھی جانتے ہو کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہوئے ہیں۔ جماعتوں کی گروہ بندیوں کے تفرقوں سے بچو اور ان کی بیعت میں جلدی کرو۔ عمار کے اس کلام کے جواب میں تمام مہاجرین وانصار نے کہا اے عمار تم نے بہت ٹھیک بات کہی اس سے بہتر اور کوئی رائے نہیں ہو سکتی۔" (تاریخ اعثم کوفی ص :۳۳۸)

اس تجویز و تائید کے بعد سب لوگ حضرت علیؑ کے بیت الشرف پہنچے اور استدعا کی کہ وہ اس عہدۂ جلیلہ کو قبول فرمائیں اور انھیں بیعت کرنے کی

اجازت دیں۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ "ابھی عثمان کی نعش گھر ہی میں پڑی ہے ہم جب تک آپ سے بیعت نہ کرلیں گے اسے دفن نہ کریں گے۔"

حضرت علی مرتضٰی نے جواب میں فرمایا کہ " مجھے خلافت کی خواہش نہیں۔ نہ مجھے اس کی ضرورت ہے میں نہیں چاہتا کہ کوئی شخص مجھ سے بیعت کرے۔ مجھ سے درگذر کرو اور یہ کام کسی دوسرے شخص کے سپرد کرو۔ طلحہ و زبیر دونوں موجود ہیں وہ اس کام کی لیاقت رکھتے ہیں ممکن ہے کہ وہ خلافت کے خواہاں بھی ہوں۔" لوگوں نے کہا انکے پاس چلتے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔ لہٰذا آپ انکے ہمراہ پہلے طلحہ کے گھر اور پھر زبیر کے گھر گئے۔ حضرت علیؑ نے طلحہ سے کہا" اے ابو محمد ! یہ لوگ میرے پاس آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مجھ سے بیعت کریں۔ مجھے منظور نہیں تو ہاتھ بڑھا کہ لوگ تیری بیعت کریں"۔ طلحہ نے جواب دیا کہ "اے ابو الحسن ! اس کام کیلئے تم ہی سب سے بہتر اور افضل ہو اور امت رسول کی خلافت آپ ہی کا حق ہے کیونکہ آپ میں پہلے ہی سے بہت سی خوبیاں اور فضیلتیں مجتمع ہیں اور مزید یہ کہ رسول خدا کے نہایت ہی قریبی رشتہ دار ہیں"۔ الغرض انکے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ آخر میں طلحہ نے خدا کو گواہ بنا کر حضرت علیؑ سے اپنی وفاداری و فرمانبرداری کا عہد کیا۔ اسکے بعد یہ سب لوگ زبیر کے گھر گئے طلحہ بھی ان کے ہمراہ ہوئے۔ وہاں بھی اسی قسم کی باتیں ہوئیں۔ زبیر نے بھی حضرت علی سے بیعت لینے کی درخواست کی اور اپنی طرفداری و حمایت کا وعدہ کیا۔ اور عہد کیا کہ وہ آپ کی رضا سے کبھی باہر نہ ہوں گے اور کسی بھی وجہ سے آپ کی محبت اور خیر خواہی سے سرتابی نہیں کریں گے۔

طلحہ اور زبیر کے اظہار خیال کے بعد تمام لوگوں نے حضرت علیؑ سے بیعت لینے کیلئے شدید اصرار کیا تب آپ ان سب کے ہمراہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ جب تمام لوگ جمع ہو گئے تب ابو الہیثم بن تیہان' رافع بن

رفاعہ، مالک بن عجلان، ابوایوب خالد بن یزید، ہزیمہ بن ثابت وغیرہ نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "اے لوگو تم جانتے ہو کہ عثمان تم سے کسطرح پیش آتے تھے اب وہ نہیں رہے۔ حضرت علیؑ کے فضائل و کرامتیں اور قرابت رسول خداؐ آفتاب روشن کی طرح ظاہر ہیں۔ اور جو علوم اور اخلاق حسنہ اور فضائل حمیدہ ذات برکات والا میں جمع ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں۔ حلال و حرام کے متعلق باریک مسئلوں اور ہماری تمہاری ہر روز بلکہ ہر ساعت کی ضرورت کی واقفیت سے تم آگاہ ہو۔ اگر ہم کار خلافت کے اجرا میں کسی اور شخص کو حضرت علیؑ سے زیادہ بڑھا چڑھا، پرہیزگار اور خداترس پاتے تو تمہیں اس کی بیعت کی صلاح دیتے لیکن آج دنیا بھر میں یہ نیک خصلتیں آپ سے زیادہ کسی اور شخص میں موجود نہیں ہیں۔ پس تمہاری کیا مصلحت ہے اور آپ کے کار خلافت کو تم کیسا سمجھتے ہو؟ سب نے متفق اللفظ کہا ہم حضرت علی کی خلافت سے رضامند ہیں اور کسی دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ خوشی خاطر ان کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں اور از روئے یقین و بصیرت ہم اس امر کو قبول کرتے ہیں نہ کہ بسبب تردد و پریشانی۔ جب سب لوگ اپنی رائے کا اظہار کر چکے تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے ذکر کیا ہے تو کیا محض اپنی حسن عقیدت سے ایسا کیا ہے یا منجانب حق تعالیٰ مجھے اس کا حقدار سمجھ کر کہا ہے۔ سب نے کہا ہم منجانب الٰہی آپ کا حق اپنی گردن پر واجب سمجھتے ہیں۔ تب حضرت علی نے فرمایا۔ تم آج تو اپنے اپنے گھر چلے جاؤ اور اس معاملے پر مزید غور و فکر کر لو، پھر کل آنا۔ جس امر پر سب متفق ہوں گے انشاء اللہ اسے عمل میں لایا جائیگا۔[1]

بیعت خلافت : دوسرے دن حضرت علی کے مسجد نبوی میں تشریف لانے سے قبل ہی وہاں سب لوگ جمع ہو چکے تھے حضرت علیؑ آئے اور منبر پر تشریف لے گئے اور بعد حمد و ثنائے خدا و رسول آپ نے ارشاد فرمایا "اے

[1] تاریخ اعثم کوفی ص: ۳۴۰

لوگو! آج معاملہ خلافت تمہارے قابو سے نکلتا ہے اچھی طرح سوچ لو۔ اس شخص کو تم اچھا سمجھو اور اس کام کے لائق جانو یا از روئے مصلحت بہتر معلوم ہو اسے خلیفہ بنالو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس معاملہ میں تم سے مخالفت نہ کروں گا۔" جناب علی مرتضیٰؑ کی ان باتوں کو سن کر مسجد کے ہر گوشہ سے آوازیں آنے لگیں کہ ہم آج بھی اس ارادہ پر اٹل ہیں جس پر کل مستعد تھے۔ ہم انتظام امور خلافت میں آپ سے بہتر کسی دوسرے شخص کو نہیں پاتے۔ آپ دست مبارک آگے بڑھائیں کہ ہم آپ کی بیعت کریں۔ ابھی آپ خاموش ہی تھے کہ طلحہ بن عبداللہ نے اٹھ کر حضرت علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بیعت کر لی۔ طلحہ کے بعد زبیر اٹھے اور بیعت کی اس کے بعد سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح جملہ اصحاب رسولؐ، سب مہاجرین و انصار، علماء و فضلاء، سرداران عرب و عجم، اوسط درجے کے اشخاص اور صاحب جاہ و حشم جو مدینہ میں موجود تھے سب نے اطمینان قلب سے آپکی بیعت کی۔ اور اس طرح حضرت علیؑ کی خلافت قائم و منظم ہوئی۔

اہل کوفہ کی بیعت : حضرت علیؑ کی بیعت خلافت کی خبر جب تمام اطراف میں پھیلی تو اہل کوفہ جمع ہو کر امیر کوفہ ابو موسیٰ عشری کے پاس پہنچے اور کہا "تو نے کس لئے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی اور نہ ہی ان کی بیعت کیلئے لوگوں کو جمع کیا حالانکہ تمام مہاجرین و انصار نے ان سے بیعت کر لی ہے۔" ابو موسیٰ نے کہا "مجھے اس امر میں کچھ تامل ہے دیکھتا ہوں کہ اس کے بعد کیا واقع ہوتا ہے اور کیا خبر آتی ہے"۔ ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے جواب دیا "اور کیا خبر آئے گی، عثمان کو مار ڈالا۔ مہاجر و انصار اور خواص و عوام نے حضرت امیر المومنین علیؑ سے بیعت کر لی کیا تو اس بات سے ڈرتا ہے کہ علیؑ سے بیعت کر لی تو عثمان دوسرے جہاں سے پلٹ آئیگا"۔ یہ کہہ کر ہاشم نے اپنے داہنے ہاتھ میں بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ بایاں ہاتھ میرا ہے اور دایاں

حضرت علیؑ کا میں نے ان سے بیعت کی اور انکی خلافت کو قبول کیا۔ ہاشم کے اس طرز عمل سے ابو موسیٰ کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا پھر اس نے اٹھ کر بیعت کی جسکے بعد تمام اہل کوفہ اکابر و سادات اور مشائخ و مشاہیر نے بیعت کر لی۔

اہل یمن بھی بہ رغبت دلی اس رسم مبارک کی ادائیگی کیلئے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ اسی طرح سے دیگر تمام علاقوں و صوبہ جات اسلامیہ کے لوگوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کی مگر معاویہ بن ابو سفیان امیر شام نے نہ تو خود بیعت کی اور نہ ہی اہل شام کو بیعت کرنے دی۔

الحمد اللہ کہ دین اسلام کے دونوں مذاہب یعنی اہلسنت اور اہل تشیع حضرت علی مرتضیٰؑ کی خلافت کو بر حق و راشد تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں اور اپنے اپنے طریقے پر آپ کی ذات والا صفات اور آپ کی اولاد اطہار کو مقدس و برگزیدہ مانتے ہیں اور عقیدت و اتباع کا اظہار کرتے ہیں۔ مذہب شیعہ کے عقیدے کے مطابق آپؑ کی فضیلت سوائے ذات ختم المرسلین کے تمام عالم پر تسلیم شدہ ہے۔ جبکہ اہلسنت والجماعت اس طور پر تو معصوم تسلیم نہیں کرتے مگر بالاتفاق ان کو محفوظ جانتے اور خاصان خدا کی مخصوص و مقدس جماعت میں ان کا مقام ارفع و اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں۔

اہل اسلام کے ان دونوں بڑے مذاہب میں یہ ایک عظیم مناقشہ درپیش ہے کہ اس مقدس جماعت طاہرین یعنی آئمہ اہلبیت کا حقیقی تابع و مقلد کون ہے۔ شیعہ جماعت دعویٰ کرتی ہے کہ ہم ان کے حقیقی پیرو ہیں اور دوسرا فریق غلط ہے جبکہ سنی جماعت اصلی و حقیقی پیرو ہونے کی دعویدار ہے اور وہ فریق ثانی یعنی شیعہ جماعت کے دعوے کو غلط بتاتی ہے۔ صدیوں سے یہ مناقشہ چلا آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلسلۂ اہلبیت یا سلسلہ مذہب ہر دو فریق میں مقبول و پسندیدہ ہے۔

سنی اور شیعہ کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو جناب علی مرتضیٰؑ کی

شان میں گستاخی کرتا ہے اور آپکے ایمان میں تنقیص و تکفیر کا قائل ہے یہ گروہ خوارج کا ہے۔ انہی سے ملتے جلتے خیالات کا ایک اور گروہ ہے جو ویسے تو اپنے آپ کو سنی کہتا ہے لیکن علیؑ و اولاد علیؑ سے بغض و عداوت رکھتا ہے یہ گروہ ناصبی کہلاتا ہے جس کی بابت ہم آگے قدرے تفصیل سے لکھیں گے۔ ایک گروہ اور ہے جسکا عقیدہ سب سے ہٹ کر ہے۔ یہ گروہ جناب علی مرتضیٰؑ کو الوہیت کے درجہ پر یعنی خدا مانتا ہے (نعوذباللہ) جو نصیری کہلاتا ہے یہ مردود گروہ ممکن ہے دنیا کے کسی خطہ میں ہوں ویسے اب ان کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ ان گروہوں کی سراسر افراط و تفریط ناجائز سے جناب علی مرتضیٰؑ کا مقام ارفع و اعلیٰ اپنی جگہ پر ہے اور مسلمانوں کے دونوں بڑے فرقے یعنی سنی و شیعہ اپنے اپنے نقطہ نظر سے آپکو خلیفہ بر حق و امام مطلق و پیشوائے دین مانتے چلے آرہے ہیں۔

ناصبیت : مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حضرت علیؑ اور اولاد علیؑ سے بغض و عناد رکھتا ہے ان کی تنقیص و تذلیل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور شاہان بنی امیہ کی طرف داری کرتا ہے اور ان کے افعال قبیحہ کی پردہ پوشی کے لئے کوشاں رہتا ہے اسے اصطلاح میں ناصبی کہتے ہیں۔ یہ گروہ اہلسنت والجماعت کی آڑ میں اپنے عناد و فساد کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ عموماً اس ناصبی گروہ کے افراد اپنے نفاق کو چھپاتے ہیں مگر جب بھی انہوں نے اپنے نفاق کا اظہار کیا تو سنی اور شیعہ دونوں نے متحدہ طور پر ان کا مقابلہ کیا ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ "تاریخ سے قطعی ثابت ہے کہ اہلسنت ہمیشہ نواصب سے مقابلہ کرتے تھے اور ان بدبختوں کی ہجو اس کا جواب دیکر ان سے پرخاش رکھتے تھے"۔[1] ایک طرف تو یہ گروہ حضرت علیؑ کی خلافت حقہ راشدہ کو تسلیم کر کے اپنے آپ کو سنی ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف آپ کی بے جا تنقیص و تخریب سے باز نہیں آتا۔ جبکہ جمیع اکابر اہلسنت

[1] تحفہ اثناء عشریہ ص: ۹۹

والجماعت ہر زمانہ اور ہر زمین میں خلفائے اربعہ کی خلافت راشدہ کی تنظیم و انعقاد کا اعلان پوری قوت سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ مگر ان خلفاء اربعہ راشدہ میں علی کا نام درمیان میں آنے سے اس ناصبی گروہ کو خار سا چبھنے لگتا ہے اور یہ لوگ اپنے مختارات فاسدہ کو نکالنے کے لئے کبھی کہتے ہیں حضرت علی کی خلافت پر امت مجتمع نہیں ہوئی، کبھی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے قاتلین عثمان سے قصاص نہیں لیا، کبھی کہتے ہیں کہ فلاں فلاں صحابی نے بیعت نہیں کی، کبھی کہتے ہیں حضرت علی میں خلافت کی صلاحیت ہی نہیں تھی، کبھی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے خانہ جنگی برپا کردی اور کبھی کہتے ہیں کہ حضرت علی نے فتوحات ملکی کا قطعاً سدباب کردیا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ اپنی پوشیدہ آرزو کی تکمیل یعنی شاہان بنی امیہ کے عیوب غیر شرعیہ کی پردہ پوشی کرکے انکی حکومت کے قیام کو جائز قرار دلوانے کیلئے حضرت علیؑ کی خلافت حقہ راشدہ میں نقائص ثابت کرنیکی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس ناصبی گروہ کے بیہودہ خیالات کا منبع ابن تیمیہ کی بعض تصریحات اور انہی جیسے دیگر حضرات کے بیانات ہیں۔ لہٰذا قبل اسکے کہ ہم ابن تیمیہ کے اس مخصوص بیان کو لکھیں، ضروری ہے کہ ابن تیمیہ کا مختصر تعارف کرادیں۔

ابن تیمیہ : ابن تیمیہ کے نام اور ان کی خدمات کے بارے میں اس ملک کے افراد میں سوائے خال خال اہل علم کے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ابن تیمیہ کا شمار تو ضرور اہلسنت میں ہوتا ہے مگر یہ ایک خاص مکتبہ خیال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ویسے تو یہ خلفائے اربعہ راشدین کی خلافت کے منکر نہیں ہیں اور اپنے مقالے میں جس کا نام "الوصیة الکبریٰ" ہے تحریر کرتے ہیں "کان امیرالمومنین علی ابن ابیطالب اخر خلفاء الراشدین المحدثین" یعنی علی ابن ابیطالب خلفائے راشدین محدثین میں آخری ہیں۔ اور اسی مقالے میں اپنا یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ "امیر معاویہ سے آپکی جو جنگ

ہوئی ہے اس میں آپ حق سے زیادہ قریب تھے" اس لحاظ سے ان کا شمار تو ضرور اہل تسنن میں ہوتا ہے مگر انکی تحریرات سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ موصوف کو خاندان اہلبیت اور اسی سلسلۃ الذہب کے افراد طیب و طاہرین سے وہ عقیدت ہرگز نہیں تھی جس کا اظہار اہلسنت کے علمائے اعلام اور مشائخ عظام عام طور پر کرتے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر علمائے اہلسنت نے جابجا ان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً امام ابو حنیفہؒ کا امام جعفر صادقؑ سے حصول علم کی بابت جو کچھ انہوں نے لکھا اس پر مولانا شبلی نعمانی نے یوں تبصرہ فرمایا ہے :

"یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ ابو حنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں انہیں جعفر صادق سے کیا نسبت، حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے ہیں۔ وصاحب البیت ادریٰ بمافیہا"۔ (سیرۃ النعمان ص : ۴۷)

اگر موصوف آئمہ اہلبیت سے اظہار عقیدت نہ بھی کرتے تب بھی غنیمت تھی مگر انہوں نے آئمہ طاہرین کی تنقیص و توہین میں بھی کوتاہی نہیں کی حالانکہ علمائے ثقات و مشائخ عظام اہل طریقت نے آئمہ طاہرین کے اس سلسلہ کو "سلسلة الذهب" کا پاک و پاکیزہ لقب دیا ہے۔

جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے متعلق عقیدت اہلسنت کا اظہار متعدد بار کیا ہے جو آپ کے بیانات سے واضح ہے ان میں سے ایک بیان ملاحظہ ہو :

" ونیز آئمہ ہمین مثل حضرت سجاد و باقر و صادق و کاظم و رضا ہمہ مقتدایان و پیشوایان اہلسنت بودہ اند کہ علمائے مثل زہری و امام ابو حنیفہ و مالک تلمذ از انجناب کردہ اند و صوفیائے آں وقت مثل معروف کرخیؒ وغیرہ از انجناب فیض اندوختہ و مشائخ طریقت سلسلہ آں حضرات را سلسلۃ الذہب نامید و محدثین اہلسنت کے ازاں بزرگواراں

در ہر فن خصوصاً در تفسیر و سلوک دفتر دفتر احادیث روایت کردہ"۔
(تحفہ اثناء عشریہ ص : ۴۸۱، حریہ بیانات ص : ۲۹۳-۳۶-۴۷ وغیرہ)

" ترجمہ : اور ان آئمہ اہلبیت مثل سجاد و باقر و صادق و کاظم و رضا ہمہ جو مقتدایان و پیشوایان اہلسنت ہیں کہ ان جناب سے علمائے اہلسنت مثل زہری و امام ابو حنیفہ و امام مالک نے علم حاصل کیا اور ہمارے صوفیا مثل معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فیضیاب ہوئے اور مشائخ طریقت نے اس خاندانی سلسلہ کو "سلسلۃ الذہب" کا نام دیا۔ اور محدثین اہلسنت کے بزرگواروں نے ان سے ہر علم خصوصاً تفسیر و سلوک کی احادیث کے دفتر کے دفتر روایت کئے ہیں"۔

ایسے ہی خیالات کا اظہار دیگر علمائے مقبولین اہلسنت مثل علامہ حجر مکی، حضرت خواجہ فرید الدین عطار وغیرہ نے جابجا اپنی تصنیفات میں کیا ہے۔ علامہ ابن حجر مکی تحریر فرماتے ہیں کہ "اکابر علما مثل یحییٰ و ابن جریج و مالک و سفیان و ابو حنیفہ و شعبہ و ایوب سجستانی نے حضرت امام جعفر صادق سے علم حاصل کیا ہے"۔[1]

الغرض اسی قسم کے بیشمار ارشادات و بیانات علمائے اہلسنت و الجماعت کے کتب تاریخ و حدیث میں منقول ہیں۔ اور ابن تیمیہ کے مخصوص نقطہ نظر کے باعث علماء اکرام و مشائخ عظام اہلسنت کا اعتدال پسند طبقہ ابن تیمیہ کے بعض مختارات کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہے۔ اور تقریباً ابن تیمیہ ہی جیسی صورتحال ابن حزم اندلسی کی بھی ہے لہٰذا ان دونوں کے متعلق اہلسنت نے ناصبی ہونے کا خیال کہیں دبے الفاظ میں اور کہیں صراحتاً ظاہر کردیا ہے۔

اب ہم ابن تیمیہ کے اس بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو "منہاج السنہ" میں درج ہے اور جس کی بنیاد پر حضرت علیؑ کی ذات اقدس پر بہتان

[1] صواعق محرقہ ص : ۳۳۱

طرازی کا سلسلہ قائم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ نے تو اپنے اوپر امت کو مجتمع کرلیا تھا اسی لئے انہوں نے کفار کے مقابل جنگ کی اور ممالک فتح کئے لیکن خلافت علی کے زمانہ میں نہ تو کفار سے جنگ کی گئی اور نہ ممالک کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا بلکہ آپس ہی میں تلوار چلتی رہی جس سے مخالفین اسلام میں اسلام کو تباہ کرنے کی طمع پیدا ہوتی رہی اور امت میں سے نصف یا اس سے کچھ کم یا زیادہ تعداد نے (بشمول حضرت سعد و ابن عمرؓ وغیرہ) آپ سے بیعت بھی نہیں کی تھی۔

اہلسنت کے ارشادات : ابن تیمیہ کے بیانات میں سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ کیا حضرت علیؑ کی خلافت علیٰ منہاج الشریعت نہ تھی اور بلا اجماع امت منعقد ہو گئی تھی؟۔ اگر شرعاً آپ کی خلافت پر اجماع ثابت ہو تو کہا جائیگا کہ امت آپ کی خلافت پر مجتمع ہو گئی اور اگر یہ ثابت ہو کہ اجماع علیٰ وجہ الشرع (کسی شرعی وجہ سے) ہوا ہی نہیں تو یہ ماننا لازم ہوگا کہ آپ کی خلافت پر امت مجتمع نہیں ہوئی لہٰذا آپ کی خلافت منعقد و منظم نہیں ہوئی۔ اس بحث میں پہلے ہم یہ غور کریں کہ اجماع عرفِ شرعی میں کسے کہتے ہیں۔ صاحب محیط المحیط نے اجماع کی یہ تعریف درج کی ہے۔

" الا جماع عند الاصولین هو اتفاق المجتهدین من امت الا سلام فی عصر علے الحکم الشرعی. والا جماع علیٰ قسمین. مرکب وغیر مرکب. فالمرکب اجتمعت علیه الاراء علیٰ حکم حادثة مع وجود الاختلاف فی العلت وغیر مرکب هو ما اجتمع علیه الارا ء من غیر اختلاف"۔

" یعنی علمائے اصول کے نزدیک اجماع خاص اس اتفاق کا نام ہے جس پر مجتہدین اسلام ایک زمانہ میں کسی ایک حکم شرعی پر متفق ہوں۔ اجماع کی دو قسمیں ہیں۔ مرکب اور غیر مرکب۔ اجماع مرکب وہ ہے کہ کسی امر حادث میں آرا متفق ہوں اور اس کی علت میں اختلاف موجود ہو اور غیر مرکب اجماع وہ ہے جس میں آرا کا اتفاق بغیر اختلاف ہو"۔

ان تشریحات کی روشنی میں یہ دیکھنا ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت کو ان کے زمانہ کے مجتہدین صحابہ نے تسلیم کیا تھا یا نہیں اور کیا آپ کی خلافت پر اجماع (مرکب یا غیر مرکب) ہو گیا تھا یا نہیں۔ اگر مجتہدین نے آپ کی خلافت پر اجماع کر لیا تھا تو آپ کی خلافت کے انعقاد و تنظیم میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اور ماننا پڑے گا کہ امت آپ پر مجتمع ہو گئی۔ اب ہم جناب علی مرتضیٰؑ کے انعقاد خلافت کے چند ناقابل تردید شواہد پیش کرتے ہیں۔

جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"ترجمہ: اکثر اہل علم کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ میں جس قدر مہاجرین وانصار موجود تھے ان سب نے آپ کی بیعت کر لی تھی اور ان سب کی بیعت سے آپ کی خلافت منعقد ہوئی۔۔۔۔۔ جناب امیر نے اہل شام کو جو مکاتیب تحریر فرمائے ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام مہاجرین وانصار نے آپ کی بیعت کر لی تھی اور اس طرح خلافت منعقد ہوئی تھی۔۔۔۔۔ بعض (اہل علم) کی رائے ہے کہ یوم شوریٰ اصحاب شوریٰ نے ہی جناب علی مرتضیٰؑ کو خلافت کے لئے منتخب کر لیا تھا اور اسی انتخاب کا نفاذ اب ہو کر آپ کی خلافت منعقد ومنتظم ہو گئی"۔ (ازالۃ الخفاء ص: ۱۴ ج: ۱)

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں تحریر فرماتے ہیں:

" ومن اعتقاد اهل السنة والجماعة ان ماجرى بين معاويه وعلى من الحروب فلم يكن من المنازعة فى الخلافت للا جماع علىٰ حقيتها بعلىؓ "۔

"یعنی: معاویہ اور علی میں جو محاربات درپیش ہوئے وہ خلافت کی نزاع نہ تھی کیونکہ اہلسنت کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰؑ کی خلافت کے برحق ہونے پر اجماع ہو چکا تھا"۔

یہاں علامہ ابن حجر کے الفاظ " للاجماع علىٰ حقيتها بعلىؓ " نے حقیقت حال کو بوجہ احسن واضح کر دیا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی، فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

" فبايعه المهاجرون والانصار و كل من حضر وكتب ببيعة الى الا فاق فاذعنوا كلهم الا معاويه فى اهل الشام"۔

"ترجمہ: جناب علی مرتضیٰؑ کی بیعت جمیع حضار اور مہاجرین وانصار اور تمامی موجودین وحاضرین مدینہ نے بیعت کر لی اور اس بیعت کی اطلاع تمام عالم اسلام میں کر دی گئی اور اس بیعت پر ہر طرف سے صدائے سمعنا و اطعنا وصد قنا بلند ہوئی سوائے ایک معاویہ کے جو اہل شام میں سے تھے"۔

جونہی جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے مسند خلافت کو زینت بخشی ہر طرف سے اصحاب رسولِ مقبول ودیگر مسلمانان امت نے مبارکباد کا سلسلہ شروع کیا اور عقیدت وتہنیت کا اظہار بآواز بلند اس طرح کیا۔

والله يا امير المومنين لقد زينت الخلافة وما زانتك ورفعتها و ما رفعتك وهى كانت احوج اليك منها اليها۔ (اسد الغابہ)

" یعنی قسم ہے خدا کی اے امیر المومنین آپ ہی نے خلافت کو زینت بخشی خلافت نے آپ کو زینت نہیں بخشی۔ آپ نے خلافت کو رفعت بخشی اور خلافت سے آپ کو کوئی رفعت حاصل نہیں ہوئی۔ خلافت کو آپ کی زیادہ احتیاج تھی آپ کو اس کی احتیاج نہ تھی۔"

یہ ناصبی کس اجماع کی بات کرتے ہیں اگر ان کے خیال میں اجماع سے مراد یہ ہے کہ امت کا کوئی ایک فرد بھی بیعت عامہ سے خارج نہ ہو تب ہی اجماع کہا جائیگا تو یہ مفروضہ قطعی غلط اور ناممکن ہے۔ علمائے اہلسنت نے خود ہی اس کی وضاحت کی ہے جیساکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے بھی اجماع کی حقیقت واضح ہوتی ہے:

"اجماع سے جو جابجا ذکر کیا گیا ہے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ کل مجتہدین عصر نے کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہو اس لئے کہ یہ صورت امر واقع کے خلاف ہے نہ اب تک ایسا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ یہ بات محالات عادیہ میں سے ہے کہ کسی مسئلے پر کل اہل الرائے بالاتفاق ایک ہی رائے قائم کریں۔" (ازالۃ الخفاء ص: ۶۴ حصہ: ۱)

فی الواقع بات بھی یہی ہے جس خلافت پر نظر ڈالیں مخالفت وموافقت غرض ہر قسم کے مناظر پیش نظر ہوتے ہیں بعض افراد کا اختلاف قادح حقیقت خلافت نہیں ہو سکتا۔ اگر بعض کے اختلاف کو اہمیت دی جائے تو شاید خلافت راشدہ ہی سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس مقام پر دوسرے ایک مسئلہ شرعی کی وضاحت بھی ضروری ہے اور یہ کہ بعض حالات میں ارباب حل وعقد میں سے کسی ایک فرد سے بھی خلافت کا انعقاد واقع ہونا ممکن ہے اور سراسر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جیساکہ شارح المقاصد علیہ رحمہ نے ارشاد فرمایا:

" ان ذلك الحصول لا يفتقر الى الاجماع من جميع الاهل الحل والعقد بل الواحد والاثنين من اهل الحل والعقد كاف كعقد عمر لابى بكر وعقد عبدالرحمن العثمان"۔

" یعنی جمیع اہل حل وعقد کے اتفاق پر ہی انعقاد خلافت منحصر نہیں ہے بلکہ اہل حل وعقد میں سے ایک دو اشخاص بھی خلافت منعقد کرانے کیلئے کافی ہیں جیسے کہ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کی خلافت منعقد کی اور حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان کی خلافت منعقد کی۔"

اس کے بعد اگر جناب علی مرتضیٰ کی خلافت کے انعقاد پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف ایک دو اہل حل وعقد بلکہ جملہ مہاجرین وانصار وکل ماحضر واقصائے ممالک اسلام دور دراز گوشوں تک سے عام

پسندیدگی کی بناء پر اس بیعت مبارک کی تکمیل ہوئی اور سوائے معاویہ کے کسی طرف سے بھی صدائے انکار بلند نہیں ہوئی۔ خلیفہ برحق کے مقابل ہو کر امیر معاویہ نے اعلان جنگ کر دیا اور باتفاق جمیع امت یہ باغی قرار دیئے گئے۔

اب ہم اس رُوداد کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے حوالے سے نقل کرتے ہیں مولانا صاحب نے حقیقت حال کو نہایت واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اُس وقت اُن چھ اصحاب میں سے چار موجود تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت امت کے مقدم ترین اصحاب قرار دیا تھا۔ ایک حضرت علیؑ دوسرے حضرت طلحہؓ تیسرے حضرت زبیرؓ چوتھے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ ان میں سے حضرت علیؑ ہر لحاظ سے پہلے نمبر پر تھے۔"[1]

اس لئے یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ خلافت کیلئے انہی کی طرف رجوع کرتے۔ صرف مدینہ ہی میں نہیں، پوری دنیائے اسلام میں دوسرا کوئی شخص ایسا نہ تھا جسکی طرف اس غرض کے لئے مسلمانوں کی نگاہیں اٹھتیں۔ حتیٰ کہ اگر آج کے رائج طریقوں کے مطابق بھی کوئی انتخاب کر لیا جاتا تو لازماً عظیم اکثریت کے ووٹ انہی کو حاصل ہوتے۔[2] چنانچہ تمام معتبر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور دوسرے اہل مدینہ انکے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یہ نظام کبھی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کیلئے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے" اور آج آپکے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کیلئے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] البدایہ والنہایہ ص: ۱۳۶ ج: ۷، [2] امام احمدؒ بن حنبل کہتے ہیں کہ اُس وقت حضرت علیؑ سے بڑھ کر کوئی شخص خلافت کے لئے حق نہ تھا۔ البدایہ والنہایہ ص: ۱۳۰ ج: ۸

کے ساتھ قرب کے اعتبار سے" انہوں نے انکار کیا اور لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے کہا "میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی' عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے"۔ پھر مسجد نبوی میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صحابہ میں سے ۱۷ یا ۲۰ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی۔[1]

اس رُوداد سے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت علیؓ کی خلافت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک انہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافت راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوئے۔ انھوں نے خلافت حاصل کرنے کیلئے برائے نام بھی کوشش نہیں کی۔ لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا۔ صحابہ کی عظیم اکثریت نے انکے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور بعد میں شام کے سوا تمام بلاد اسلامیہ نے ان کو خلیفہ تسلیم کیا۔ اب اگر حضرت سعدؓ بن عبادہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو ۱۷ یا ۲۰ صحابہؓ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا سکتی ہے۔ علاوہ بریں۔۔۔ کیا مقابلے میں کوئی دوسرا خلیفہ تھا جسکے ہاتھ پر انہوں نے جوابی بیعت کی ہو؟ یا ان کا کہنا یہ تھا کہ اب امت اور مملکت کو بے خلیفہ رہنا چاہیئے؟ یا یہ کہ کچھ مدت تک خلافت کا منصب خالی رہنا چاہیئے؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی' تو محض انکے بیعت نہ کرنے کے یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں کہ اکثریت اور عظیم اکثریت نے جسکے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ جائز طور پر فی الواقع خلیفہ نہیں بنا۔ (خلافت و ملوکیت ص: ۱۲۱)

[1] الطبری ص: ۴۵۰ ج: ۳' البدایہ والنہایہ ص: ۲۲۵ ج: ۷

مختصر یہ کہ اہل سنت کے جید علمائے اکرام کے مذکورہ بیانات سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیعت خلافت حقہ قاتلین عثمانؓ کی بیعت سے ہرگز منعقد نہیں ہوئی جیساکہ ناصبی بیان کرتے ہیں بلکہ اکابر صحابہ' تمام مہاجرین وانصار' موجودین مدینہ اور جمیع مسلمین عراق و عرب وغیرہ کی بیعت سے خلافت مرتضوی کا انعقاد وانتظام ہوا تھا۔ امیر معاویہ کی جماعت اس بیعت سے خارج رہی جو جماعت بغاہ شام کہلاتی ہے۔ تمام افاضل واکابر' تمام مہاجرین وانصار' تمام اعیان واشراف اور تمام عوام حجاز و عراق بطیب خاطر حضرت علیؓ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ایک جماعت مخالفین عثمانؓ (نہ کہ قاتلین عثمان) جن میں ایک کثیر جماعت صحابہ کی بھی تھی' نے بھی آپ کی بیعت میں دیگر صحابہ و عوام کے ساتھ شرکت کی تھی۔ جملہ کتب تاریخ کے مرقومات سے یہ بھی ثابت ہے کہ جناب علی مرتضیٰ اپنی طرف سے خلافت کے خواہشمند ہرگز نہ تھے اور نہ ہی اس کو حاصل کرنے کیلئے آپ نے کوئی تگ ودو کی۔ بلکہ اصحاب رسول' جماعت عشرہ مبشرہ' اصحاب بدر' مہاجرین وانصار اور عام مسلمانوں کے باربار استدعا کرنے پر آپؐ نے امت کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیعت لینے پر آمادگی کا اظہار فرمایا۔ اور مسجد نبوی میں اجتماع عام نے آپکی بیعت کی گئی۔

فتوحات ملکی : ابن تیمیہ کے بیان کے دوسرے حصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خلفائے ثلاثہ نے کفار کے مقابل جہاد کئے اور ممالک فتح کئے مگر علیؓ نے کوئی ملک فتح نہیں کیا بلکہ مسلمان آپس ہی میں لڑتے رہے۔ اس بیان سے جناب علی مرتضیٰؓ کی عدم صلاحیت ونااہلیت کی غمازی ہوتی ہے۔ اور اس بیان سے واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ناصبیوں کے نزدیک جناب علی مرتضیٰؓ میں منصب امامت وخلافت کی صلاحیت و قابلیت نہیں تھی اور آپ خلافت کے ہرگز اہل نہ تھے۔ خصوصاً ایک اعلیٰ درجہ کے خلیفہ میں جو تدبر امور سیاسی' اقامت احکام الٰہی'

انعقاد احکام امر و نواہی اور فتوحات ملکی وغیرہ کی ہونی چاہیئے وہ آپ میں موجود نہ تھا۔

پس سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ منصب خلافت کے اہل تھے یا نہ تھے۔ ان اعتراضات واہیہ کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ افاضل صحابہ و جمیع اہل حل و عقد اور دیگر مومنین و مخلصین و حاضرین بلاد و امصار نے آپ کی بیعت قابلیت اور صلاحیت ہی کی بنیاد پر کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ نظریہ مردود اور خطرناک ہے۔ خاتم المحدثین جناب شاہ عبدالعزیز صاحب اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

"بالجملہ اجماع اہلسنت است براں کہ تکفیر کنندۂ حضرت امیر یا منکر بہشتی بودن ایشاں یا منکر لیاقت خلافت ایشاں باعتبار اوصاف دینی مثل علم وعدالت و تقویٰ و ورع کافر است ۔۔۔۔ وعلوئے درجہ ایمان حضرت امیر و بہشتی بودن ایشاں ولائق خلافت پیغمبر بودن از روئے احادیث بلکہ آیات قطعیہ متواترہ ثابت است پس منکر ایں امور کافر باشد"۔ (تحفہ اثنا عشریہ ص: ۷۶۵)

ترجمہ :" تمام اہل سنت کا اس امر پر اجماع ہے کہ حضرت امیر کی تکفیر کرنے والا یا آپ کے جنتی ہونے کا منکر یا باعتبار اوصاف دینی جیسے علم وعدالت و تقویٰ و ورع آپ کی اہلیت کا انکار کرنے والا کافر ہے۔۔۔ اور حضرت امیر کا بلند درجہ ایمان پر فائض ہونا' جنتی ہونا اور خلافت پیغمبر کا اہل ہونا از روئے حدیث بلکہ آیت قطعیہ متواترہ سے ثابت ہے پس ان امور کا منکر کافر ہے۔"

نواصب کا بڑا اعتراض جناب علی مرتضیٰ کی بابت یہی ہے کہ آپ نے ہمسایہ کفار ممالک کے خلاف جہاد بالسیف کا کوئی اقدام نہیں کیا جس کے باعث مملکت اسلامیہ میں توسیع نہ ہو سکی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسے اقدام کی کوئی جائز وجہ پیدا ہو گئی تھی؟ فی الواقع اگر کوئی وجہ جائز پیدا

ہو چکی تھی پھر بھی آپ نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا تو بیشک یہ اعتراض قابل وقعت ہوگا۔ خلیفہ وقت کا اولین فریضہ یہ ہے کہ خدا اور سول کے احکام کی تعمیل' اجراء و نفاذ کرائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ احکام الٰہی کے تحت ہم کن کن حالات میں قتال بالسیف کیلئے محکوم کئے گئے ہیں۔ قتال بالسیف کے جواز کیلئے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ احکام موجود ہیں۔ جن میں سے چند ارشادات یہ ہیں :

" وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (سورۃ البقرۃ آیت :۱۹۰)

ترجمہ :" جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو اور اپنی طرف سے زیادتی نہ کرو اللہ ان کو دوست نہیں رکھتا جو زیادتی کرتے ہیں۔"

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (سورۃ توبہ آیت :۳۶)

ترجمہ :" جس طرح سب مشرکین تم سے قتال کرتے ہیں تم سب بھی ان سے قتال کرو اور جان لو کہ اللہ متقیوں (ظلم سے بچنے والوں) کے ساتھ ہے۔"

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ○ (سورۃ البقرۃ آیت :۱۹۳)

ترجمہ :" اگر وہ (فتنہ وقتال) سے باز آجائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہیں بجز ظالموں کے"۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ عَلَيْهِمْ ○ (سورۃ النساء آیت :۹۰)

ترجمہ :" پس اگر وہ (مخالفین) تم سے کنارہ کشی کر لیں اور تم سے

قتال نہ کریں اور صلح کا پیغام دیں تو ان پر زیادتی کرنے کی اللہ نے تمہارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی۔

وَاِنْ جَنَحو لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَا لسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (سورۃ انفال آیت: ٦١)

ترجمہ: "اور (اے پیغمبر) اگر وہ (مخالفین) صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ وہ سمیع و علیم ہے۔"

منقولہ بالا آیات قرآنی سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بلا جائز وجہ کے قتال کی ممانعت فرمائی ہے البتہ اگر مشرکین جنگ کریں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں قتال کریں مگر اپنی طرف سے زیادتی نہ کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدافعانہ حیثیت سے ہی قتال کی اجازت دی ہے۔ بلا کسی جائز وجہ کے اسلام کے نام پر ہمسایہ ممالک سے جنگ کرنا' قتل و غارت کا بازار گرم کرنا' وہاں کی بے قصور رعایا کو بے دریغ تہہ تیغ کرنا اور وہاں کے لوگوں کو بلاوجہ وبلا خطا لونڈی غلام بنانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ مدافعانہ جنگ کا جواز پیدا ہونے کی بھی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں مثلاً کوئی غنیم اسلامی ملک پر حملہ آور ہو جائے یا مثلاً فریق ثانی کسی سابقہ معاہدہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو جائے۔ اگر حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہر وہ جنگ جو عہد نبوی یا عہد خلافت راشدہ لڑی گئی وہ کسی نہ کسی ایسے ہی واقعہ پر مبنی ہے ان میں سے کوئی ایک جنگ بھی محض ملک گیری کے جذبہ کے تحت نہیں لڑی گئی اور لازمی نتیجے کے طور پر ان جنگوں سے مملکت اسلامیہ میں توسیع بھی ہوئی۔

اب ان اعتراض کرنے والے نواصب سے کوئی یہ پوچھے کہ حضرت علی مرتضیٰؑ کے زمانہ خلافت راشدہ میں مملکت اسلامیہ کے کس حصہ پر کس غنیم نے کب حملہ کیا جس کا مقابلہ کرنے میں حضرت علی کرم

اللہ وجہہ نے معاذ اللہ غفلت کا مظاہرہ کیا۔ یا کون سی حکومت نے اسلامی ریاست سے کسی سابقہ معاہدہ کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا جسے حضرت علی مرتضیٰؑ نے معاذ اللہ کسی کمزوری' کاہلی یا غفلت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہو جس کے باعث دولت اسلامیہ کو نقصان پہنچا اور اغیار میں سے کسی کو چیرہ دستی کا موقع مل گیا۔ تاریخ اسلام کے اوراق تمام عالم کے روبرو کھلے ہوئے ہیں کوئی بھی انھیں دیکھ کر بتائے کہ جناب علی مرتضیٰؑ کے عہد خلافت راشدہ میں کسی غیر سلطنت کو خلیفہ اسلام کی کمزور حکمت عملی سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ کب اور کہاں پہنچا۔

جناب علی مرتضیٰؑ کے پونے پانچ سالہ مختصر دور خلافت میں اپنوں ہی کی مخالفانہ و باغیانہ سرگرمیوں نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ آپ کی خلافت کے روز اوّل ہی سے قصاص حضرت عثمانؓ کا نعرہ بلند کر کے ملت اسلامیہ کو انتشار و افتراق کی راہ پر لگا دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ نعرہ صرف نعرہ ہی تھا کیونکہ اس نعرہ کے بانیوں نے جب اقتدار حاصل کر لیا تو پھر نہ ہی یہ نعرہ انہیں یاد رہا اور نہ ہی کسی نے حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے کی کوشش کی۔ بہر حال حضرت علیؑ اپنے پورے دور خلافت میں ان بغاوتوں کو فروع کرنے میں لگے رہے جو تین طرف سے آپ پر مسلط کی جاتی رہیں لہٰذا آپ کو اتنا موقع ہی نہ ملا کہ کسی اور طرف توجہ فرماتے۔

مزید برآں یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آپ کے دور خلافت میں کسی دوسری سلطنت نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے اس پر فوج کشی کی ضرورت پیش آتی۔ اس کے باوجود جہاں اس کی ضرورت محسوس ہوئی فوراً بارگاہ مرتضوی سے اس کے تدارک کے احکام جاری ہوئے جیسے سندھ میں سرکشی کا ایک دو واقعات ہوئے جن کی تفصیل اس طرح ہے:

۳۶ھ میں واقعہ جمل کے بعد اصحاب جمل میں سے مسکہ بن عتاب

حبطی نے سیستان پہنچ کر تمام صوبہ پر قبضہ کر لیا اور ایک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ جب حضرت علیؑ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے عبدالرحمٰن بن جرد طائی کو سرکوبی کیلئے روانہ کیا۔ عبدالرحمٰن جنگ میں مارے گئے تب عبداللہ بن عباس والئی بصرہ نے جو مشرقی ممالک کے حاکم اعلیٰ تھے' چار ہزار فوج کے ساتھ ربعی بن کاس عنبری کو ابن عتاب کی سرزنش کیلئے روانہ کیا۔ جس نے جاتے ہی فتح حاصل کی۔ ابن عتاب مارا گیا اور سستان پر ربعی کا قبضہ ہو گیا۔[1]

سندھ ہی کا ایک دوسرا واقعہ ۳۸ھ میں پیش آیا جس کیلئے جناب علی مرتضیٰؑ نے ثاغر بن دعورا کو سرحدی حملہ کیلئے روانہ کیا۔[2] یہ ایک بڑی فوج لیکر جس میں حارث بن مرۃ العبدی جیسے تجربہ کار لوگ بھی تھے اور تمام ساز و سامان حرب بھی ساتھ تھا۔ یہ فوج تمام سرحدی علاقے اور مقامات فتح کرتے ہوئے کوہستان (قیقان ☆) کے پاس جب آئے تو بڑا سخت معرکہ پیش آیا کیونکہ بیس ہزار قیقانی تمادزوں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھے۔ یہاں اگرچہ سخت لڑائی ہوئی مگر ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے بوقت جنگ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر ایک دفعہ اس زور سے بلند کیا کہ اس کی ہیبت سے لوگ کانپ اٹھے۔ اور قیقانی خود بخود منتشر ہو گئے' مسلمانوں نے جنگی قیدی کثیر تعداد میں گرفتار کئے جن کی تعداد ہزاروں میں بتائی جاتی ہے۔[3]

اُدھر ربعی عنبری کچھ ہی دنوں آرام سے بیٹھنے پائے تھے کہ پھر بغاوت شروع ہو گئی۔ جاریہ بن قدامہ کے مشورہ سے امیر المومنین حضرت علیؑ نے زیاد کو یہاں کا حاکم بنایا جس نے ۳۹ھ میں خراساں پہنچ کر ان ممالک کا بہترین انتظام کیا۔[4]

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ خلیفہ برحق حضرت علی مرتضیٰؑ نے انتہائی

☆ قیقانی (کیکانی) سندھ کا وہ حصہ ہے جو خراساں سے ملتا ہے اور آج اس کو قلات کہتے ہیں (بلاذری ص: ۴۳۲ لندن)

[1] ابن اثیر ص: ۲۱۸ ج: ۳' [2] چچ نامہ قلمی ص: ۴۳' [3] ابن اثیر ص: ۳۲۱ ج: ۳

خراب اور غیر موافق حالات میں بھی فتوحات بیرونی علاقہ جات کا سلسلہ جاری رکھا جو ناقدین و ناصبین کو نظر نہیں آیا۔ الغرض تاریخ سے ثابت ہے کہ جناب علی مرتضیٰؑ سے تعلقات ممالک غیر و دیگر امور خارجہ میں ہرگز کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی اللہ رب العزت کا کرشمہ ہے کہ اہل غرض مخالفوں و باغیوں اور دیگر اشرار کی پیہم ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کے باوجود کسی غیر مملکت کے حکمران کو سلطنت اسلامیہ پر خلافت حقہ مرتضوی کے دوران بری نظر ڈالنے کی جرات نہ ہو سکی۔

جہاں تک خانہ جنگی یا اندورنی خلفشار کا تعلق ہے تو اس کی بابت اہلسنت والجماعت کا بلا استثنیٰ اتفاق ہے کہ اس تمام خانہ جنگی میں جناب علی مرتضیٰؑ برسر حق تھے پھر اللہ کے رسول کا ارشاد حقیقت بنیاد موجود ہے۔ یاعلی انّكَ تقاتل علیٰ تاويل القران كماقاتلت علیٰ تنزيله "یعنی اے علی تم اس طرح تاویل قرآن پر قتال کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر قتال کیا۔" جناب رسالتمآبؐ کے اس بیان سے ثابت ہے کہ جس طرح پیغمبر آخر الزماںؐ نے تنزیل قرآن جنگیں کیں اسی طرح حضرت علیؑ نے تاویل قرآن پر جنگیں کیں بالفاظ دیگر جسطرح نبی اللہ کی حروب سراسر جائز' برمحل اور ضروری تھیں بالکل اسی طرح وصی رسول اللہ کی حروب بھی سراسر جائز' برمحل اور ضروری تھیں۔ نیز حدیث رسول کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہر فعل عین حق ہے ارشاد پیغمبرؐ ہے کہ اللهم ادار الحق معه حيث دار یعنی خداوندا حق کو اس طرف پھیر دے جس طرف علیؑ پھرے۔ کیا شان ہے علی مرتضیٰؑ کی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعاء کر رہے ہیں کہ پروردگار حق کو ادھر پھیر دے جدھر علی پھرے۔ رسالتمآبؐ نے یہ التجا نہیں فرمائی کہ خدایا علیؑ کو ادھر پھیر دے جدھر حق پھیرے۔ اس فضیلت و عظمت علی ابن ابطالب نے آپ کی

شان کو بلند ترین مقام پر پہنچادیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ناصبی اپنی شرشت سے باز نہ آئے تو اس کو اللہ ہی راہ راست پر لا سکتا ہے۔

تقریباً گذشتہ ربع صدی سے ہمارے ملک خداداد میں ناصبیت کا فتنہ زور پکڑتا جارہا ہے۔ چوں کہ یہ ناصبی اپنے آپ کو سنی ظاہر کرتے ہیں اور اہلسنت والجماعت کی صفوں میں داخل ہو کر بڑے مُؤثر انداز میں اپنے عقائد کا پرچار کرتے ہیں جس سے ہمارے بھولے بھالے سنی بھائیوں کا عقیدہ متاثر ہوتا ہے۔ جہاں تک اہل تشیع کا تعلق ہے تو وہ بفضل تعالیٰ اپنے عقائد میں مضبوط ہیں اور اس امر سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جو لوگ خلیفہ برحق حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہلبیت اطہار کی مخالفت اور خاندان بنی امیہ کے سفیانی و مروانی حکمرانوں کی قصیدہ خوانی کرتے ہیں وہ ہرگز اہلسنت نہیں ہیں۔ لہٰذا محبان رسولؐ واہلبیت رسول اور شیدائیان اسلام' اہلسنت اور اہل تشیع ہر دو مسلک کے علماء اکرام اور مشائخ عظام کا دینی فریضہ ہے کہ باہمی اتحاد و تعاون سے اس فتنہ کا سدباب کریں اور باہمی اتحاد و اتفاق کو فروغ دینے کی کوششیں فرمائیں۔

القرآن الحکیم

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وہ مقدس کتاب ہے جسے پروردگار عالم نے اپنے محبوب ترین بندے حضرت محمد مصطفیٰ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا۔ یہ کتاب دیگر کتب مقدسہ کی طرح دفعتاً یکبارگی نازل نہیں کی گئی بلکہ وقتاً فوقتاً موقع موقع سے تیئیس سال تک نازل کی جاتی رہی۔ پہلے مکہ میں رمضان ۱۳ قبل ہجرت تا ربیع الاول ۱ھ یعنی تیرہ سال پھر مدینہ میں ربیع الاول ۱ھ تا ربیع الاول ۱۱ھ یعنی دس سال تک نزول کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے تذکرے مختلف افراد کے واقعات' نصائح' بعض اہم عقائد' کچھ مسائل فقہی' زمانہ کے نشیب و فراز کے تذکرے اور بعض دیگر امور پر تبصرے مرقوم ہیں اور مختلف اقسام کی چیزوں کی خلقت پر تبصرہ کر کے ذہن انسانی کو خدا نے اپنی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ اللہ رب کریم نے قرآن کریم کو ایسا فصیح و بلیغ بنا کر نازل کیا کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود کفار و مخالفین اس کے ایک سورہ کا مثل بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ قرآن نہ مکمل نثر ہے نہ شاعری بلکہ اس کا انداز تخاطب انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین انسان اور قرآن مجید بہترین کلام بلکہ معجزہ ہے۔

قرآن سراسر حق ہے اور انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں نازل ہوا اور جن الفاظ کے ساتھ ختمی مرتبتؐ نے امت مسلمہ کے سامنے پیش کیا۔

قرآن اول سے آخر تک تعلیمات الٰہی سے لبریز اور جہالت و گمراہی سے یکسر پاک ہے۔ اسکی تعلیمات عام اور پوری انسانیت کیلئے ہیں جو ہر زمانہ' ہر ملک اور ہر قوم کی رہنمائی کیلئے ہیں۔ یہ کتاب عالمگیر بھی ہے اور جاوداں بھی۔

قرآن میں وہ خصوصیات ہیں جو کسی کتاب میں ممکن ہی نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے چند اہم خصوصیات درج ذیل ہیں :

۱) خدا کا یہ کلام ہر تحریف و تقسیم سے پاک و محفوظ ہے۔
۲) خدا کی یہ واحد کتاب ہے جو اپنے نزول سے دور حاضر تک اپنی زبان و بیان کے لحاظ سے بھی زندہ و تابندہ ہے اور اپنی ہدایت و رہنمائی کے اعتبار سے بھی سرچشمۂ ہدایت ہے۔
۳) خدا کی اس کتاب کے کسی لفظ' کسی حکم' کسی اصول' کسی بیان' کسی تعلیم اور کسی بات میں کوئی شک' ریب یا تذبذب کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا ہے۔
۴) خدا کی یہ کتاب جس طرح الفاظ کے لحاظ سے معجزہ ہے اسی طرح اسلوب معانی و مضامین کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔
۵) خدا کی یہ کتاب زندگی کے ٹھوس حقائق و معاملات سے بحث کرتی ہے اور پوری انسانیت کو عبادتِ خداوندی کے نقطہ پر جمع ہونے کی دعوت دیتی ہے۔
۶) خدا کی یہ کتاب زندگی کا مکمل نظام اور کامل دستور پیش کرتی ہے جو دنیوی و اخروی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔
۷) خدا کی یہ کتاب اپنے اندر بے پناہ اثرانگیزی رکھتی ہے اور قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔

الغرض قرآن وہ پہلی اور آخری کتاب ہے جو بنیادی طور پر ان مسائل پر بحث کرتی ہے کہ اس زمین پر انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا

مقام کیا ہے؟ اس کی زندگی کی نوعیت اور اس کا مقصد حیات و نصب العین کیا ہے؟ یعنی یہ کتاب سرچشمہ ہدایت اور بنی نوانسان کی رہنمائی کا بہترین مظہر ہے جو رہتی دنیا تک ہر زمانہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر دور میں اس مقدس و اعلیٰ کتاب کو سمجھنے والوں کا فقدان ہی رہا ہے۔ بعض افراد نے اپنی عقل کو پیمانہ قرار دیتے ہوئے عوام کو قرآن سمجھانے کی کوشش کی اور اقوال پیغمبرؐ کو نظر انداز کرتے رہے۔ بعض اپنی مرضی کے مطابق استدلال کر کے عوام الناس سے داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ قرآن کی اصل غایت ہدایت ہے اور قرآن کے نزول کا بنیادی مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ اس کے ذریعے تزکیۂ نفس کیا جائے۔ قرآن نور ہدایت ہے' نصاب و قوانین کا مخزن ہے' معارف کا خزانہ اور حقائق کا گنجینہ ہے۔ قرآن کی بابت باب علم لدنی اور وارثِ قرآن حکیم حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ :

> "یقین جانو یہ قرآن وہ ناصح ہے جو دھوکا نہیں دیتا اور وہ رہنما ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا اور وہ بات کرنے والا ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جو کوئی بھی اس قرآن کا ہم دم بنا اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی۔ زیادتی ہدایت میں اور کمی ذلالت میں۔ اور یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج نہیں رہ سکتی اور قرآن کے بغیر استغنا ناممکن ہے اس کو تم اپنے امراض کیلئے شفا اور اپنی مصیبت کے وقت مددگار پاؤ گے۔ اس میں سب سے بڑے مرض کی شفا موجود ہے جس کا نام کفر اور نفاق' کوربالطنی اور گمراہی۔ خدا سے قرآن کے ذریعہ سوال کرو۔ اس کی محبت کیساتھ اس کی بارگاہ کی طرف رخ کرو۔ لیکن اس قرآن کو مخلوق کے پاس رشوت ستانی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بیشک خدا کی بارگاہ میں اس سے بڑھکر کوئی وسیلہ نہیں۔ یقین جانو یہ قرآن

شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت ضرور قبول کی جائے گی۔ جس کی سفارش قرآن کردے گا اس کی سفارش منظور ہو گی اور جس کی شکایت قرآن کردے گا اس کی شکایت مسموع ہو گی۔ روز قیامت آواز دیجائے گی کہ ہر انسان اپنی کاشت کے حساب میں مبتلا ہو گا سوائے اس شخص کے جس نے کشتِ قرآن کو سیراب کیا ہو۔ پھر کیوں نہ تم سب لوگ کشت قرآن کے کارندے اور اتباع ہو جاؤ۔ اور اس قرآن کو اپنے رب کی جانب اپنا رہنما قرار دو اور اپنے نفسوں کے خلاف اس کی نصیحتوں کو قبول کرو۔ اور اسکے مطالب میں خود اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو۔ اور اپنے خواہشات نفس کو خود فریبی سمجھو۔"

" قرآن کی تعلیم حاصل کرو اس لئے کہ وہ بہترین کلام ہے۔ اور اس کے احکام سمجھنے کی کوشش کرو اس لئے کہ وہ کشت دل کے لئے بہار ہے اور اس کی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو۔ اس لئے کہ وہ سینوں کے لئے شفا ہے اس کی تلاوت کرو کیونکہ وہ بہترین واقعات کا تذکرہ ہے۔" (دین فطرت ص:۱۲۹' ۱۲۸)

ہم کو چاہیئے کہ ہم قرآن حکیم کو روزانہ پڑھیں۔ جس گھر میں قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہے شیاطین اس گھر سے دور رہتے ہیں اور پڑھنے والا بہت سی بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ وہ قرآن جو لوگوں کے گھروں میں رکھا ہو اور اسکی تلاوت نہ کی جائے وہ روز قیامت خدا سے شکایت کرے گا۔ جن چھ چیزوں سے مومن کو مرنے کے بعد فائدہ حاصل ہوتا ہے ان میں ایک قرآن ہے جو اسکے بعد اس کے گھر پڑھا جائے۔

حروف مقطعات: قرآن کریم کے انتیس سوروں کی ابتداء میں ایک مخصوص ترتیب کیساتھ کچھ حروف تہجی استعمال ہوئے ہیں مثلاً "الم" جو پڑھتے وقت الگ الگ حروف کی شکل میں "الف ل م" پڑھے جاتے ہیں

اسی لئے یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں ان حروف کو فواتح سورہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حروف اسرار الہیہ میں سے ہیں جن کا علم نبیؐ اور امامؑ کے سوا کسی کو نہیں دیا گیا۔ ان حروف مقطعات کی تعداد ۱۴ ہے اور ان میں جو حروف تہجی استعمال ہوئے وہ کل ۸۴ ہیں جن میں بہت سے حروف مکرر ہیں اگر ان مکررات کو حذف کر دیا جائے تو باقی رہ جانے والے حروف کی تعداد بھی ۱۴ ہی بنتی ہے۔ وہ حروف یہ ہیں: ص ر ا ط ع ل ی ح ق ن م س ک ہ ان چودہ حروف سے بہت سی عبارتیں بنتی ہیں مگر یہ اعجازی شان ہے کہ سوائے صراط علی حق نمسکہ یعنی: " علیؑ کا راستہ حق ہے ہم اسی پر قائم ہیں" کی عبارت کے سوا بقیہ تمام عبارتیں مہمل بنتی ہیں۔ لوگوں نے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس اعجازی شان کو مٹانے کی بڑی کوششیں کیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

حضرت علیؑ
قرآن کی روشنی میں

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل آفتاب و ماہتاب سے زیادہ روشن اور مشہور ہیں جن کا ذکر کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ میں کثرت سے کیا گیا ہے قرآن حکیم میں حضرت علیؑ کی شان میں اتنی کثیر آیات نازل ہوئی ہیں کہ انکی صحیح تعداد کا تعین کرنا دشوار ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں کہا:

" خدا نے قرآن میں کوئی آیت فضیلت نازل نہیں فرمائی مگر یہ کہ علیؑ اس کے راس و رئیس ہیں۔" (تذکرہ الخواص ص: ۳۶)

ابن عبد البر نے استعیاب میں لکھا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ

" جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یاایھا اللذین امنوا کے خطاب سے مخاطب فرمایا ہے علیؑ اس خطاب کے امیر اور شریف ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے اصحاب پر بعض مقام میں عتاب کیا ہے مگر علیؑ کا ذکر خیر کیساتھ ہی کیا ہے۔" (ارجح المطالب ص:۵۹)

ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ' ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ

" خدا کی کتاب میں جس قدر آیتیں جناب علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں اس قدر کسی اور کی شان میں نازل نہیں ہوئیں"۔

(صواعق محرقہ ص:۷۶' کنز العمال ص:۱۵۳ ج:۶'
ریاض النضرہ ص: ۲۰۷)

ابوبکر ابن مردویہ کا بیان ہے کہ

" جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ قرآن مجید چار حصوں میں نازل ہوا ہے پس اس کا ایک ربع (چوتھائی) ہماری شان میں ہے۔ ایک ربع ہمارے دشمنوں کے حق میں ہے اور ایک ربع میں قصص اور امثال ہیں اور ایک ربع میں فرائض اور احکام ہیں اور ہماری شان میں قرآن مجید کی بزرگ آیتیں ہیں۔ (ارجح المطالب ص:۵۹)

ابن عساکر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ

" جناب امیر علیہ السلام کی شان میں تین سو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔" (صواعق محرقہ ص: ۷۰)

قرآنی آیات: حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے والی قرآنی آیات میں سے چند آیات درج ذیل ہیں:

وَالسّٰبِقُونَ الاَوَّلُونَ مِنَ المُهٰجِرِینَ وَالاَنصَارِ وَالَّذِینَ
اتَّبَعُوهُم بِاِحسَانٍ رَضِیَ اللهُ عَنهُم وَرَضُوا عَنهُ وَاَعَدَّ
لَهُم جَنّٰتٍ تَجرِی تَحتَهَا الاَنهٰرُ خٰلِدِینَ فِیهَآ اَبَدًا
ذٰلِكَ الفَوزُ العَظِیمُ ○ (سورۃ التوبہ آیت: ۹)

ترجمہ: اور مہاجرین و انصار میں سے (ایمان کی طرف) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے نیک نیتی سے (قبول ایمان میں) انکا ساتھ دیا خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے خوش اور انکے واسطے خدا نے (وہ ہرے بھرے) باغ جنکے نیچے نہریں جاری ہیں تیار کر رکھے ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر: اس آیت میں مہاجرین و انصار دونوں کی مدح ہے مگر سب کی نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کی جنھوں نے ایمان لانے میں پہل کی اور نیک نیتی سے ایمان کو قبول کیا۔ اہل اسلام کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے حضرت علیؑ نے نیک نیتی سے اسلام قبول فرمایا۔ (تفسیر در منثور' صواعق محرقہ وغیرہ)

مولانا ظفر حسن صاحب نے اس آیت کی تشریح میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت علیؑ تو پیدا ہی مسلمان ہوئے البتہ اعلان بعثت کے بعد سب سے پہلے آپ نے ایمان کا اظہار کیا تھا لہٰذا یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی۔ کلمۂ "رضی اللہ عنہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے خدا ان لوگوں سے خوش نہیں تھا جو حالت کفر اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد خدا ان سے راضی ہوا اور یہ رضائے الٰہی صرف اس وقت تک کسی سے متعلق رہ سکتی ہے جب وہ مرتے دم تک کوئی کام ایسا نہ کرے جو مرضی الٰہی کے خلاف ہو۔ خدا کا راضی رہنا تو بندوں کے اعمال پر موقوف ہے کسی کے لئے اس کی رضا دوامی سند نہیں ہے۔ چونکہ حضرت علیؑ نے کبھی کسی بت کو سجدہ کیا ہی نہ تھا لہٰذا آپ کے اسم گرامی کے ساتھ کلمۂ "رضی اللہ عنہ" کے بجائے "کرم اللہ وجہہ" کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تو ہمیشہ ہی سے ان سے راضی و خوش رہا ہے۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۲۶ ج: ۲)

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾

سورۂ الواقعہ آیت: ۱۰ تا ۱۲

ترجمہ: اور جو لوگ بڑھ جانے والے ہیں (واہ کیا کہنا) وہ آگے ہی بڑھنے والے تھے یہی لوگ (خدا کے) مقرب ہیں آرام و آسائش کے باغوں میں ہوں گے۔

تفسیر: نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکم رسولؐ پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے، جہاد میں سب سے آگے بڑھ کر حصہ لینے والے تھے۔ راہِ خدا میں سب سے بڑھ کر خرچ کرنے والے تھے۔ احیاء اسلام کی نشر و اشاعت میں سب سے آگے آگے تھے۔ صواعق محرقہ میں ہے کہ سبقت کرنے والے تین ہیں۔ حزقیل مومن آل فرعون

جس نے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی۔ حبیب نجار مومن آل یٰسین جس نے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی اور حضرت علی ابن ابیطالب جنہوں نے حضرت رسول خداؐ پر ایمان لانے میں سبقت کی اور یہ پہلے دونوں سے افضل ہیں کیونکہ آپؑ سید الانبیاء و مرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کرنے والے تھے۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۹۸ ج: ۵)

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

سورۂ الیوسف آیت: ۱۰۸

ترجمہ: کہہ دو میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرا پیرو (دونوں) مضبوط دلیل پر ہیں اور خدا (ہر عیب و نقص سے) پاک و پاکیزہ ہے اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔

تفسیر: یوں تو حضرت کا اتباع کرنے والے بےشمار تھے لیکن ان سب میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی کہ وہ بصیرت کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ بالکلیہ آنحضرتؐ کی اتباع کرنے والا علیؑ کے سوا کوئی نہیں پایا جاتا۔ کون نہیں جانتا کہ بچپن ہی سے حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے ساتھ رہے آپؐ کی پرورش میں رہے۔ اعلان بعثت سے پہلے تک ہر معاملہ میں آپؐ کے قدم بقدم چلے اور جب آپؐ مبعوث بر سالت ہوئے تو سب سے پہلے علیؑ ہی آپؐ پر ایمان لائے اور جب آیہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ (۲۶: ۲۱۴) نازل ہوئی تو سب سے پہلے آپؑ ہی نے حضورؐ کی نیابت کا اقرار کیا۔ جہادوں میں رسولؐ کی حفاظت سب سے زیادہ آپؑ ہی نے کی اور آنحضرتؐ کے بعد بھی جو دعوتِ اسلام و ایمان آپؑ نے لوگوں کو دی وہ بھی اسی طریقہ سے دی جو رسول خداؐ کا طریقہ تھا۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۹ ج: ۳)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

سورۂ الشعراء آیت: ۲۱۴

ترجمہ: (اے رسول) تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذاب خدا سے ڈراؤ۔

تفسیر: یہ آیت دعوت ذوالعشیرہ کے متعلق ہے اس واقعہ دعوت کا تاریخی تعلق تو ہم اس کتاب کی جلد دوئم میں تحریر کر آئے ہیں یہاں چند غور طلب امور پیش ہیں۔

۱) یہ اعلان بعثتِ رسالت کے بعد سب سے پہلا اعلان تھا، اور یہیں سے اعلان وزارت کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے بغیر کسی کو اپنا جانشین بنائے دنیا سے رحلت فرمائی ہو۔

۲) اس واقعہ کے ثبوت میں عبید اللہ بسمل امرتسری نے ارجح المطالب میں کتب اہلسنت سے بہت سے ثبوت پیش کئے ہیں نیز وزیر الدولہ خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب وزیر ریاست پٹیالہ نے اپنی تفسیر اعجاز التنزیل میں انگریز مورخین کے حوالے نقل کئے ہیں۔ اسکے علاوہ اس واقعہ سے متعلق روایات متعدد کتب مثلاً تفسیر درمنثور، مسند احمد ابن حنبل، ریاض النضرہ وغیرہ میں بھی مذکور ہیں۔

۳) اس دعوت میں سب سے پہلے رسول اللہؐ نے اپنی اعجازی شان دکھائی جو کھانا صرف ایک آدمی کے لئے بمشکل کافی ہو سکتا تھا اس سے چالیس آدمی شکم سیر ہو گئے اور کھانا جوں کا توں رہا۔ یہ دیکھ کر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔

۴) حضرت علیؑ کو معلوم تھا کہ آنحضرتؐ نے جو کھانا تیار کرانے کا حکم دیا ہے وہ سب کے لئے کافی ہوگا۔ اگر آپؑ کو حضورؐ کی نبوت پر ذرا بھی شک ہوتا تو ضرور دریافت کرتے کہ یا رسول اللہؐ اتنا ذرا سا کھانا چالیس

آدمیوں کے لئے کیسے کافی ہوگا۔ اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ شروع ہی سے حضرت علیؑ کا ایمان کیسا تھا۔

۵) حضرت رسول خداؐ نے دعوت کا اہتمام حضرت علیؑ سے صرف اسلئے مخصوص کیا تھا کہ یہ برکت صرف معصوم ہی کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے۔ ورنہ بنی ہاشم میں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔

(تفسیر القرآن ص: ۵۶ ج: ۴)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

سورۂ البقرۃ آیت: ۲۰۷

ترجمہ: اور لوگوں میں سے (خدا کے بندے) کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور خدا ایسے بندوں پر بڑا ہی شفقت والا ہے۔

تفسیر: احیاء العلوم، تفسیر ثعلبی، تفسیر القرآن وغیرہ میں اس آیت کی تفسیر کو تفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کفار مکہ نے حضرت رسول خداؐ کو قتل کرنے کی غرض سے آپؐ کے بیت الشرف کو گھیر لیا تو حکم خدا جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ "تم میری جگہ عبا اوڑھ کر سو رہو تا کہ لوگ سمجھیں کہ میں سو رہا ہوں اور میں باہر جاتا ہوں" حضرت علیؑ نے ارشاد پیغمبرؐ کی تعمیل کی اور آنحضرتؐ کے بستر پر سو رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی مدح میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۵۹ ج: ۱)

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ

سورۂ آل عمران آیت: ۱۵۲

ترجمہ: تم میں سے کچھ تو طالب دنیا ہیں (کہ مال غنیمت کی طرف جھک پڑے) اور کچھ طالب آخرت (کہ رسول پر اپنی جان فدا کر دی)

تفسیر: یہ آیت جنگ احد کے موقعہ پر اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان مالِ غنیمت پر جھک پڑے اور دشمن نے عقب کی گھاٹی سے حملہ کردیا۔ اس گھاٹی پر رسالتمآبؐ نے عبداللہ بن جبیر کو پچاس جوانوں کے دستہ کا سردار بنا کر متعین فرمایا تھا اور تاکید کی تھی کہ اسلامی لشکر کو فتح ہو یا شکست وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑیں۔ مگر دوسروں کو مالِ غنیمت لوٹتا دیکھ کر اس دستہ کے لوگ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسروں کے شریک ہوگئے گوکہ ابن جبیر نے انہیں بہت روکا' قول رسولؐ یاد دلایا مگر چند کے علاوہ سب لوٹ مار میں شریک ہوگئے۔ پشت سے دشمن نے اچانک حملہ کردیا جس سے فوج اسلامی کے پیر اکھڑ گئے۔ چند جانثاروں کے سوا سب نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس معرکہ میں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے۔ جناب رسالتمآبؐ کے دندان مبارک زخمی ہوئے۔ اس مشکل ترین وقت میں حضرت علیؑ نے حفاظت رسولؐ کی خاطر جان کی بازی لگادی۔ آپؑ کی جانثاری کو دیکھ کر حضرت جبرئیلؑ نے رسالتمآبؐ سے کہا "یارسول اللہؐ اس کو ہمدردی کہتے ہیں" آنحضرتؐ نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ انہ منی وانا منہ (یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں) حضرت جبرئیلؑ نے کہا وانا منکم (اور میں آپ دونوں سے ہوں) اس وقت غیب سے یہ آواز آئی۔ لَا سیف الا ذوالفقار ولافتیٰ اِلا علی۔[1]

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ

سورۂ الحدید آیت: ۲۵

ترجمہ: اور ہم ہی نے لوہے کو نازل کیا جس کے ذریعے سے سخت لڑائی اور لوگوں کے بہت سے نفع (کی باتیں) ہیں اور تاکہ خدا دیکھ

[1] تاریخ طبری ص: ۱۷ ج: ۳ مطبوعہ مصر

لے کہ بے دیکھے بھالے خدا اور اس کے رسولوں کی کون مدد کرتا ہے بے شک خدا بہت زبردست غالب ہے۔

تفسیر: اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ لوہے سے مراد تلوار ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی تلوار ہے جسے خدا نے نازل کیا تو سوا ذوالفقار کے کوئی دوسری تلوار اس کا مصداق نہیں ٹھہرتی۔ کیونکہ ذوالفقار ہی جنگ احد میں حضرت علیؑ کے واسطے نازل ہوئی اور اسی کی مدح میں جبرائیلؑ نے لَافتیٰ الا علی لاسیف اِلا ذوالفقار کی ندا بلند کی تھی۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۱۹ ج: ۵)

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

سورۂ البقرہ آیت: ۱۵۶

ترجمہ: اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو جن پر جب کوئی مصیبت آپڑے تو وہ (بیساختہ) بول اٹھے ہم تو خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

تفسیر: اس آیت کی شان نزول کی بابت مولانا فرمان علی صاحب نے تفسیر ثعلبی کے حوالے سے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ جب جنگ احد میں حضرت حمزہ علیہ السلام کی شہادت کی خبر حضرت علیؑ تک پہنچی تو آپؑ نے فرمایا "اِنَّاللّٰہ وَ اِنَّااِلیہ راجعون" اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ کلمہ سب سے پہلے اسلام میں حضرت علیؑ ہی کی زبان سے نکلا۔

(تفسیر ثعلبی حوالہ القرآن الحکیم ص: ۳۱)

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ

سورۂ آلعمران آیت: ۱۷۳

ترجمہ: اور کہنے لگے خدا ہمارے واسطے کافی ہے اور (وہ) کیا اچھا کارساز ہے۔

تفسیر: یہ واقعہ جنگ احد سے واپسی کے وقت کا ہے جب ابوسفیان نے میدان سے بھاگتے ہوئے نعیم بن مسعود اشجعی کو جو مدینہ آرہا تھا لالچ دیا اور کہا کہ اگر تم محمد (صلعم) کے لشکر میں جاکر یہ افواہ پھیلادو کہ "کفار مکہ بہت بڑے لشکر کیساتھ حملہ کرنے والے ہیں تم لوگ بھاگ جاؤ" تو میں دس اونٹ کا بار خرمہ اور سوکھے انگور تجھ کو انعام میں دونگا۔ جب نعیم یہ خبر لیکر لشکر اسلام میں پہنچا تو اس کے جواب میں حضرت علیؑ نے فوراً فرمادیا کہ کچھ پرواہ نہیں حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ خدا کو جناب علی مرتضیٰؑ کی یہ بات ایسی پسند آئی کہ یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۶۹ ج: ۱)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ

سورۂ الصف آیت: ۴

ترجمہ: خدا تو ان لوگوں سے الفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پرباندھ کے لڑتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں۔

تفسیر: لشکر اسلام میں کچھ ایسے شیخی خور مسلمان بھی تھے جو آپس میں بیٹھ کر بڑی ڈینگیں مارتے تھے۔ ایک روز چند اصحاب باہم یہ تذکرہ کررہے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہوجائے کے فلاں عمل خدا کو سب سے زیادہ پسند ہے تو ہم اپنے جان ومال سے بھی اس کے کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ مگر یہی حضرات جو بڑھ بڑھ کر بولتے تھے جنگ احد میں بھاگتے نظر آئے اور حضرت رسولؐ کو نرغہ اعداء میں چھوڑدیا۔ رسولؐ پکارتے رہے مگر کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ جنگ احد میں اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حضرت علیؑ ہی تھے جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمنوں کا صفایا کرتے رہے اور حفاظت رسولؐ کی خاطر جان کی بازی لگادی۔ ایک اسی

ہی کیا ہر جنگ میں حضرت علیؑ اس شجاعت وجوانمردی سے لڑے کہ کسی بھی جنگ میں راہ فرار اختیار نہیں کی۔ جہاں لڑے قدم جما کر لڑے۔

(تفسیر درمنثور ص: ۲۱۳ ج: ۶ اور تفسیر القرآن ص: ۲۵۴ ج: ۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا

سورۂ المریم آیت: ۹۶

ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے عنقریب ہی خدا ان کی محبت (لوگوں کے دلوں میں) پیدا کردیگا۔

تفسیر: ابن مردویہ اور دیلمی نے براء سے روایت کی ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علیؑ کہو خداوندا اپنی بارگاہ میں میرے لئے عہدوپیمان اور محبت قرار دے اور مومنین کے دلوں میں میری محبت قائم کر۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن عباسؓ اور خود حضرت علیؑ سے بھی یہ روایت منقول ہے۔ (تفسیر درمنثور ص: ۲۸۷ ج: ۴" مواہب الدنیہ" صواعق محرقہ وغیرہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰۗىِٕكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ

سورۂ الانبیاء آیت: ۱۰۱

ترجمہ: (ہاں) البتہ جن لوگوں کے واسطے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی (تقدیر میں لکھی جاچکی) ہے وہ لوگ دوزخ سے دور ہی دور رکھے جائیں گے۔

تفسیر: ابن ابی حاتمؒ ابن عدی اور ابن مردویہ نے نعمان بن بشیر سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور کہا" انا منہم" میں انہی لوگوں میں ہوں۔

(تفسیر کشاف ص: ۲۰۷ ج: ۲" تفسیر درمنثور ص: ۳۳۹ ج: ۴)

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ

سورۂ الانفال آیت: ۶۲

ترجمہ: (اے رسولؐ) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی۔

تفسیر: ابن عساکر نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ عرش پر لکھا ہوا ہے' میرے سوا کوئی معبود نہیں میں یکتا ہوں میرا کوئی شریک نہیں' محمد میرا بندہ اور رسول ہے' میں نے اس کی علی سے مدد کی۔ (تفسیر در منثور ص: ۱۹۹ ج: ۳)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

سورۂ البقرہ آیت: ۱۴۳

ترجمہ: اور (جس طرح تمہاری قبلہ کے بارے میں ہدایت کی) اسی طرح تم کو عادل امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں تم گواہ بنو اور رسول (محمدؐ) تمہارے مقابلہ میں گواہ بنیں۔

تفسیر: مولانا فرمان علی صاحب نے شواہد التنزیل کے حوالے سے اس آیت کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ سلیم بن قیس سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ امت عادل اور لوگوں پر گواہ ہم ہیں اور خاص ہم ہی اس سے مقصود خدا ہیں۔ اور حضرت رسولؐ ہم پر گواہ ہیں اور ہم گواہان خدا ہیں اس کی مخلوق پر اور اس کی حجت ہیں زمین پر اور ہم ہی وہ ہیں جن کے بارے میں خدا نے كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا فرمایا ہے۔

مولانا ظفر حسین صاحب نے مدلل بحث کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازیؒ نے کئی توجیہات تحریر فرمائی ہیں مگر کان کو لگتی نہیں۔ جبکہ آئمہ اہلبیت سے منقول ہے کہ امت وسط یعنی ﷺ کی امت رسولؐ اور لوگوں کے درمیان ہم ہیں۔ ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک

امام ضرور رہے گا۔ وہ شہید اعمال امت ہوگا۔ جس نے جو زندگانی دنیا میں کیا ہوگا وہ اس کی روز قیامت پیش خدا گواہی دے گا اور ہماری گواہی کی تصدیق رسولؐ کریں گے۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۲۹ ج: ۱)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

سورۂ البقرہ آیت: ۲۷۴

ترجمہ: جو لوگ رات کو دن کو چھپا کے یا دکھا کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے لئے ان کا اجر (وثواب) ان کے پروردگار کے پاس ہے اور (قیامت میں) نہ ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔

تفسیر: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ کے پاس کل چار درہم تھے کہ آپ نے ایک درہم رات کو خیرات کیا اور ایک دن کو اور ایک چھپا کر اور ایک دکھا کر اسی وقت آپؑ کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی۔

(تفسیر کشاف ص: ۲۶۸ ج: مطبوعہ مصر)

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

سورۂ السجدہ آیت: ۱۸

ترجمہ: کیا جو شخص ایماندار ہے اس شخص کے برابر ہو جائیگا جو بدکار ہے (ہرگز نہیں یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے)۔

تفسیر: اس آیت کی شان نزول کی بابت مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ ایک روز ولید بن عقبہ بن ابی معیط نے حضرت علیؑ سے کہا' اے علی تم بچے ہو میں جوان ہوں' میں تم سے قوت اور زبان دانی میں بھی زیادہ ہوں نیز نیزہ بازی میں بھی تم سے بہتر ہوں' لشکر میں ثابت قدم ہوں۔ حضرت علیؑ نے

فرمایا تیری یہ مجال ہے کہ میرا مقابلہ کرے اور مجھ پر فخر کرے۔ کہیں مومن وبدکار برابر ہو سکتے ہیں۔ خدا نے آپ کی تائید میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اس روایت کو ابن مردویہ' خطیب خوارزمی اور ابن عساکر نے ابن عباس کی سند سے بیان کیا ہے۔

یہ وہی حضرت ولید ہیں جنکو حضرت عثمانؓ نے کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا تھا اور جنھوں نے نشہ کی حالت میں صبح کی چار رکعت پڑھا کر کہا تھا' اس وقت طبیعت جوش میں ہے کہو تو اور پڑھا دوں۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۹۷ ج: ۴)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

سورۂ الرعد آیت: ۴۳

ترجمہ: اور (اے رسولؐ) کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو۔ تو تم (ان سے) کہدو کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کی) گواہی کے واسطے خدا اور وہ شخص جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا علم ہے' کافی ہے۔

تفسیر: اکثر مفسرین اس کے قائل ہیں کہ شخص سے مراد علی ابن ابیطالب ہیں۔ چنانچہ ثعلبی نے عبداللہ بن عطا سے روایت کی ہے کہ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد علی ابن ابیطالب ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپؑ اکثر فرمایا کرتے تھے سَلُوْنِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ یعنی مجھ سے پوچھ لو اس سے پہلے کہ میں مر جاؤں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام یہودی سے متعلق ہے جو یہودی سے مسلمان ہوا تھا اور توریت کا عالم تھا۔ لیکن یہ درست نہیں کیوں کہ جب سعید بن جبیر سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ سورہ تو مکہ میں نازل ہوا جب

کہ عبداللہ بن سلام مدینہ میں اسلام لائے۔ ابن منذر نے شعبی سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سلام کی شان میں تو کوئی آیت نازل ہوئی ہی نہیں۔ (تفسیر در منثور ج: ۴' تفسیر القرآن ص: ۴۸ ج: ۳)

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿۷﴾

سورۂ الرعد آیت: ۷

ترجمہ: اور جو لوگ کافر ہیں کہتے ہیں اس شخص (محمدؐ) پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی (ہماری مرضی کے موافق) کیوں نہیں نازل کی جاتی (اے رسولؐ) تم تو صرف (خوف خدا سے) ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہے۔

تفسیر: ابن مردویہ' ابن جریر' ابو نعیم' دیلمی' ابن عساکر اور ابن نجار نے روایت کی ہے کہ جب آیت "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھ کو اپنے سینہ پر رکھا اور فرمایا اَنَا مُنْذِر یعنی میں ڈرانے والا ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ سے علی کے شانہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا "انت الهادی یا علی بك یهتدی المهتدون بعدی" یعنی اے علی تم ہی ہدایت کرنے والے ہو اور میرے بعد تمہارے ہی ذریعہ سے لوگ ہدایت پائیں گے۔ (تفسیر در منثور ص: ۴۵ ج: ۴)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

سورۂ المجادلہ آیت: ۱۲

ترجمہ: اے ایماندارو! جب پیغمبرؐ سے کوئی بات کان میں کہنی چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کوئی خیرات دے دیا کرو یہی تمہارے واسطے بہتر اور پاکیزہ بات ہے پس اگر تم کو اس کا مقدور نہ ہو تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر : اصحاب رسول میں ہر شخص حضرت رسولؐ سے تخلیہ میں باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوتی تھی اور دوسرے بے چارے غریبوں کو موقع نہ ملنے سے ان کی دل شکنی ہوتی تھی۔ لہٰذا خدا کا یہ حکم ہوا کہ جو تخلیہ کرنا چاہے وہ پہلے کچھ صدقہ حاضر کرے۔ اس حکم کے بعد سب تخلیہ کرنے والے الگ ہوئے اور حضرت علیؑ کے سوا سب دس روز تک حضرتؐ کے پاس بھی نہ آئے مگر حضرت علیؑ باوجود فقر و فاقہ کے روز صدقہ دیتے اور حضرتؐ کے پاس بیٹھ کر تخلیہ میں علوم کی تعلیم پاتے رازونیاز کی باتیں کرتے۔ یہ فضیلت بھی حضرت علیؑ کے مخصوصات میں سے ہے۔ اوروں کے علاوہ خود جناب امیرؑ بھی فخر افرمایا کرتے تھے کہ قرآن میں ایک ایسی آیت بھی ہے جس پر نہ میرے قبل کسی نے عمل کیا اور نہ میرے بعد کوئی عمل کریگا۔ (تفسیر کشاف ص: ۱۷۱ ج: ۳)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۱۹﴾

سورۃ التوبہ آیت : ۱۱۹

ترجمہ : اے ایمان دارو خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

تفسیر : ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے ابن عساکر نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ صادقین (سچوں) سے مراد حضرت علیؑ ابن ابیطالب ہیں۔ (تفسیر در منثور ص: ۲۹۰ ج: ۳)

مولانا سید ظفر حسن صاحب نے اس آیت کی تفسیر تفصیلاً تحریر فرمائی ہے اور چند باتوں پر خصوصی توجہ دلائی ہے۔ مثلاً

۱ امت محمدی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروہ ساتھ ہونے والوں کا ہے اور دوسرا ان لوگوں کا جن کے ساتھ ہونے کا حکم ہے۔

۲ چونکہ یہ حکم تا قیامت تمام امت کیلئے ہے لہٰذا ہر زمانہ میں صادقین میں سے کسی ایک کا وجود ضروری ہے۔

۳ صادقین کے ساتھ ہونے سے مراد ان کی پیروی کرنا ہے کیونکہ صراط مستقیم پر صرف وہی لوگ ہوں گے جو صادقین کے پیرو ہونگے۔

۴ صادقین کی پیروی کیلئے صرف ایمان کافی نہیں بلکہ متقی بھی ہونا چاہیے۔

۵ صادقین کی پیروی واجب ہے اختیاری نہیں۔

۶ صادقین سے مراد صدق کلی رکھنے والا ہے یعنی اس نے من المہد الی اللحد کبھی جھوٹ بولا ہی نہ ہو۔

۷ یہ آیت اہلبیت رسولؐ کے منصوص من اللہ جانشین رسولؐ ہونے پر قوی ترین دلیل ہے۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۳۶ ج: ۲)

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۳۳﴾

سورۃ الزمر آیت : ۳۳

ترجمہ : اور یاد رکھو کہ جو شخص (رسولؐ) سچی بات لیکر آیا وہ اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی لوگ تو پرہیزگار ہیں۔

تفسیر : اس پر ہر شخص کا اتفاق ہے اور فریقین کے علماء اسکے قائل ہیں کہ حضرت رسول خداؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علیؑ ہی ہیں۔ انہی کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی چنانچہ حافظ ابن مردویہ نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے تصدیق کی ہے اس سے علی ابن ابیطالب مراد ہیں۔ (تفسیر در منثور ص: ۳۲۸ ج: ۹)

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ﴿۲﴾ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿۳﴾

سورۃ النجم آیت : ۱-۳

ترجمہ : تارے کی قسم جب ٹوٹا کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ گمراہ ہوئے اور نہ بہکے اور وہ تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

تفسیر : ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک روز بنی ہاشم کے کچھ لوگوں کیساتھ وہ حضرت رسولؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتفاق سے ایک ستارہ ٹوٹا یہ دیکھتے ہی حضور نے فرمایا کہ یہ ستارہ جسکے گھر میں گرے گا وہی میرے بعد میرا وصی ہوگا۔ یہ سن کر لوگ اس کو دیکھنے کیلئے اٹھے تو دیکھا وہ علیؑ ابن ابیطالب کے گھر میں گرا تو لوگ گستاخانہ کہنے لگے کہ یارسول اللہؐ آپ علیؑ کی محبت میں گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئیں۔ (مناقب ابن مغازلی شافعی)

ایک دوسری روایت ابن مردویہ نے ابوالحمراء اور حبۃ العرنی سے اس طرح بیان کی ہے کہ جب علیؑ کے دروازہ کے سوا مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازوں کے بند کرنے کا حکم آیا تو لوگوں کو ناگوار ہوا۔ حضورؐ سے عرض کی' آپ نے سب کے دروازے بند کرا دیئے سوا علی کے دروازہ کے۔ ایک گستاخ نے کہا' یارسول اللہ آپؐ نے فرط محبت میں علی کا رتبہ سب سے بلند کر دیا۔ حضرت نے فرمایا' نہ میں نے اپنی خواہش سے کسی دروازہ کو کھولا تھا نہ بند کیا میں نے جو کچھ کیا ہے خدا کے حکم سے کیا ہے۔ اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر القرآن ص: ۱۶۳ ج: ۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۵۴﴾

سورۃ المائدہ آیت : ۵۴

ترجمہ : اے ایماندارو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو (کچھ پروا نہیں پھر جائے) عنقریب ہی خدا ایسے لوگوں کو ظاہر کردیگا جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا اور وہ اس (خدا) کو دوست رکھتے ہوں گے' ایمانداروں کے ساتھ منکسر (اور) کافروں کے ساتھ

کڑے۔ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہ کریں گے۔ یہ خدا کا فضل (وکرم) ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا تو بڑی گنجائش والا واقف کار ہے۔

تفسیر : یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ ہمت افزائی کیلئے مسلمانوں کو "اے ایمان والو" کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتا ہے کہیں بھی "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أَسْلَمُوا" نہیں کہا گیا۔ ورنہ مسلمانوں میں تو بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ایمان سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ رسول اللہؐ کو دھمکیاں دیتے تھے کہ "اگر آپ نے ہمارا کہنا نہ مانا تو ہم اسلام سے دستبردار ہو کر اپنے سابق دین کی طرف پلٹ جائیں گے۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہی کے جواب میں فرمایا ہے اگر کوئی دین سے پھر جائے تو کچھ پرواہ نہیں اللہ کے پاس ایسے کامل مومنین ہیں جن کی صفات یہ ہیں :-

۱) پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ کی دوستی کا تو ہر مسلمان دعویدار ہے مگر کیا اللہ بھی انہیں دوست رکھتا ہے؟ اللہ کے رسول نے جنگ خیبر کے موقع پر اللہ کے ایک دوست کی شناخت اس طرح کرائی۔ "لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ يُحِبُّ اللهَ وَالرَّسُولَ وَيُحِبُّهُ اللهُ وَالرَّسُولُ۔ ترجمہ : کل میں اپنا علم ایسے مرد کو دوں گا جو پے در پے حملے کرنے والا ہوگا اور بھاگ کر آنے والا نہ ہوگا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے) دوسرے روز صبح یہ علم امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابیطالب کو مرحمت فرمایا۔

۲) دوسری صفت یہ ہے کہ وہ مومنین کے ساتھ انکساری سے پیش آنے والے ہونگے۔ یہ صفت بھی حضرت علیؑ اور آل رسولؐ ہی میں

خصوصیت پائی جاتی ہے۔

۳۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ کافروں کے سامنے سخت وشجاع ہوں گے۔ حضرت علی میں یہ صفت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ کبھی دشمن کی طاقت کو نظر میں نہ لائے۔ آپ نے کبھی دشمن سے شکست نہیں کھائی اور کبھی میدان سے فرار نہیں ہوئے۔

۴۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں جہاد کرنے والے ہونگے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؑ تمام عمر راہ خدا میں جہاد کرتے رہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تین چیزیں سب سے زیادہ محبوب ہیں الاکرام الضیف والصوم فی الصیف والجهاد باالسّیف یعنی مہمان کی خاطر تواضع، گرمی کے موسم کا روزہ اور تلوار سے راہ خدا میں جہاد کرنا۔

ممکن ہے کہ فرداً فرداً ان صفتوں میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ صفات حضرت علیؑ کے سوا کسی میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ (تفسیر القرآن ص: ۳۸۳ ج: ۱)

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝ سورۃ المائدہ آیت: ۵۵

ترجمہ: (اے ایمان والو) تمہارے مالک وسرپرست تو بس یہی ہیں، خدا اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بتاتا ہے کہ تمہارا اولی یعنی اولی بالتصرف کون کون ہیں۔ یہ ولایت مطلقہ خدا نے صرف تین ذاتوں میں محدود رکھی۔ سب سے اعلیٰ حاکم اور اولی بالتصرف خدا ہے۔ اس کے بعد

دوسرے رسولِ خدا ہیں اور تیسرا اولی مطلق وہ ہے جو ایمان والا ہے، نماز قائم کرنے والا ہے۔ اور زکوۃ دینے والا ہے۔ باتفاق مفسرین شیعہ وسنی، موافق ومخالف یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی اور اس سے تصریحی طور پر حضرت علیؑ کا خلیفہ بلا فصل ہونا ثابت ہے۔ (تفسیر القرآن ص: ۳۸۴ ج: ۱)

اس آیت کے نزول کی بابت طبرانی نے عمار بن یاسر سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ کے پاس ایک سوالی کھڑا تھا اور آپ نفلی نماز میں حالت رکوع تھے پس آپ نے اسی حالت میں اپنی انگشتری اتار کر سائل کو عطا کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس روایت کے اور بھی شواہد ہیں جیسے عبدالرزاق نے ابن عباس کی سند سے روایت کی کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے ابن عباس کی اس روایت کو ایک دوسرے طریقہ سے بھی بیان کیا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے اور ابن ابی حاتم نے سلمیٰ بن کہیل سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔

(تفسیر فتح القدیر ص: ۵۰ ج: ۲، تفسیر کشاف ص: ۳۴۶ ج: ۱)

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝

سورۃ البقرہ آیت: ۱۸۹

ترجمہ: اور یہ کوئی بھلی بات نہیں ہے کہ گھروں میں پچھواڑے سے (پھاند کے) آؤ بلکہ نیکی اس کی ہے جو پرہیزگاری کرے اور گھروں میں (آنا ہو تو) ان کے دروازوں کی طرف سے آؤ اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم مراد کو پہنچو۔

تفسیر: بظاہر اس آیت میں مسلمانوں کو عہد جاہلیت کے اس دستور سے روکنا تھا جس کے تحت کوئی شخص حج یا عمرہ کیلئے احرام باندھتا تو وہ گھر میں دروازے سے داخل نہ ہوتا بلکہ پشت سے جاتا۔ اگر کوئی گھر کے

دروازے سے داخل ہو جاتا تو اسے فاجر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اس آیت کی باطنی تفسیر کی بابت حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ اس آیت میں خداوند عالم نے اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ جس بات کو حاصل کرنا ہو اس کو اس کے اہل سے حاصل کر۔ نااہل کے پاس نہ جاؤ۔ جس طرح مکان میں دروازے سے جانا مناسب اور عقل سلیم کے موافق ہے۔ رسالتمآبؐ نے اس مطلب کو مختلف الفاظ میں ادا فرمایا۔ کبھی فرمایا (ترجمہ) "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں" کبھی فرمایا (ترجمہ) "جو دروازہ چھوڑ کر کسی اور راستے سے آئیگا وہ چور سمجھا جائیگا" کبھی فرمایا (ترجمہ) "میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"۔ تفسیر بیضاوی اور تفسیر کشاف میں بھی تقریباً ایسا ہی مضمون مرقوم ہے۔

(حاشیہ قرآن الحکیم ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب، تفسیر القرآن ص: ۱۵۳ ج: ۱)

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ۝ سورۃ التحریم آیت: ۴

ترجمہ: (تو اے حفصہ وعائشہ) اگر تم دونوں (اس حرکت سے) توبہ کرو تو (خیر کیونکہ) تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہیں۔ اور اگر تم دونوں رسول کی مخالفت میں ایک دوسرے کی اعانت کرتی رہو گی تو کچھ پروا نہیں (کیونکہ) خدا اور جبرئیل اور تمام ایمانداروں میں نیک شخص ان کے مددگار ہیں۔ اور ان کے علاوہ کل فرشتے مددگار ہیں۔

تفسیر: یہ اور اس سے قبل کی آیات رسولؐ کی دو ازواج حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ سے متعلق ہیں جس کی تفصیل جملہ کتب تفسیر حدیث وتاریخ میں مذکور ہے۔ یہ آیت بھی اس عتاب کا آتمہ ہے جو حضرت

عائشہ وحفصہ پر خدا نے کیا ہے۔ مطلب تو کھلا ہوا ہے کہ اگر تم لوگ رسول کا دل دکھاتی رہو تو کچھ پروا بھی نہیں ہے تم لوگ اپنا اپنا راستہ لو، خود خدا، جبرئیل اور علیؑ بلکہ کل فرشتے آپؐ کی مدد کو موجود ہیں اگرچہ صالح المومنین کے مان لینے میں کچھ اختلاف ہے مگر بہت سی روایتیں مذکور ہیں جو علی ابن ابیطالب کے مراد پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ ابن ابی حاتم نے خود حضرت علیؑ سے اور ابن مردویہ نے اسماء بنت عمیس سے اور ابن مردویہ اور ابن عساکر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ صالح المومنین سے علی ابن ابیطالب مراد ہیں۔ (تفسیر درمنثور ص: ۲۴۴ ج: ۹)

مولانا سید ظفر حسن صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"یہ لکھتے ہوئے قلم کانپتا اور دل لرزتا ہے کہ رسولؐ کی بیبیاں، مومنین کی مائیں اور ان کے دل ٹیڑھے۔ مگر کیا کیجئے آیت صاف لفظوں میں بتا رہی ہے کہ ایسا ہی تھا۔ تمام مفسرین نے یہی ترجمہ کیا ہے اور جو خطائیں سرزد ہوئیں انہیں تسلیم کیا ہے اور آیت کا مصداق انہی دو بیبیوں (حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ) کو بتایا ہے۔ سرکشی ہوئی اس ذات کے ساتھ جو سید المرسلین اور خاتم النبیین ہے جس کی آواز سے اونچی آواز کرنے میں سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ سازشیں ہوئیں رسولؐ کے گھر میں اس تصور سے کلیجہ کانپتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ کے خلاف یہ شورہ پشتی کس قدر زور دار تھی کہ اس کے دفعیہ اور اپنے رسولؐ کی مدد کیلئے خدا نے اپنی ذات کے ساتھ جبرئیل جیسے فرشتہ جس نے پَر مار کر بستیوں کی بستیاں الٹ دی تھیں۔ پھر صالح المومنین فاتح خندق وخیبر جس کی تلوار کی دھاک نے تمام عرب میں ہلچل ڈال دی تھی، اس کے سارے ملائکہ جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس سے زیادہ دھمکی کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا

کچھ ہوا اور کیا کچھ ہونے والا تھا جس کی روک تھام کیلئے یہ فوج بلائی جانے والی تھی۔ العلم عنداللہ۔ ہم تو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ امہات المومنین ہیں اور ہمیں کوئی حق بھی کہنے کا نہیں۔ رسول کے گھر کی بات ہے خدا جانے اور اس کا رسولؐ۔" (تفسیر القرآن ص:۲۸۲ ج:۵)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

سورۂ النساء آیت : ۶۹

ترجمہ : اور جس شخص نے خدا اور رسول کی اطاعت کی تو ایسے لوگ ان (مقبول) بندوں کے ساتھ ہوں گے جنہیں خدا نے اپنی نعمتیں دی ہیں یعنی انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

تفسیر : مولانا فرمان علی صاحب نے ایک حدیث کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ " نبیین سے حضرت رسول خدا صلعم اور صدیقین سے حضرت علی مرتضیٰ اور شہداء سے حسنینؑ اور صالحین سے باقی آئمہ اہلبیت مراد ہیں"۔

(حاشیہ القرآن الحکیم)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

سورۂ المائدہ آیت : ۵۵

ترجمہ : اے ایمان دارو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبانِ حکومت ہوں ان کی اطاعت کرو۔

تفسیر : اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اولی الامر سے مراد کون ہے۔ کوئی کہتا ہے بادشاہانِ وقت مراد ہیں' کوئی کہتا ہے امراء سرایا مراد ہیں' کوئی کہتا ہے علمائے وقت مراد ہیں اور کوئی کہتا ہے اس سے وہ معصوم ہستیاں مراد ہیں جو اہلبیت رسول کہلاتی ہیں۔

مولانا فرمان علی صاحب نے قرآن حکیم کے حاشیہ پر اور مولانا سید ظفر حسن صاحب نے تفسیر القرآن میں تفصیلی بحث سے ثابت کیا ہے کہ اولی الامر سے مراد آئمہ معصومین ہی ہیں جیسا کہ حدیث جابر بن عبداللہ انصاری سے بھی ثابت ہے اور حضرت علی ابن ابیطالب آئمہ معصومین میں امام اول ہیں۔ (تفسیر القرآن ص:۳۰۷ ج:۱)

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ سورۂ المطففین آیت : ۳۰ - ۲۹

ترجمہ : بے شک جو گنہگار مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گذرتے تو ان پر چشمک کرتے تھے۔

تفسیر : علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایک بار حضرت علی مسلمانوں کی ایک جماعت کے سامنے سے ہو کر گذرے تو ان میں سے جو لوگ منافق تھے مسخراپن' ہنسی اور باہم چشمکیں کرنے لگے قبل اسکے جناب امیرؑ حضرت رسولؐ کے پاس پہنچیں منافقین کی مذمت اور حضرت علیؑ کی مدح میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر کشاف جلد دوئم مطبوعہ مصر)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

سورۂ التوبہ آیت : ۲۲-۱۹

ترجمہ : کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سقائی اور مسجد الحرام (خانہ کعبہ) کی آبادی کو اس شخص کے ہمسر بنا دیا ہے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا' خدا کے نزدیک تو یہ لوگ برابر نہیں ہیں اور خدا ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور (خدا کیلئے) ہجرت اختیار کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا وہ لوگ خدا کے نزدیک درجہ میں کہیں بڑھ کر ہیں اور یہی لوگ (اعلیٰ درجہ) پر فائز ہونے والے ہیں۔ ان کا پروردگار اپنی مہربانی اور خوشنودی اور ایسے ہرے بھرے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جس میں ان کے لئے دائمی عیش و (آرام) ہوگا، اور یہ لوگ ان باغوں میں ہمیشہ ابدالآباد تک رہیں گے۔ بیشک خدا کے پاس تو بڑا اجر ثواب ہے۔

تفسیر : ایک دن حضرت عباس اور طلحہ بن شیبہ باہم فخر کر رہے تھے اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے افضل کہہ رہا تھا۔ طلحہ نے کہا میں تم سے زیادہ فضیلت رکھتا ہوں کیونکہ خانہ کعبہ کی کنجی میرے پاس ہے' حضرت عباس بولے میں تم سے افضل ہوں کیونکہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں' اتنے میں حضرت علیؑ کا وہاں سے گذر ہوا۔ آپ نے فرمایا تم دونوں سے افضل میں ہوں کیونکہ میں نے تمام عالم سے پہلے رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور ایمان لایا' خدا کی راہ میں جہاد کیا۔ حتیٰ کہ یہ تینوں رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے اور فیصلے کے خواستگار ہوئے۔ اس وقت یہ آیات (۱۹ تا ۲۲) نازل ہوئیں اور خدا نے سمجھا دیا کہ حضرت علیؑ سب سے افضل ہیں۔

(تفسیر درمنثور ص:۲۱۹ ج:۴)

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱﴾

سورۂ التوبہ آیت : ۱

ترجمہ : اے مسلمانوں جن مشرکوں سے تم لوگوں نے (صلح کا) عہد و پیمان کیا تھا اب خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان سے (اک دم) بیزاری ہے۔

تفسیر : حضرت رسول خداؐ نے اس سورۃ کی ابتدائی دس آیتیں حضرت ابوبکرؓ کو دیں اور کچھ آدمیوں کو ساتھ کر کے حکم دیا کہ مکہ میں جا کر کفار و مشرکین کے مجمع عام میں پڑھ کر سنادو' حضرت ابوبکرؓ روانہ ہوئے اس کے بعد جبرئیل یہ حکم خدا لیکر آئے کہ یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے یا تو تم خود جاؤ یا جو شخص تم سے ہو اس کو بھیجو۔ آپؐ نے فوراً حضرت علیؑ کو اپنے ناقہ پر سوار کر کے روانہ کیا اور حکم دیا ان آیتوں کو ابوبکرؓ سے لیکر تم خود پڑھ کر سنادو اور ابوبکرؓ کو واپس کردو۔ حضرت ابوبکرؓ واپس آئے اور پوچھا میرے بارے میں کوئی حکم آیا۔ غرض حضرت علیؑ نے جمرۂ عقبہ کے قریب کھڑے ہو کر نہایت بے باکی سے وہ آیتیں پڑھ دیں۔ (تفسیر درمنثور ص:۲۰۹ ج:۳)

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

سورۂ الحاقہ آیت : ۱۲

ترجمہ : ہم اسے تمہارے لئے یادگار بنائیں اور اسے یاد رکھنے والے کان سن کر یاد رکھیں۔

تفسیر : مولانا سید ظفر حسن صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم یہاں مختصراً تحریر کر رہے ہیں۔

اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ سے مراد ایسے کان ہیں جو بات کو سن کر یاد رکھتے ہیں بھول نہیں جاتے۔ ایسے کان والے سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ تفسیر درمنثور جلد ۶ میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت رسولؐ نے فرمایا میں نے خدا سے عرض کی تھی کہ ایسے کان علیؑ کے بنادے جو کبھی کسی بات کو

سن کر نہ بھولیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے جو بات میں نے رسولؐ سے سنی وہ کبھی نہ بھولا اور بریدہ سے مروی ہے کہ حضرت رسولؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا، مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اپنے سے قریب کروں اور دور نہ ہونے دوں اور تم کو تعلیم دوں اور تم یاد رکھو تم کو حق کی قسم یاد رکھنا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور حضرت رسولؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا اے علی! تو میرے علم کا یاد رکھنے والا کافی ہے۔ حضرت علیؑ کی یہ ایک بہت بڑی صفت ہے جس میں دوسرے شریک نہیں۔ (تفسیر القرآن ص: ۳۱۰ ج: ۵)

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿۲۸﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿۲۹﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿۳۱﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ﴿۳۳﴾ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ﴿۳۴﴾ إِنَّكَ كُنتَ بِنَا بَصِيرًا ﴿۳۵﴾

سورۂ طٰہٰ آیت: ۳۵ - ۲۵

ترجمہ: موسیٰ نے عرض کی پروردگار (میں جاتا تو ہوں مگر) تو میرے لئے میرا سینہ کو کشادہ فرما (دلیر بنا) اور میرا کام میرے لئے آسان کردے اور میری زبان سے لکنت کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھیں اور میرے کنبہ والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر (بوجھ اٹھانے والا) بنادے اس کے ذریعہ سے میری پشت مضبوط کردے اور میرے کام میں اس کو شریک بنا تاکہ ہم دونوں (مل کر) کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیری یاد کریں تو تو ہماری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔

تفسیر: ابن مردویہ، خطیب بغدادی اور ابن عساکر نے اسماء بنت عمیس سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت رسولؐ کو ثبیر (مکہ میں ایک پہاڑ ہے) کے مقابلہ میں دیکھا کہ آپ فرمارہے تھے کہ خداوندا میں بھی تجھ سے

وہی سوال کرتا ہوں جو میرے بھائی موسیٰ نے کیا تھا کہ میرے سینہ کو کشادہ فرما اور میرا کام میرے لئے آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھیں اور میرے اہلبیت سے میرے بھائی علی کو میرا وزیر بنا اور اس کے ذریعہ سے میری پشت مضبوط کر اور میرے کام میں اس کو میرا شریک بنا تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیری یاد کریں۔ تُو تو ہماری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔

(تفسیر درمنثور ص: ۲۹۵ ج: ۴، تفسیر القرآن ص: ۴۴۶ ج: ۳)

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۴۷﴾

سورۂ الحجر آیت: ۴۷

ترجمہ: اور (دنیا کی تکلیفوں سے) جو کچھ ان کے دل میں رنج تھا اس کو بھی ہم نکال دیں گے اور یہ باہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر اس طرح بیٹھے ہوں گے جیسے بھائی بھائی۔

تفسیر: ابوہریرہ سے روایت ہے کہ "حضرت علیؑ نے حضرت رسول خداؐ سے عرض کی کہ آپ کے نزدیک میں زیادہ محبوب ہوں یا فاطمہ۔ فرمایا وہ زیادہ محبوب ہے اور تم زیادہ عزیز اور گویا میں تمہارے ساتھ حوض کوثر پر ہوں اور تم وہاں سے لوگوں کو ہٹا رہے ہو اور حوض کوثر پر آسمان کے ستاروں کے شمار میں ٹونٹی دار کنٹر رکھے ہیں تم اور حسن و حسین و فاطمہ عقیل اور جعفر بہشت میں ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہو تم میرے ساتھ ہو اور تمہارے شیعہ بہشت میں ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی"۔ (تفسیر القرآن ص: ۷۹ ج: ۳)

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿۲﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

سورۂ العصر آیت: ۳-۱

ترجمہ: نماز عصر کی قسم بیشک انسان گھاٹے میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے اور آپس میں حق کا حکم اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔

تفسیر: ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اس سورہ میں انسان سے مراد ابو جہل ہے اور الا الذین امنو سے حضرت علیؑ و مسلمان مراد ہیں۔ (تفسیر درمنثور ص: ۳۹۲ ج: ۱)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿۷﴾ سورۂ البینہ آیت: ۷

ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے یہی لوگ بہترین خلائق ہیں۔

تفسیر: ابن عساکر نے جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ حضرت رسولؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ جناب امیرؑ سامنے سے نمودار ہوئے آنحضرتؐ نے دیکھتے ہی فرمایا خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ اور اسکے شیعہ یقینی قیامت کے دن فائز المرام ہوں گے۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اس دن سے جب اصحاب رسول حضرت علیؑ کو آتے دیکھتے تو کہتے 'خیر البریۃ' آیا۔ اور ابن عدی اور ابن عساکر نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت رسولؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن خوش و پسندیدہ ہیں۔ (تفسیر درمنثور ص: ۳۷۹ ج: ۲)

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۶۷﴾

سورۂ المائدہ آیت: ۶۷

ترجمہ: اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، پہنچادو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے

اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور (تم ڈرو نہیں) خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا خدا ہرگز کافروں کی قوم کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

تفسیر: ابن ابی حاتم نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی اور تمام مفسرین نے بھی اس پر اتفاق کیا ہے۔ یہ آیت چند باتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے:

۱) خلافتِ علیؑ کے تعین و تقرر سے متعلق اس سے پہلے کوئی حکم آچکا تھا مگر آنحضرتؐ نے دشمنوں کی مخالفت کے خوف سے اسے اپنی امت سے بیان نہیں کیا۔

۲) غدیر خم کی منزل تک آپ کے تمام ساتھی حج سے واپسی پر آپ کے ہمراہ تھے اس کے بعد وہ مختلف راستوں میں تقسیم ہو جاتے لہٰذا یہ تبلیغ کرنا ضروری تھا۔

۳) اس امر کی تبلیغ اتنی ضروری تھی کہ اگر اس کو پورا نہ کیا جاتا تو کار رسالت کچھ بھی ادا نہ ہوتا۔

۴) صرف حکم سنانا ہی کافی نہ تھا بلکہ عملاً اپنے خلیفہ و جانشین کا تقرر کرکے امت کو دکھانا ضروری تھا۔ تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نے ان کو دیکھا ہی نہ تھا صرف نام سنا تھا لہٰذا ہم نے علی سے علی اعلیٰ (خدا) سمجھا۔

۵) غدیر خم کوئی منزل نہ تھی یہاں کاروان کو روک کر کڑی دھوپ اور جلتی ریت پر لوگوں کو بٹھا کر اس حکم کی تبلیغ فرمائی۔

۶) اس اعلان کی صورت یہ تھی جب لوگ بیٹھ گئے تو پالان شتر کا ایک منبر بنایا گیا اس پر چادر ڈالی گئی اور حضورؐ اس پر تشریف فرما ہوئے۔ علی کو منبر کے پاس اپنے داہنے ہاتھ کے قریب کھڑا کرلیا۔ پہلے ایک طولانی خطبہ بیان فرمایا۔ اپنے مرنے کی خبر دی۔ اپنی تبلیغ کا

مفصل ذکر کیا۔ اپنے بعد اپنے اہلبیت سے تمسک کا حکم دیا۔ پھر فرمایا لوگو! کیا میں تم پر تمہارے نفسوں سے زیادہ صاحب حکومت وتصرف نہیں؟ ہر طرف سے آواز آئی ضرور ایسا ہی ہے تب آپ نے فرمایا مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ جس کا میں حاکم ہوں اسکا علی بھی حاکم ہے۔ پھر علی کے حق میں دعاء فرمائی۔

۷) جب فهٰذا علیٌّ مولاہ فرمایا تو علی کا بازو پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ سفیدی زیر بغل نمایاں ہوگئی یعنی نام لیکر سنایا اور بازو پکڑ کر دکھایا اور اشارہ کر کے سمجھایا اس سے زیادہ موثر معرفت اور کیا ہوگی۔

۸) سب نے مبارکباد دی۔ حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں مبارکباد پیش کی۔ بَخٍ بَخٍ لَكَ يَابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَلْيَوْمَ اَصْبَحْتَ مَوْلَائِیْ وَمَوْلٰی كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَةٍ "اے علی مبارک ہو مبارک کہ آپ آج سے میرے بھی مولا بن گئے اور تمام مومنین و مومنات کے بھی۔ عسان بن ثابت نے یہ نوید مسرت سن کر نہایت جوشیلے انداز میں ایک قصیدہ پڑھا (تفسیر القرآن ص: ۳۸۹ ج ۱)

اکثر مفسرین و محدثین و مورخین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم پر ولایت علی ابن ابیطالب کی تبلیغ میں نازل ہوئی۔ منجملہ انکے ابو حاتم رازی، علامہ جلال الدین سیوطیؒ، محمد دین احمد، علامہ عینی حنفی، امام فخر الدین رازی، علی ابن احمد المعروف واحدی، مسعود بن سجتانی اور علامہ شوکانی کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی تحریر فرماتے ہیں کہ۔ ترجمہ: یہ آیت حضرت علی کی فضیلت میں نازل ہوئی ہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ جس کا میں مولی ہوں اس کا علی مولی ہے اے اللہ جو علی سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اسکے ساتھ عداوت کرے تو بھی اس سے عداوت کر۔

(تفسیر کبیر ص: ۹۳۶ ج: ۳، حوالہ تفسیر خلافت ص: ۱۰)

مولانا جلال الدین سیوطی نے بیان کیا ہے کہ ابن معترد سے ابن مردویہ نے روایت کی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کے زمانہ میں اس آیت کو یوں پڑھتے تھے۔

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اَنَّ عَلِيًّا مَوْلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" ترجمہ: اے رسول جو حکم اس بات کا کہ علی تمام مومنین کے حاکم ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔ (تفسیر در منثور ص: ۲۹۰ ج: ۲ مطبوعہ مصر)

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا،

سورۃ المائدہ آیت: ۳

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے (اس) دین اسلام کو پسند کیا۔

تفسیر: تمام مفسرین نے اس آیت کی شان نزول مقام غدیر خم ہی لکھی ہے۔ جب رسالتمآبؐ آخری حج سے فارغ ہو کر مدینہ واپس چلے تو اٹھارویں ذی الحجہ کو حکم خدا حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا (ترجمہ) "میں جس کا حاکم ہوں اس کا علی بھی حاکم ہے۔ یااللہ جو اسے دوست رکھے اسے تو بھی دوست رکھ جو اس کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر جو اسے ذلیل کرے تو بھی اسے ذلیل کر" اس کے بعد لوگوں نے حضرت علیؑ کو مبارکباد دی۔ اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی اور دین کامل ہوا۔ مولانا سید ظفر حسن صاحب نے اس آیت کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ (تفسیر در منثور ص: ۲۰۹ ج: ۲، مطبوعہ مصر، تفسیر القرآن ص: ۳۵۳ ج: ۱)

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ۙ

سورۃ المعارج آیت: ۱ تا ۳

ترجمہ: ایک مانگنے والے نے کافروں کے لئے ہو کر رہنے والے عذاب کو مانگا، جس کو کوئی ٹال نہیں سکتا، جو درجے والے خدا کی طرف سے ہونے والا تھا۔

تفسیر: جب حضرت رسولؐ نے حضرت علیؑ کو غدیر خم میں اپنا خلیفہ نامزد کیا اور یہ خبر اطراف وبلاد میں پھیلی تو حارث بن نعمان فہری مدینہ میں آیا اور اپنے ناقہ سے اترا اور حضرت رسولؐ کے پاس پہنچا۔ آپؐ اس وقت اصحاب کے مجمع میں تشریف فرما تھے یہ آتے ہی بیباکی سے کہنے لگا (اے محمدؐ) تم نے توحید کو کہا مان لیا، نماز کو کہا پڑھی، روزے کو کہا رکھا، حج کو کہا کیا، اس پر بھی تم کو چین نہیں آیا کہ تم نے اپنے چچازاد بھائی کو ہمارا حاکم بنا دیا یہ تم نے اپنی طرف سے کیا ہے یا خدا کی طرف سے۔ آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم خدا کی طرف سے۔ یہ سن کر حارث پچھلے پاؤں پلٹا اور کہتا ہوا چلا کہ خداوندا اگر یہ سچ کہتے ہیں تو تُو آسمان سے ایک پتھر یا کوئی عذاب نازل کر، ابھی وہ اپنی سواری تک نہ پہنچا تھا کہ ایک پتھر اسکے سر پر گرا۔۔۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

(تفسیر ثعلبی، مزید تفصیل کیلئے تفسیر القرآن ص: ۳۱۶ ج: ۵)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝

سورۃ العمران آیت: ۶۱

ترجمہ: پھر جب تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی) عیسیٰ کے بارے میں حجت کرے تو کہو کہ (اچھا میدان میں) آؤ۔ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو (بلائیں) اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنی جانوں کو (بلائیں) اور تم اپنی جانوں کو، اس کے بعد ہم سب مل کر (خدا کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔

تفسیر: یہ آیت حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کی بابت نازل ہوئی۔ حکم خداوندی کے مطابق جناب رسالتمآبؐ اس آیت کی عملی تفسیر بتانے کی خاطر اپنے اہلبیت کو لیکر مباہلہ کیلئے بیت الشرف سے اس شان سے نکلے کہ حضرت حسنؑ کی انگلی پکڑے ہوئے، حضرت حسینؑ کو گود میں لئے ہوئے، حضرت فاطمہ زہرہؑ آپ کے پیچھے اور حضرت علیؑ ان کے پیچھے تھے۔ یعنی بیٹوں کی جگہ اپنے نواسوں حسنؑ و حسین کو، عورتوں کی جگہ اپنی صاحبزادی فاطمہ زہرہؑ کو اور اپنی جان کی جگہ اپنے ابن عم علی ابن ابیطالب کو لیا اور دُعا کی کہ خداوندا ہر نبی کے اہلبیت ہوتے ہیں یہ میرے اہلبیت ہیں ان کو ہر برائی سے دور اور پاک و پاکیزہ رکھ۔ یہ حضرت علیؑ کی اعلیٰ فضیلت ہے کہ حکم خدا نفس رسول قرار پائے۔ اس واقعہ کی تفصیل اکثر کتب تفسیر و تاریخ میں مرقوم ہے۔ (تفسیر جلالین جلالی ص: ۱۱۸ ج: ۱ مطبوعہ مصر)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝

سورۃ الفاطر آیت: ۳۲

ترجمہ : پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے خاص ان کو قرآن کا وارث بنایا جنھیں (اہل سمجھ کر) منتخب کیا کیونکہ بندوں میں سے کچھ تو (نافرمانی کرکے) اپنی جان پر ستم ڈھاتے ہیں اور کچھ ان میں سے نیکی بدی کے درمیان میں اور ان میں سے کچھ لوگ خدا کے اختیار سے نیکیوں (اوروں سے) گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ یہی (انتخاب وسبقت) تو خدا کا بڑا فضل ہے۔

تفسیر : اس آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری کا بیان ہے کہ ان بندوں سے آپ کی امت کے وہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین مراد ہیں جو قیامت تک کتاب خدا کے سچے وارث اور اس کے مطابق ہادی ہوں گے جنھو خدا نے امة وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس فرمایا۔

(تفسیر کشاف ص: ۳۹۲ ج: ۲)

مولانا فرمان علی صاحب نے شواہد التنزیل کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ خدا کی حجت اور خلق خدا کے گواہ حضرت علیؑ اور ان کی اولاد ہیں تو بس حسب اصول موضوعہ کتاب خدا کے وارث بھی یہی حضرات آئمہ معصومین قرار پاتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ زمخشری کا بھی یہی مقصود ہو کیونکہ حضرت رسولؐ کے بعد قیامت تک صحابہ تابعین و تبع تابعین ان حضرات کے سوا اور کون ہادی رہ سکتا ہے۔

اسی کی تائید ابوبکر ابن مردویہ نے بھی کی ہے اور صاف کہا ہے یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی۔ بقول علامہ ابن حجر مکی جناب امیر کے سوا کسی نے سلونی قبل ان تفقدونی (میری موت کے قبل مجھ سے جو چاہو پوچھ لو) کا دعویٰ نہیں کیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آپ کتاب خدا کے وارث نہ ہوتے تو ایسا دعویٰ نہ کرتے۔ جس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَ الْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍّ۔ (علی قرآن کے

ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے) پس اس صورت علیؑ کے سوا وارث کتاب اللہ کون ہو سکتا ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٣﴾

سورۂ الرحمن آیت : ۱۹ تا ۲۳

ترجمہ : اسی نے دو دریا بہائے جو باہم مل جاتے ہیں دو کے درمیان ایک حد فاصل (آڑ) ہے جس سے تجاوز نہیں کر سکتے تو (اے جن وانس) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ (اے جن وانس) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو نہ مانو گے۔

تفسیر : علامہ ابن مردویہ نے ابن عباسؓ اور انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے دونوں دریا علی و فاطمہ ہیں اور برزخ (حد فاصل) رسول اللہؐ ہیں اور موتی اور مونگے حسن و حسین ہیں۔

(تفسیر در منثور ص: ۱۴۲ ج: ۶)

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾

سورۂ آل عمران آیت : ۳۳ - ۳۴

ترجمہ : بیشک خدا نے آدم و نوح اور خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو سارے جہان سے برگزیدہ کیا ہے۔ بعض کی اولاد کو بعض سے اور خدا (سب کی) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔

تفسیر : اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء و مرسلین کا انتخاب کرکے بھیجا وہ سب برگزیدہ تھے پھر یہ کونسا انتخاب ہے جو مخصوص ہے آدم و نوح و آل ابراہیم و آل عمران سے جس کی بناء پر یہ اصطفا عمل میں آیا۔ اس آیت میں آل عمران کی بابت مفسرین کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ مراد ہیں، تو بعض نے حضرت مریم مراد لیا ہے جبکہ بعض نے حضرت علیؑ اور آئمہ اثنا عشر کو اس خصوصیت کا حامل قرار دیا ہے۔ تاریخ مذاہب میں عمران نامی صرف اور صرف تین اشخاص گذرے ہیں۔ ایک پدر بزرگوار حضرت موسیٰ "دوسرے پدر بزرگوار حضرت مریم " اور تیسرے پدر بزرگوار حضرت علیؑ جنکی کنیت ابوطالب تھی۔ اسی وجہ سے مفسرین میں اختلاف رونما ہوا۔ لیکن چونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت مریم تو پہلے ہی اصطفا کی منزل پر ہیں نیز حضرت موسیٰ و مریم کی نسل بھی آگے نہ چل سکی لہٰذا ماننا پڑیگا کہ حضرت علیؑ ہی وہ شخصیت ہیں جو اس آیت میں آل عمران سے مراد ہیں۔ تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ اس آیت میں آل عمران کے بعد آل محمد بھی تھا اور تفسیر ثعلبی میں ابن مسعود سے بھی یہی روایت ہے۔ مولانا مقبول احمد صاحب نے بھی اپنے مترجمہ قرآن کے حاشیہ پر یہی لکھا ہے۔ (تفسیر القرآن ص: ۲۱۹ ج: ۱)

مولانا فرمان علی صاحب نے اس آیت کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت رسولؐ آل ابراہیم سے ہیں۔ ان کا یہ قول ہے کہ محمد و آل محمد حضرت ابراہیم کے اہلبیت ہیں پس اس آیت سے صریح طور پر ثابت ہوا کہ خدا نے حضرت رسولؐ اور ان کے اہلبیت کو سارے جہاں سے افضل بنایا۔ (تفسیر در منثور ص: ۱۷ ج: ۲)

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾

سورۂ الاحزاب آیت : ۳۳

ترجمہ : اے (پیغمبر کے) اہلبیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا ہی پاک و پاکیزہ رکھے۔

تفسیر : اس پر تو تمام علماء کا اتفاق ہے کہ اہلبیت سے مراد حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ ہیں اور یہ بھی متفقہ علیہ ہے کہ یہ آیت ان ہی بزرگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ لیکن چونکہ یہ آیت ازواج محرمات سے متعلق آیات کے بیچ میں ہے لہٰذا بعض حضرات اہل سنت کا خیال ہے کہ اس میں ازواج بھی شامل ہیں۔ مگر چند وجوہ کی بناء پر یہ خیال درست نہیں ہے۔ متعدد علماء نے ان وجوہات پر تفصیلی بحث کرکے ثابت کیا ہے کہ اہلبیت میں ازواج رسول کسی طرح بھی شامل نہیں۔

(تفصیل کیلئے تفسیر القرآن ملاحظہ ہو)

ویسے بھی اہلبیت رسول کے فضائل میں جتنی بھی آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کو کوئی نہ کوئی تاویل کرکے فضیلت سے ہٹانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ مگر آیۂ مباہلہ ایک ایسی آیت ہے جس کی کوئی تاویل بن نہیں پڑی کیونکہ اس میں عملی صورت شامل تھی۔

علمائے اسلام میں امام احمد ابن حنبلؒ، ابن مردویہ، ثعلبی اور سیوطی وغیرہ نے تقریباً تیس حدیثیں اس مضمون کی تحریر کی ہیں کہ جب آنحضرتؐ ام سلمہؓ کے گھر میں آئے تو حضرت علی و فاطمہ و حسن و حسین کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور پھر اپنے سمیت سب کو ایک چادر اڑھا دی اور دعا کی، خداوندا یہ میرے اہلبیت ہیں ان کو ہر برائی سے دور رکھ اور ہر طرح پاک و پاکیزہ رکھ۔ یہ سن کر ام سلمہؓ نے بھی داخل ہونا چاہا تو روک دی گئیں اور حکم ہوا تم اہلبیت میں نہیں ہو بلکہ ازواج میں ہو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اسکے بعد مدتوں ہر نماز کے وقت جب آنحضرتؐ حضرت علیؑ کے مکان کے پاس آتے تو چوکھٹ تھام کر فرماتے السلام علیکم یا اھل البیت۔ (تفسیر در منثور ص: ۱۹۸ ج: ۵)

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝۲۳

سورۂ الشوریٰ آیت : ۲۳

ترجمہ : (اے رسول) تم کہدو کہ میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہلبیت) کی محبت کے سواتم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا اور جو شخص نیکی حاصل کرے گا ہم اس کیلئے اس کی خوبی میں اضافہ کردیں گے۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے۔

تفسیر : اس آیت کی شان نزول کی بابت مروی ہے کہ ایک روز انصار ایک بڑے جلسے میں اپنے فخر و مباہات بیان کر رہے تھے کہ ہم نے یہ کیا اور وہ کیا۔ حضرت عباس یا ابن عباس سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ تم لوگوں کو فضیلت سہی مگر ہم لوگوں پر ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اس مناظرہ کی خبر حضرت رسول کو پہنچی تو آپ خود ان کے مجمع میں تشریف لائے اور فرمایا اے گروہ انصار کیا تم ذلیل نہ تھے کہ خدا نے ہماری بدولت تمہیں معزز کیا۔ سب نے کہا بیشک۔ پھر فرمایا کیا تم لوگ گمراہ نہ تھے تو خدا نے میری وجہ سے تمہاری ہدایت کی۔ عرض کی یقیناً پھر فرمایا تو کیا تم لوگ میرے مقابل میں جواب نہیں دیتے۔ وہ بولے کیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ تمہاری قوم نے تم کو نکال باہر کیا تو ہم نے پناہ دی' تمہاری قوم نے جھٹلایا تو ہم نے تصدیق کی' تمہاری قوم نے تم کو ذلیل کیا تو ہم نے مدد کی غرض اسی قسم کی باتیں فرماتے جاتے تھے یہانتک کہ وہ لوگ اپنے زانوؤں کے بل بیٹھے اور عاجزی سے عرض کرنے لگے ہمارا مال اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب خدا اور رسول کا ہے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا جو شخص آل محمد کی دوستی پر مر جائے وہ شہید مرتا ہے۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر مرے وہ توبہ کر کے مرا۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر

مرے کامل الایمان مرا۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر مرا اس کو ملک الموت اور منکر نکیر بہشت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر مرا وہ بہشت میں اس طرح بھیجا جائیگا جیسے دلہن اپنے شوہر کے گھر۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر مرا اسکی قبر کو خدا رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ بناتا ہے۔ سنو جو آلِ محمد کی دوستی پر مرا وہ سنت اور جماعت کے طریقہ پر مرا۔ سنو جو آلِ محمد کی دشمنی پر مرا قیامت میں اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا کہ یہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ یاد رکھو کہ جو آلِ محمد کی دشمنی پر مرا وہ کافر ہے۔ سن رکھو کہ جو آلِ محمد کی دشمنی پر مرا وہ بہشت کی بو بھی نہیں سونگھے گا۔ پھر اسی وقت کسی نے پوچھا' یا حضرت جن کی محبت کو خدا نے واجب کیا ہے وہ کون ہیں۔ فرمایا علی فاطمہ اور ان کے بیٹے حسن اور حسین ہیں۔ پھر فرمایا جو شخص میرے اہلبیت پر ظلم کرے اور مجھے میری عترت کے بارے میں اذیت دے اس پر بہشت حرام ہے۔

(تفسیر کشاف ص : ٦٧ ج : ۳' اور تفسیر در منثور' صحیح بخاری و صحیح مسلم و مسند احمد بن حنبل وغیرہ)

ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آیۂ مودۃ (۴۲ : ۲۳) نازل ہوا تو کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ہوا کہ رسول اللہؐ نے معاذ اللہ اپنی طرف سے یہ کہہ دیا ہے۔ اس پر مذکورہ آیت سے آگے والی آیت (۴۲ : ۲۴) نازل ہوئی جس کا ترجمہ ہے کہ "کیا یہ لوگ تمہاری نسبت کہتے ہیں کہ اس (رسولؐ) نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھا ہے تو اگر (ایسا ہوتا تو) خدا چاہتا تو تمہارے دلوں پر مہر لگا دیتا (کہ تم بات ہی نہ کر سکتے) اور خدا تو جھوٹ کو نیست و نابود اور اپنی باتوں سے حق کو ثابت کرتا ہے وہ یقینی دلوں کے راز سے بھی خوب واقف ہے۔" (مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن ص : ۱۹ ج : ۵)

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِـيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاۗءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹

سورۂ الدھر آیت : ۸ - ۹

ترجمہ : اور اس کی محبت میں محتاج اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تو تم کو بس خالص خدا کیلئے کھلاتے ہیں ہم نہ تم سے بدلے کے خواستگار ہیں اور نہ شکر گذاری کے۔

تفسیر : ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حسینؑ اور حسنؑ بیمار ہوئے تو حضرت رسولؐ کچھ لوگوں کے ساتھ عیادت کو تشریف لائے اور جناب امیرؑ سے فرمایا کہ بہتر ہو تا اگر تم اپنے لڑکوں کی صحت کے واسطے نذر کرتے یہ سنتے ہی جناب امیرؑ' فاطمہ زہرہ اور فضہ نے تین تین روزوں کی نذر کی۔ غرض جب دونوں صاحبزادے اچھے ہوئے اور نذر کے پورے ہونے کا وقت آیا تو گھر میں کچھ نہ تھا۔ جناب امیر نے شمعون یہودی سے تین صاع جو قرض لئے جناب سیدہ نے ایک صاع جو پیسا اور پانچ روٹیاں پکائیں۔ شام کو کھانا ہی چاہتے تھے کہ ایک سائل نے آواز دی۔ السلام علیکم یا اہل البیت محمد میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا دو خدا تمہیں جنت کے خوان عطا کرے گا۔ یہ آواز سنتے ہی سب نے اپنے اپنے آگے کی روٹیاں دیدیں۔ اور فقط پانی پی کر سو رہے اور دوسرے دن پھر روزہ رکھا جب کھانے بیٹھے تو ایک یتیم نے آواز دی اور سب نے اپنی اپنی روٹیاں اس کو دیدیں اور صرف پانی سے افطار کیا۔ تیسرے روز پھر روزہ افطار کرنے بیٹھے تھے کہ ایک قیدی نے آواز دی۔ تیسرے دن بھی ان سب بزرگواروں نے اپنی اپنی روٹیاں دیدیں۔ چوتھے دن صبح کو جناب امیر نے اپنے صاحبزادوں کے ہاتھ پکڑے اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے جب رسول اللہ کی نظر پڑی کہ بھوک کی شدت سے کانپ رہے ہیں تو فرمایا میں تم لوگوں کو کس قدر تکلیف کی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر خود اٹھے اور ان کے ساتھ جناب سیدہ کے مکان میں آئے تو فاطمہ زہرہ کو محراب عبادت میں دیکھا کہ ان کی پیٹ پیٹ

سے مل گئی ہے اور آنکھیں دھنس گئی ہیں یہ دیکھ کر حضرت کو بہت رنج ہوا کہ یکایک حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور کہا لیجئے یا رسول اللہ آپ کو مبارک ہو کہ اللہ نے یہ سورہ آپ کے اہلبیت کی شان میں نازل کی ہے اور سورہ دھر کی تلاوت فرمائی۔

(تفسیر کشاف ص : ۲۳۹ ج : ۳' اس روایت کو بیضاوی وغیرہ نے بھی لکھا ہے)

حضرت علیؑ
حدیث کی روشنی میں

جناب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ان گنت فضیلتوں کے باعث کتب احادیث میں جابجا آپ کے مناقب و فضائل کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل' امام ابی عبدالرحمٰن نسائی' شیخ الامام حاکم نیشاپوری' قاضی اسمٰعیل بن اسحاق' امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری' ابن عقدہ' حافظ ابن عبدالبر جیسے آئمہ حدیث بالاتفاق معترف ہیں کہ فضائل امیر المومنینؑ کے ضمن میں جس کثرت سے صحیح الاسناد حدیثیں وارد ہوئیں ہیں ایسی کسی اور صحابی کی شان میں نہیں آئیں۔[۱]

جناب علی مرتضیٰؑ کی شان میں کثرت سے احادیث کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا کہ خوارج اور بنوامیہ کے بُرے سلوک کا آنحضرتؐ کو پیش از پیش علم ہونے سے آنحضرتؐ نے بطور حفظ ماتقدم فضائل علیؑ بہ کثرت بیان فرمائے۔[۲]

یہ کوئی معقول و دل لگتی تاویل نہیں ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے باوجود اس علم کے کہ خلفائے ثلاثہ کو بھی مورد طعن بنایا جائیگا ان بزرگوں کے اتنے فضائل بیان نہیں فرمائے۔ علاوہ ازیں جناب رسالتمآبؐ کی ذات قدسی صفات کی جانب ایسی بے تکی باتوں کی نسبت دینا بھی سوء ادبی اور گستاخی ہے۔

---

۱ مستدرک حاکم ص: ۱۰۷ ج: ۳' استیعاب ص: ۴۷۹ ج: ۲'
۲ صواعق محرقہ ص: ۷۴' ازالۃ الخفاء ص: ۲۵۱'

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جتنا جس کے متعلق فرمایا وہ عنداللہ بھی اتنے ہی کے مستحق تھے نہ کم نہ زیادہ۔

شیعت کے خلاف چلائی جانے والی پروپیگنڈا مہم میں سے ایک پروپیگنڈا یہ بھی کیا جاتا ہے کہ "شیعوں نے ہماری کتابوں میں حضرت علیؑ کے صدہا وضعی فضائل الحاق کر دیئے ہیں۔" یہ تصور نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ کج عقلی کی دلیل بھی ہے۔ جس کی بابت ہم اس کتاب کی جلد دوئم میں تحریر کر آئے ہیں۔ یہاں ہم قارئین کی مزید توجہ کیلئے تحریر کرتے ہیں کہ اموی و عباسی ادوارِ حکومت میں حضرت علیؑ و دیگر صاحبِ فضیلت افرادِ بنی ہاشم کی تعریف و توصیف کرنا تو دور کی بات تھی ان بزرگواروں کا اعلانیہ تبلیغ دین کرنا بھی قابل سزا جرم تھا۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے حضرت علیؑ کے فرزند حضرت امام حسنؑ بھی دین کی تبلیغ اعلانیہ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا آپ اپنے گھر میں دستر خوان آراستہ فرماتے اور لوگوں کو دعوت دیتے اور دین کی باتیں بتاتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی زین العابدینؑ نے تبلیغ دین کیلئے دعاؤں کو سہارا بنایا۔ آپ دعاؤں کے ذریعہ اپنے جد کے دین کی تبلیغ فرماتے تھے۔ آپ خود غور فرمائے کہ ایسے ماحول میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ لوگ حضرت علیؑ کے فضائل وضع کر کے انہیں صحاح ستہ میں شامل کر دیں۔ نیز یہ کہ مستند آئمہ حدیث جو ایک ایک روایت کی جانچ پڑتال کر کے اور مکمل طور پر اطمینان کر لینے کے بعد روایت کو اپنی کتاب میں جگہ دیتے تھے وہ کیونکر ان وضعی روایات کو اپنی تصانیف کا جز بنا سکتے تھے۔ اگر دور حاضر کا کوئی لکھنے والا یہ کہے کہ ان کی کتابوں میں شیعوں کی ساختہ و پرداختہ روایتیں بھری پڑی ہیں تو یہ کوئی دینی خدمت نہیں بلکہ بغض علیؑ کی دلیل ہے جس کو رسالتمآبؐ نے نفاق قرار دیا ہے۔

سرکاری سطح پر فضائل علیؑ کا استیصال اور برسوں آپ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کے باوجود کتب احادیث و تاریخ میں فضائل علیؑ سے متعلق کثرت سے احادیث کا موجود ہونا اعجاز خداوندی اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حقانیت کی موثر دلیل ہے۔

حضرت علیؑ کی شان میں وارد ہونے والی کثیر احادیث جو کتب تفسیر' حدیث و تاریخ میں مرقوم ہیں ان میں سے ہم نے چند احادیث کا انتخاب کیا ہے اور وہ بھی اس حثل کے ساتھ کہ متعدد کتب میں مختلف راویوں کی مختلف الفاظ و انداز میں بیان کردہ احادیث جو معنی و مطالب کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں ہم نے ان کو ایک ہی گردانہ ہے البتہ حوالہ میں کتب کے نام و صفحہ نمبر وغیرہ درج کر دیئے ہیں۔ نیز ان احادیث کی اسناد بھی حذف کر دی ہیں جو حوالہ میں دی گئی کتب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ وہ احادیث شریف ہیں جو پیغمبر خدا فخر انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں ارشاد ہوئیں۔ اور آنحضرتؐ کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○[۱] ترجمہ: وہ تو اپنی نفسانی خواہشات سے کچھ بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

حضرت علیؑ کی شان میں وارد ہونے والی احادیث میں چند احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

حدیث: كنتُ انا وعليٌ نوراً بين يدے الله معلقاو كان ذالك النّور قبل ان يخلق الله آدم باربعة عشر الف عام فلمّا خلق الله آدم مركب ذالك النور فى صلبه فلم يزل

---

۱ سورۃ النجم آیت: ۳' ۴

فى شىءٍ واحدٍحتى افترق فى صلب عبدالمطلب فجزء انا جزء علی.

ترجمہ: میں اور علی ایک نور تھے اور وہ نور بارگاہ ایزدی کے سامنے معلق تھا اور یہ نور حضرت آدمؑ کے پیدا ہونے سے چودہ ہزار برس پیشتر موجود تھا جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا تو اس نور کو ان کی پشت میں رکھا اور وہ برابر ایک ہی رہا یہاں تک کہ عبدالمطلب کی پشت میں آ کر اس کے دو حصے ہو گئے ایک حصہ تو میں ہوں اور دوسرا حصہ علی ہے۔

(ریاض النضرہ ص: ۱۶۴ ج: ۲' ارجح المطالب ص: ۵۷۳' خواص الامۃ ص: ۷۱' ۳ خصائص علویہ ص: ۱۶۱' وجی ص: ۱۰۳)

حدیث: خلقت انا وعليٌ من نورٍ واحدٍ قبل ان يخلق الله آدم باربعة الاف عامٍ فلما خلق الله آدم ركب ذلك النور فى صلبه فلم يزل فى شيئٍ واحدٍ حتىٰ افتر تنا فى صلبه عبدالمطلب ففى النبوة وفى علي الوصيّة .

ترجمہ: میں اور علیؑ اللہ تعالیٰ کے حضرت آدم کو پیدا کرنے سے چار ہزار برس پہلے ایک نور سے پیدا کئے گئے جب اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو یہ نور ان کی پشت میں رکھا پھر لگاتار یہ نور ایک ہی رہا یہاں تک کہ عبدالمطلب کی پشت میں آ کر ہم جدا جدا ہو گئے۔ پس مجھ میں نبوت ہے اور علی میں وصایت و خلافت ہے۔ (مودۃ القربیٰ ص: ۸۴' ارجح المطالب ص: ۵۷۳' فردوس الاخبار ص: ۵۱' ریاض النضرہ ص: ۱۶۴' خواص الامۃ ص: ۷۱' ۳' خصائص علویہ ص: ۱۶۱' وجی ص: ۱۰۳)

حدیث: لِعلِي ان الله خلق الا نبياء من اشجارِشتّىٰ و خُلِقت انا وانت من شجرةٍ وّاحدةٍ فانا اصلُهاٗ وانت فرعُها والحَسنُ والحُسَينُ اغصا نهاً فمن تعلّق بغصنٍ منها ادخلهُ الله تعالىٰ الجنة .

ترجمہ : اے علی حق تعالیٰ نے پیغمبروں کو مختلف درختوں سے پیدا کیا ہے اور میں اور تو دونوں ایک درخت سے پیدا کئے گئے ہیں میں اس درخت کی جڑ ہوں اور تو فرع اور حسن اور حسین شاخیں پس جو کوئی اس درخت کی کسی شاخ سے لٹک جائے اور اس سے تعلق رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کو بہشت میں جگہ عنایت فرمائے گا۔ (کوکب دری ص : ۱۹۶' ارجح المطالب ص : ۵۷۱)

حدیث : خلقت انا وعلیٌ من شجرةٍ واحدةٍ والناس من اشجارٍ شتّٰی.

ترجمہ : میں اور علی ایک ہی درخت سے پیدا ہوئے اور دوسرے لوگ مختلف درختوں سے۔

(کنز الحقائق ص : ۱۷' انتخاب از کنز العمال ص : ۳۱' مودۃ القربیٰ ص : ۸۳)

حدیث : السبق ثلاثة فالسابق الی موسیٰ یوشع بن نون والسابق عیسیٰ صاحب الیاسین والسابق الی محمدؐ علی ابن ابی طالب.

ترجمہ : سابق الایمان تین ہیں۔ حضرت موسیٰ پر ایمان لانے والے یوشع بن نون اور حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے والے صاحب آل یٰسین اور حضرت محمدؐ پر ایمان لانے والے علی ابن ابیطالب۔

(ریاض النضرہ ص : ۱۵۸' صواعق محرقہ ص : ۲۱۳' انتخاب از کنز العمال ص : ۳۰' ارجح المطالب ص : ۴۹۴' کوکب دری ص : ۱۵۴)

حدیث : اول هذه الامة ورودًا علی الحوض واوّلها اسلاماً هو علیُّ بن ابیطالب.

ترجمہ : اس امت میں سب سے پہلے وہ شخص حوض کوثر پر وارد ہوگا جو سب سے پہلے اسلام لایا ہے اور وہ علی ابن ابیطالب ہیں۔

(استیعاب ص : ۴۷۰ ج : ۲' ریاض النضرہ ص : ۱۵۵ ج : ۲' اسد الغابہ ص : ۱۴ ج : ۲' ازالۃ الخفاء مقصد دوئم ص : ۲۶۱' انتخاب از کنز العمال ص : ۳۳' ارجح المطالب ص : ۴۸۸' کوکب دری ص : ۱۵۵)

حدیث : اولکم اسلاماً علی ابن ابی طالب

ترجمہ : تم لوگوں میں اوّل مسلم علی ابن ابیطالب ہے۔

(جامع ترمذی ص : ۴۹۲' استیعاب ص : ۴۷۰ ج : ۲' جامع صغیر ص : ۳۱' ارجح المطالب ص : ۴۸۸' ریاض النضرہ ص : ۱۵۷ ج : ۲' ازالۃ الخفاء مقصد : ۲ ص : ۲۵۱)

حدیث : ان هٰذا اول من امن بی هٰذا فاروق هٰذالامة وهٰذا یعسوب المومنین و هٰذا من یصافحنی یوم القیٰمة وهٰذا صدیق الاکبر

ترجمہ : (جناب علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر رسالتمآبؐ نے فرمایا) تحقیق یہ وہ ہے جو سب سے پہلے مجھ پر ایمان لایا اور یہ امت میں حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ یہ مومنوں کا امیر ہے یہ وہ ہے جو قیامت کے روز سب سے پہلے مجھ سے ملاقات کرے گا۔ یہ صدیق اکبر ہے۔

(ارجح المطالب ص : ۲۳' ینابیع المودۃ ص : ۹۲)

حدیث : لو انّ ایمان اهل السمٰوٰت والارض وضع فی کفة و وضع ایمان علی فی کفه فرجح۔

ترجمہ : اگر آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کے ایمان کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور علی کا ایمان دوسرے پلڑے میں رکھ کر دونوں کو تولا جائے تو علی کا ایمان ہی سب سے بھاری ہوگا۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوئم ص : ۲۵۶' ۲۵۹' ریاض النضرہ ص : ۲۲۶ ج : ۲' مودۃ القربیٰ ص : ۷۳)

حدیث : قد امتحن الله قلبه بالایمان

ترجمہ : خدائے تعالیٰ نے علی کے دل کی آزمائش ایمان کیساتھ کرلی۔ (خصائص نسائی ص : ۲۵)

حدیث : یاعلی انت اوّل المومنین ایماناً وانت اول المسلمین اسلاماً

ترجمہ : اے علی تم ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے مومن ہو اور اسلام لانے والوں میں سب سے پہلے مسلمان ہو۔

(استیعاب ص : ۴۵۷ ج : ۲' ریاض النضرہ ص : ۱۵۷' ۱۹۳ ج : ۲' ارجح المطالب ص : ۵۱' کوکب دری ص : ۱۵۴)

حدیث : صلت الملٰئکة علیّ وعلیٰ علیٍ سبع سنین قبل الناس وذلك بانه کان یصلی ولا یصلی مناغیرنا۔

ترجمہ : سات برس تک فرشتے مجھ پر اور علی پر درود پڑھتے تھے اس وجہ سے کہ علی میرے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہم دونوں کے علاوہ کوئی ہمارے ساتھ نماز پڑھنے والا نہیں تھا۔

(ارجح المطالب ص : ۵۰۴' سنن ابن ماجہ ص : ۱۲' ریاض النضرہ ص : ۱۵۸ ج : ۲' اسد الغابہ ص : ۱۷ ج : ۴' ازالۃ الخفاء مقصد : ۲ ص : ۲۵۴)

حدیث : ان علیا قد سبقك بالهجرة

ترجمہ : (آنحضرتؐ نے اپنے چچا عباس سے فرمایا) یہ تحقیق علی نے ہجرت میں تم پر سبقت کی۔

(ارجح المطالب ص : ۵۱۰' انتخاب از کنز العمال ص : ۳۴)

حدیث : انا خاتم الانبیآء وعلی خاتم الاوصیآء

ترجمہ : میں خاتم الانبیاء ہوں اور علی خاتم الاوصیاء ہیں۔

(ینابیع المودۃ ص : ۳ ج : ۲ حوالہ دیلمی' خوارزمی' محب طبری)

حدیث : هٰذا علیّ اخی فی الدنیا والاٰخرة وخلیفتی فی اهلی و وصیی فی امتی و وارث علمی.

ترجمہ : یہ علی دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے اور اہلبیت میں میرا جانشین ہے اور میری امت میں میرا وصی اور میرے علم کا وارث ہے۔ (مسند احمد حنبل ص : ۱۵۵ ج : ۱' خصائص نسائی ص : ۳' مودۃ القربیٰ ص : ۶۰' طبری ص : ۶۳ ج : ۲)

حدیث : هٰذا ولی ویودّی عنّی دینی و انا موالی من والاہُ ومعادی من عاداہُ

ترجمہ : یہ علی میرا ولی ہے اور میرا قرض ادا کریگا میں اُس سے محبت رکھتا ہوں جو اس سے محبت رکھے اور اُس سے دشمنی رکھتا ہوں جو اس سے دشمنی رکھے۔ (خصائص نسائی ص : ۳)

حدیث : یا علیُ انت اخی فی الدنیا والاٰخرة

ترجمہ : اے علی تو میرا بھائی ہے اس دنیا اور آخرت میں۔

(استیعاب ص : ۴۷۳ ج : ۲' جامع صغیر ص : ۵۶' ۴۹۱' ریاض النضرہ ص : ۱ ج : ۲' کنیز الحقائق ص : ۲۰' اصابہ ص : ۲۶۹ ج : ۴' اسد الغابہ ص : ۱ ج : ۴' ترمذی ص : ۱۳۳ ج : ۲' مشکوٰۃ مترجم ص : ۲۲۶ ج : ۳' انتخاب از کنیز العمال ص : ۳' طبقات ابن سعد ص : ۱۳ ج : ۳' کوکب دری ص : ۱۵۵' مودۃ القربیٰ ص : ۹۱)

حدیث : ان هٰذا اخی و وصیّی وخلیفتی من بعدی فاسمعوا له واطیعوهُ

ترجمہ : یہ میرا بھائی' میرا وصی اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے۔ ان کی بات مانو اور اس پر عمل کرو۔

(تاریخ طبری ص : ۶۳ ج : ۲' تاریخ الکامل ص : ۶۲ ج : ۲' تاریخ ابوالفدا

ص: ۱۱۲ ج: ۱' البدایہ والنہایہ ص: ۳۹ ج: ۳' غایۃ المرام ص: ۳۲۰)

حدیث: لکلّ نبیِّ وصیّ وانا وصیّ علیُّ بن ابی طالب۔

ترجمہ: ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے میرا وصی علی ابن ابی طالب ہے۔

(تاریخ دمشق ص: ۵ ج: ۳' مناقب خوارزمی ص: ۴۲' ینابیع المودۃ ص: ۷۹)

حدیث: لِعليٍ انت مني و انا منك

ترجمہ: اے علی تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔

(صحیح بخاری ص: ۵۸۰ باب: ۱۰' ۳۸۲ باب: ۲۳' ۱۲ باب ۱۷' ۱۶' سنن ابن ماجہ ص: ۱۲' مسند احمد حنبل ص: ۱۰۹' ۱۱۵ ج: ۱' ۲۰۳' ۳۵۶' ۳۵۸ ج: ۵' مشکوٰۃ ص: ۱۲۰' ۸' مستدرک ص: ۷۰ ج: ۳' جامع ترمذی ص: ۲۹۱' ۳' خصائص نسائی ص: ۴۴' ازالۃ الخفاء ص: ۱۹۱' ۲۵۷ مقصد دوئم' اسد الغابہ ص: ۷ ج: ۴' کنز الحقائق ص: ۶۳' اصابہ ص: ۲۷۱ ج: ۲ اور غیرہ)

حدیث: ان الله تبارك و تعالىٰ ايّد هذا الدّين بعليٍ و انه منّى وانا منه

ترجمہ: اللہ تبارک و تعالیٰ نے علی سے اس دین کی امداد کی اور وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ (مودۃ القربیٰ ص: ۸۳)

حدیث: ان علياً مني و انا من عليٍ وهووليّ كل مومنٍ و مومنة بعدی لايو ذِّي عنّى ديني الاعليٌ

ترجمہ: علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور وہ میرے بعد ہر مومن و مومنہ کا ولی اور حاکم ہے اور میرے دین کو میری طرف سے علی کے سواء کوئی اور ادا نہ کریگا۔

(مشکوٰۃ مترجم ص: ۲۴۵ ج: ۳' کوکب دری ص: ۱۵۳' مسند احمد بن حنبل ص: ۲۵ ج: ۵' مستدرک ص: ۱۳۴ ج: ۳)

حدیث: بشريا علی حياتك و موتك مني

ترجمہ: خوش ہوا اے علی تیرا جینا اور مرنا میرے ساتھ ہے۔

(انتخاب از کنز العمال ص: ۳۳)

حدیث: يا علی انت صفی و امينی

ترجمہ: اے علی تم میرے بہترین دوست اور امانت دار ہو۔

(خصائص نسائی ص: ۳۵' انتخاب از کنز العمال ص: ۴۴)

حدیث: من احبك فقد احبّنی حبك حبی و حبی حبيب الله و عدوك عدوّى و عدوّى عدوّ الله ولويل ولمن ابغضك من بعدی

ترجمہ: (اے علیؑ) تمہارا دوست میرا دوست ہے اور میرا دوست خدا کا دوست ہے اور تمہارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے اور عذاب ہے اس شخص پر جو میرے بعد تم سے بغض رکھے۔ (مستدرک ص: ۱۲۸ ج: ۳' مودۃ القربیٰ ص: ۴۷' کوکب دری ص: ۱۵۸' نور الابصار: ۸۵)

حدیث: عليٌ منّى بمنزلته الراس من جسدی

ترجمہ: علی کو میرے ساتھ وہ رشتہ ہے جو سر کو جسم کیساتھ ہے۔

(جامع صغیر ص: ۵۶' کنز الحقائق ص: ۲۱' انتخاب از کنز العمال ص: ۳' ریاض النضرہ ص: ۱۶۴ ج: ۲' صواعق محرقہ ص: ۱۲۳' مودۃ القربیٰ ص: ۷۵' کوکب دری ص: ۱۹۴' ارجح المطالب ص: ۵۸۳)

حدیث: عليٌ منّى بمنزلتی من ربّی

ترجمہ: علی کا مجھ سے وہی تعلق ہے جو میرا میرے پروردگار سے ہے۔

(لسان المیزان ص: ۱۹۱ ج: ۵' اعاز القصص ص: ۶۳' احقاق الحق ص: ۲۱۷ ج: ۷' ارجح المطالب ص: ۵۸۳)

حدیث: انا المنذر و عليٌ الهادی وبك يا عليٌ يهتدی المهتدون من بعدی

ترجمہ: میں ڈرانے والا ہوں اور علی ہدایت دینے والا ہے۔ اے علی ہدایت کے طالب میرے بعد تم سے ہدایت حاصل کریں گے۔ (جامع البیان فی تفسیر القرآن ص: ۱۰۸ ج: ۱۳' تفسیر کبیر ص: ۲۷۱ ج: ۵' تفسیر القرآن العظیم ص: ۵۰۲ ج: ۲' تفسیر فتح القدیر ص: ۷۰ ج: ۳' تفسیر در منثور ص: ۴۵ ج: ۴' شواہد التنزیل ص: ۲۹۳ ج: ۱)

حدیث: لِعليٍّ انت منّى بمنزلته هارون من موسى الا انه لانبی بعدی

ترجمہ: اے علی تمہارا رتبہ میرے نزدیک ایسا ہے جیسا ہارون کا موسیٰ سے تھا سوائے اس کے کہ میرے بعد نبی نہیں۔

(صحیح بخاری ص: ۳۸۷' باب: ۱۳' ص: ۸۹' باب: ۱۸' صحیح مسلم ص: ۲۷۸ ج: ۲' ص: ۳۰۷ ج: ۶' سنن ابن ماجہ ص: ۱۲' مشکوٰۃ ص: ۱۱۹ ج: ۸' مستدرک ص: ۳۳۷ ج: ۲' ص: ۱۹ ج: ۳' جامع صغیر ص: ۵۶' اصابہ ص: ۲۵ ج: ۲۷۰' جامع ترمذی ص: ۲۹۱' مسند احمد حنبل ص: ۱۷۰' ۳۳۱ ج: ۱' ۳۲' ۳۳۸ ج: ۳' ص: ۳۶۹' ۴۳۸ ج: ۶' ازالۃ الخفاء ص: ۲۶۰ مقصد دوئم' مودۃ القربیٰ: ۷۵' کوکب دری ص: ۱۵۳' اسد الغابہ ص: ۲۵ ج: ۳' ریاض النضرہ ص: ۱۸۸' ۲۰۳ ج: ۲' انتخاب از کنز العمال ص: ۵۳' کنز الحقائق ص: ۱۷۳' استیعاب ص: ۴۷۲ ج: ۲ وغیرہ)

حدیث: لِعليٍ دمك دمی لحمك لحمی قلبك قلبی نفسك نفسی روحك روحی

ترجمہ: اے علی تیرا خون میرا خون ہے تیرا گوشت میرا گوشت ہے تیرا دل میرا دل ہے تیرا نفس میرا نفس ہے تیری روح میری روح ہے۔ (کنز العمال ص: ۱۶۸ ج: ۹' انتخاب از کنز العمال ص: ۶۳' کوکب دری ص: ۱۶۴)

حدیث: يا علی انت سيد فی الدنيا وسيد فی الأخرة

ترجمہ: اے علی تم دنیا میں بھی سردار ہو اور آخرت میں بھی سردار ہو۔

(مستدرک ص: ۱۲۸ ج: ۳' نور الابصار ص: ۸۵' مودۃ القربیٰ ص: ۴۷)

حدیث: ياعلی انت خيرامتی فی الدنيا والاخرة

ترجمہ: اے علی تم دنیا و آخرت میں میری تمام امت سے بہتر ہو۔ (جامع صغیر ص: ۸' کنز الحقائق ص: ۱۳' ارجح المطالب ص: ۲۱)

حدیث: عليٌّ خيرُالبشر بعدی مَن ابی فقد كَفَر

ترجمہ: علی میرے علاوہ سب آدمیوں سے بہتر ہے جو انکار کرے بیشک وہ کافر ہے۔ (ینابیع المودۃ ص: ۲۴۶' ارجح المطالب ص: ۳۱' مودۃ القربیٰ ص: ۴۰' کوکب دری ص: ۱۹۳)

حدیث: انا وهذا حجة علیٰ خلقه يوم القيٰمة

ترجمہ: میں اور یہ (علیؑ) مخلوق خدا پر روز محشر حجت ہیں۔

(انتخاب از کنز العمال ص: ۳۴' مودۃ القربیٰ ص: ۳۶)

حدیث: المبارزة علی العمروبن عبدودافضل اعمال امتی الی يوم القيٰمة

ترجمہ: (جنگ خندق میں) علیؑ کا عمرو بن عبدود سے لڑنا میری امت کے تمام اعمال سے جو وہ قیامت تک کرتے رہیں گے افضل ہے۔ (مستدرک ص: ۳۲ ج: ۳)

حدیث: ذكر علیٍ عبادة

ترجمہ: علی کا ذکر کرنا عبادت ہے۔ (خوارزمی ص: ۲۵۲' کنز العمال ص: ۱۵۲ ج: ۶' جامع صغیر ص: ۱۶' کنز الحقائق ص: ۱۲۰' صواعق محرقہ ص: ۷۳' مودۃ القربیٰ ص: ۱۱۱' کوکب دری ص: ۱۹۱' ارجح المطالب ص: ۱۲۱)

حدیث: النظر الیٰ وجہ علیٍ عبادة

ترجمہ: علی کے چہرہ پر نظر کرنا عبادت ہے۔

(خوارزمی ص: ۲۵۲؛ دیلمی ص: ۲۲۶؛ مستدرک ص: ۱۴۲ ج: ۳؛ کنزالعمال ص: ۱۵۶ ج: ۶؛ ازالۃ الخفا ص: ۲۶۳ مقصد: ۳؛ صواعق محرقہ ص: ۷۴؛ ریاض النضرہ ص: ۲۱۹ ج: ۲؛ مودۃ القربیٰ ص: ۱۱۱؛ کوکب دری ص: ۱۶۱)

حدیث: حب علیٍ یاکلُ الذنوب کما تاکل النار الحطبَ

ترجمہ: علی کی محبت گناہوں کو ایسا کھاجاتی ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔ (دیلمی ص: ۹۳؛ کنزالعمال ص: ۱۵۸ ج: ۶؛ ریاض النضرہ ص: ۲۱۵ ج: ۲؛ کنزالحقائق ص: ۱۰۴؛ صواعق محرقہ ص: ۷۵؛ مودۃ القربیٰ ص: ۶۳؛ کوکب دری ص: ۱۵۷)

حدیث: انہ لا یحبّک الا المومنین و لا یبغضک الا لمنافق

ترجمہ: (اے علیؑ) تمہیں دوست نہیں رکھے گا مگر مومن اور تم سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔ (جامع ترمذی ص: ۴۶۲؛ سنن ابن ماجہ ص: ۱۲؛ سنن نسائی ص: ۱۷۱ ج: ۲؛ استیعاب ص: ۴۷۴ ج: ۲؛ مشکوٰۃ مترجمہ ص: ۴۴۴ حصہ: ۳؛ اصابہ ص: ۱۷۱ ج: ۶؛ ازالۃ الخفاء ص: ۲۶۴ مقصد: ۲؛ اسدالغابہ ص: ۲۶ ج: ۴؛ ریاض النضرہ ص: ۲۱۴ ج: ۲؛ انتخاب از کنزالعمال ص: ۳۰؛ مودۃ القربیٰ ص: ۳۱؛ کوکب دری ص: ۱۹۰)

حدیث: اللھم ادرك الحق معہ حیث دار

ترجمہ: اے اللہ حق کو ادھر پھیر دے جدھر علی جائے۔

(جامع ترمذی ص: ۴۶۰؛ مشکوٰۃ ص: ۱۳۹ ج: ۸؛ ریاض النضرہ ص: ۳۸ ج: ۱؛ ازالۃ الخفاء ص: ۲۷۹ مقصد: ۲؛ انتخاب از کنزالعمال ص: ۳۰؛ کوکب دری ص: ۱۲۶) یہی حدیث رحم اللہ علیاً (اللہ تعالیٰ علی پر رحمت کرے) کے اضافہ سے ترمذی شریف ص: ۵۷۳ ج: ۲؛ اور البدایہ والنہایہ ص: ۳۷ ج: ۷؛ پر درج ہے)

حدیث: یاعلی لك سبع خصال لایحاجك فیھن احد یوم القیامۃ انت اول المومنین باللہ ایماناً و اوفاھم بعھد اللہ واروفھم بالرعیۃ واقسمھم بالسویۃ واعلمھم بالقضیہ واعظمھم منزلۃ عند اللہ یوم القیٰمۃ

ترجمہ: اے علی تجھ میں سات خصلتیں ایسی ہیں کہ قیامت کے روز ان میں سے کوئی تجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو خدا پر ایمان لانے میں سب مومنوں سے پہلا ہے اور خدا کے عہد کو پورا کرنے میں ان سب سے برتر ہے اور رعیت پر مہربانی کرنے میں ان سب سے زیادہ مہربان اور برابر بانٹنے میں ان سب سے پورا تقسیم کرنے والا اور ان سب سے جھگڑوں کا فیصل میں زیادہ علم والا اور قیامت کے روز خدا کے پاس سب سے اونچے مرتبہ والا ہے۔ (ارجح المطالب ص: ۴۸۹)

حدیث: قال رسول اللہ امرنی بحب اربعۃ و اخبرنی انہ یحبھم قیل سملم لنا قال علی منھم ثلاثا وسلمان وابوذر والمقداد

ترجمہ: رسول خدا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو چار شخصوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور مجھ کو خبر دی ہے کہ وہ (خدا) بھی ان کو دوست رکھتا ہے۔ اصحاب میں سے کسی نے عرض کی یا رسول اللہ ان کے نام ہمیں بھی بتایئے۔ فرمایا علی ان میں سے ہے علی ان میں سے ہے علی ان میں سے ہے۔ اور سلمان وابوذر ومقداد۔ (ترمذی ص: ۵۷۴ ج: ۲؛ ریاض النضرہ ص: ۲۱۳ ج: ۲؛ ازالۃ الخفاء ص: ۲۶۲ مقصد: ۲؛ مودۃ القربیٰ ص: ۶۴)

حدیث: من اراد ان ینظر الیٰ ادم فی علمہ والیٰ ابراھیم

فی حلمہ و الیٰ نوحہ فی حکمہ والیٰ یوسف فی جمالہ فینظر الیٰ علی ابن ابیطالب

ترجمہ: اگر کوئی شخص علم میں حضرت آدم کو، حلم میں حضرت ابراہیم کو اور حکم میں حضرت نوح کو اور جمال میں حضرت یوسف کو دیکھنا چاہے وہ علی ابن ابیطالب کو دیکھ لے۔

(ریاض النضرہ ص: ۲۱۸ ج: ۲؛ ارجح المطالب ص: ۵۶۸)

حدیث: قال مکتوبٌ علی العرش لا الہ الا اللہ ان وحدی لاشریك لی محمد عبدی ورسولی ایدتہٗ بعلیٍّ

ترجمہ: فرمایا (رسول خدا نے) عرش پر لکھا ہوا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد اس کا رسول ہے۔ میں نے علی سے اس کی مدد کی۔ (تفسیر درمنثور ص: ۱۹۹ ج: ۳؛ ریاض النضرہ ص: ۱۶۸ ج: ۲؛ انتخاب از کنزالعمال ص: ۳۵؛ مودۃ القربیٰ ص: ۵۹؛ کوکب دری ص: ۱۵۶)

حدیث: من اراد ان یحیا حیاتی ویموت مماتی ویسکن جنۃَ الخلد التی وعدنی ربی فلیوال علیَّ بن ابی طالبِ فانہ لن یخرجکم من ھدًی ولن یُدخلکم فی ضلالۃٍ

ترجمہ: جو کوئی یہ چاہتا ہے کہ میری طرح جیئے اور میری موت مرے اور خلد بریں میں رہے جس کا مجھ سے میرے پروردگار نے وعدہ کیا ہے اسے چاہیئے کہ علی ابن ابی طالب کا دوست بن جائے کیونکہ علی تمہیں کبھی ہدایت کے دائرہ سے خارج نہیں کریں گے اور نہ کبھی گمراہی کے دائرے میں داخل کریں گے۔

(مستدرک ص: ۱۲۸ ج: ۳)

حدیث: من سبّ علیاً فقد سبّنی ومن سبّنی فقد سبّ اللہ

ترجمہ: جس نے علی کو بُرا کہا اس نے مجھے بُرا کہا اور جس نے مجھے بُرا کہا اس نے خدا کو بُرا کہا۔ (مشکوٰۃ مترجمہ ص: ۴۴۷ ج: ۳؛ مودۃ القربیٰ ص: ۳۱؛ کوکب دری ص: ۱۶۱)

حدیث: من ینقص علیاً فقد ینقصنی

ترجمہ: جس نے علی کی شان گھٹائی اس نے میری شان گھٹائی۔

(ارجح المطالب ص: ۴۳۵)

حدیث: من حسد علیاً فقد حسدنی

ترجمہ: جس نے علی سے حسد کیا اس نے مجھ سے حسد کیا۔

(ارجح المطالب ص: ۶۳۵؛ انتخاب از کنزالعمال ص: ۳۴)

حدیث: من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ اللّٰھم وآل من والاہ وعاد من عاداہٗ

ترجمہ: جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔ خداوندہ دوست رکھ اس کو جو دوست رکھے علی کو اور دشمن رکھ اس کو جو دشمن رکھے علی کو۔ (مسند احمد بن حنبل ص: ۲۸؛ ۱۱۸؛ ۱۵۲ ج: ۱؛ ۳۶۸؛ ۳۷۰ ج: ۴؛ ۳۴۷؛ ۳۶۶؛ ۴۱۹ ج: ۵؛ مستدرک ص: ۱۰۹؛ ۳۷۱؛ ۵۳۳ ج: ۳؛ مشکوٰۃ ص: ۱۴۰ ج: ۸؛ جامع صغیر ص: ۱۵۴؛ کنزالحقائق ص: ۱۴؛ مودۃ القربیٰ ص: ۵۴؛ البدایہ والنہایہ ص: ۴۱۴ ج: ۵؛ غایۃ المرام ص: ۷۹)

حدیث: من کنت ولیہ فعلیٌّ ولیہ

ترجمہ: جس کا میں ولی (حاکم) اس کا علی بھی ولی ہے۔

(خصائص نسائی ص: ۴۸)

حدیث: ان تومرّ وعلیٌّ ولا اراکم فاعلین تجدوھا دیاً مھدیاً یاخذکم بکم الطریق المستقیم

ترجمہ: اگر تم علی کو اپنا امیر منتخب کرو حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ

تم ایسا نہیں کروگے تم اس کو ایک اچھا قائد اور اچھی طرح ہدایت یافتہ پاؤگے وہ تم کو صراط مستقیم کی ہدایت کریگا۔

(مشکوٰۃ ص:۱۲۸ ج:۸' مسند احمد حنبل ص:۱۰۹ ج:۱' ص:۳۵۶ ج:۵' مستدرک ص:۷۰ ج:۳' استیعاب ص:۴۷۸ ج:۲' اصابہ ص:۲۷۱ ج:۴' ازالۃ الخفاء ص:۲۷۵ مقصد:۲' اسد الغابہ ص:۳۱ ج:۴' انتخاب از کنز العمال ص:۱۹۱)

حدیث: حُبّ علیٍ ایمانٌ و بُغضہ نِفاقٌ

ترجمہ: علی کی محبت ایمان اور علی سے بغض نفاق ہے۔

(صحیح مسلم ص:۳۱۱ ج:۱' مستدرک ص:۱۲۶ ج:۳' جامع ترمذی ص:۳۶۴' سنن ابن ماجہ ص:۱۲' سنن نسائی ص:۲۷۱ ج:۲' استیعاب ص:۴۷۳ ج:۲' ریاض النضرہ ص:۲۱۴ ج:۲' اصابہ ص:۲۷۱ ج:۲' ازالۃ الخفاء ص:۲۶۴ مقصد:۲)

حدیث: انا دارُ الحکمۃ و علی بابھا

ترجمہ: میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

(مشکوٰۃ ص:۱۲۱ ج:۸' جامع ترمذی ص:۳۶۱' جامع صغیر ص:۹۳' ریاض النضرہ ص:۱۹۳ ج:۲' کنز الحقائق ص:۴۳' کوکب دری ص:۱۵۷' مشکوٰۃ مترجم ص:۲۳۶ ج:۳)

حدیث: یاعلی ان اللہ امرنی ادینک واعلماء لتعی

ترجمہ: اے علی اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے قریب رکھوں اور خزانہ علم تمہیں منتقل کردوں۔

(تفسیر در منثور ص:۲۶۰ ج:۶' حلیۃ الاولیا ص:۶۷ ج:۱' کفایۃ الطالب ص:۳۰)

حدیث: یا علی انی احب لک مااحب لنفسی واکرہ لک مااکرہ لنفسی

ترجمہ: اے علی میں تمہارے واسطے اس چیز کو پسند کرتا ہوں

جس کو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جس کو اپنے نفس کیلئے ناپسند کرتا ہوں۔

(مشکوٰۃ ص:۸ ج:۲' مسند احمد بن حنبل ص:۱۳۶ ج:۱' انتخاب از کنز العمال ص:۱۸۹' مودۃ القربیٰ ص:۶۱)

حدیث: قُسِمت الحکمۃُ عشرۃ اجزآءٍ فاعطی علیٌ تسعۃ اَجزاءٍ والنّاسُ جزءً واحداً

ترجمہ: حکمت کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ان میں سے نو حصے علی کو عطا کئے گئے اور ایک حصہ باقی آدمیوں کو۔

(استیعاب ص:۴۷۵ ج:۳' ازالۃ الخفاء ص:۲۶۷ مقصد:۲' ریاض النضرہ ص:۱۹۴ ج:۲' اسد الغابہ ص:۲۲ ج:۴' مودۃ القربیٰ ص:۴۳' کوکب دری ص:۱۵۷' البدایہ والنہایہ ص:۳۵۹ ج:۷)

حدیث: علیٌ باب مدینۃِ علمی واَبو وُلدِی

ترجمہ: علی میرے شہر علم کا دروازہ اور میرے بچوں کے باپ ہیں۔ (مستدرک ص:۱۲۶ ج:۳)

حدیث: انا مدینۃُ العلم وعلیٌ بابھا فمن ارادالعلم فلیات الباب

ترجمہ: میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے جو شہر میں آنا چاہے وہ دروازہ سے آئے۔

(صحیح ترمذی ص:۱۱۳ ج:۲' مستدرک ص:۱۲۶'۱۲۷ ج:۳' استیعاب ص:۴۷۳ ج:۲' جامع صغیر ص:۹۳' ریاض النضرہ ص:۱۹۳ ج:۲' ازالۃ الخفاء ص:۲۶۴ مقصد دوئم' کنز الحقائق ص:۱۷' انتخاب از کنز العمال ص:۳۰' کوکب دری ص:۱۵۷' البدایہ والنہایہ ص:۳۵۹ ج:۷)

حدیث: علیٌ سید المسلمین وامامُ المتقین وقائدُ الغُرّالمحَجّلین

ترجمہ: علی مسلمانوں کے سردار' متقیوں کے پیشوا اور ان لوگوں کے سالار ہیں جو روز قیامت سُر خرو ہوں گے۔

(منتخب از کنز العمال ص:۳۴ ج:۵)

حدیث: علی مع القرآن والقرآن مع علی لایفترقان حتی یردا علی الحوض

ترجمہ: علی قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علی کے ساتھ اور یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہونگے حتیٰ کہ میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں۔ (جامع صغیر' ص:۵۶' انتخاب از کنز العمال ص:۳۰' صواعق محرقہ ص:۱۲۱' غایۃ المرام ص:۵۳۹' یہ حدیث ۱۵ مرتبہ عام طریقے سے اور ۱۱ مرتبہ خاص طریقے سے نقل ہوئی۔ اسکے راوی ام سلمہ' ابن عباس' ابوبکر' عائشہ' علی' ابوسعید خدری' ابولیلی اور ابوایوب انصاری ہیں)

حدیث: علی ینجز وعدتی ویقضی دینی

ترجمہ: علی میرا وعدہ پورا کریگا اور میرا قرض ادا کریگا۔

(کنز الحقائق ص:۲۰' انتخاب از کنز العمال ص:۳۲' مشکوٰۃ مترجم ص:۲۳۵ ج:۳)

حدیث: علیٌ بابُ حطۃٍ من دخل فیہ کان مومناً ومن خرج عنہ کان کافراً

ترجمہ: علی باب حطہ ہے (یعنی گناہوں کے کفارہ کا دروازہ ہے) جو شخص اس میں داخل ہوا وہ مومن ہے اور جو شخص اس سے باہر رہا وہ کافر ہے۔

(جامع صغیر ص:۵۶' انتخاب از کنز العمال ص:۳۲' مودۃ القربیٰ ص:۳۲)

حدیث: ان النبی امر بسد الابواب الاباب علی

ترجمہ: پیغمبر خدا نے حکم دیا کہ علی کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے بند کردیے جائیں۔

(ترمذی ص:۲۱۴ ج:۲' خصائص نسائی ص:۹' ریاض النضرہ ص:۱۹۲ ج:۲' مشکوٰۃ مترجم ص:۲۴۷ ج:۳)

حدیث: ما انا سددت ابوابکم ولا فتحت باب علی ولکن اللہ سدا بوابکم و فتح باب علی

ترجمہ: میں نے تمہارے دروازوں کو بند نہیں کیا اور نہ میں نے علی کے دروازہ کو کھلا رہنے دیا بلکہ اللہ نے تمہارے دروازوں کو بند کیا اور علی کے دروازوں کو کھلا رہنے دیا۔

(خصائص نسائی ص:۳۷' مستدرک ص:۱۱۷ ج:۳' مشکوٰۃ مترجم ص:۲۴۸ ج:۳' انتخاب از کنز العمال ص:۲۹)

حدیث: یقول یوم الحدیبۃ وھواٰخذٌ بید علیٍ ھذا امام البررۃ وقاتل الکفرۃ منصورٌ من نصرہ مخذول من خذلہ یمدُّ ھا بصوتہٖ

ترجمہ: حدیبیہ کے دن علی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بہ آواز بلند آنحضرتؐ فرماتے تھے کہ علی نیکیوں کا پیشوا ہے اور کافروں کا قاتل ہے جو کوئی اسکی نصرت کرے گا خدا بھی اسکی نصرت کریگا اور جو کوئی اسکی نصرت ترک کریگا خدا بھی اسکی نصرت ترک کریگا۔ (ارجح المطالب ص:۳۱' مودۃ القربیٰ ص:۵۶)

حدیث: انت یاعلیٌ! تبین لاُمتی مااختلفوفیہ من بعدی

ترجمہ: اے علی! جس بات میں میری امت میں میرے بعد اختلاف ہو تم اس بات کو واضح کردینا۔

(مستدرک ص:۱۲۲ ج:۳' تاریخ دمشق ص:۴۸۸ ج:۲' مناقب خوارزمی ص:۲۳۶' کنز الحقائق ص:۲۰۳' منتخب کنز العمال ص:۳۳ ج:۵' ینابیع المودۃ ص:۱۸۲)

حدیث: انّ اللہ تعالیٰ جعل ذریۃ کل نبیٍ فی صُلبہٖ

وجعل ذریتی فی صلب علی ابن ابی طالب
ترجمہ : خداوند عالم نے ہر نبی کی ذریت کو اسکے صلب میں قرار دیا اور میری ذریت کو علی ابن ابیطالب کے صلب میں قرار دیا۔
(صواعق محرقہ ص : ۲۱۲٬۱۵۴ مودۃ القربی ص : ۶۳ کوکب دری ص : ۱۶۵)

حدیث: اللهم لاتمتنی حتی ترنی علیاً
ترجمہ : اے اللہ مجھ کو مت مار یو جبتک میں علی کو دیکھ نہ لوں۔
(ترمذی ص : ۸۷۵ (مطبوعہ نولکشور) مشکوٰۃ مترجمہ ص : ۲۲۷ حصہ : ۳٬ کوکب دری ص : ۱۶۱)

حدیث: اللهم بارك فيها وبارك عليهما وبارك فی نسلهما
ترجمہ : بارالہا! ان دونوں (علیؑ و فاطمہؑ) کو برکت دے ان دونوں پر برکت نازل کر اور ان کی نسل میں بھی برکت دے۔
(اصابہ ص : ۳۶۶ ج : ۴)

حدیث: ان الله سيهدی قلبك ويثبت لسانك
ترجمہ : (اے علیؑ) اللہ تیرے دل کو ہدایت کرے گا اور تیری زبان کو ثابت رکھے گا۔ (خصائص نسائی ص : ۳۶)

حدیث: انا وعلی وفاطمة وبناهما لفی مكان واحد
ترجمہ : میں و علی و فاطمہ اور ان کے بچے ایک مکان ہیں۔
(کنزالعمال ص : ۳۹۰ ج : ۶٬ ازالۃ الخفاء ص : ۲۶۲ مقصد : ۲)

حدیث: لولم يخلق علیٌ ماكان لفاطمة كفوٌ
ترجمہ : اگر علی پیدا نہ ہوتے تو فاطمہ کا کوئی کفو نہ تھا۔
(کنزالحقائق ص : ۱۴۷٬ مودۃ القربی ص : ۵۷)

حدیث: ان الله امرنی ان ازوّج فاطمه عن علی
ترجمہ : اللہ نے حکم دیا کہ میں فاطمہ کی تزویج علی سے کر دوں۔
(انتخاب کنزالعمال ص : ۱۰۰ کنزالحقائق ص : ۷۴ ج : ۱٬ طبرانی ص : ۲۱۳)

کہانتک کوئی بیان کرے مناقبِ علیؑ ابن ابیطالب٬ کہانتک کوئی گنوائے فضائلِ علیؑ ابن ابیطالب اور کہاں سے ڈھونڈ کے لائے کوئی ہمسر علیؑ ابن ابیطالب۔ علیؑ وہ ہیں جو پیدا ہوئے کعبہ میں اور شہادت پائی مسجد میں٬ علیؑ وہ ہیں جن کی تربیت فرمائی رحمت اللعالمینؐ نے٬ علیؑ وہ جو قرآن کیساتھ ہیں اور قرآن ان کے ساتھ ہے٬ علیؑ وہ ہیں جو حق کیساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ ہے٬ علیؑ وہ ہیں جن کی ایک ضربت امت کی قیامت تک کی عبادت سے افضل ہے٬ علیؑ وہ ہیں جن کا دیکھنا بھی عبادت اور ذکر کرنا بھی عبادت٬ علیؑ وہ ہیں جن کی محبت عبادت ہے اور بغض نفاق٬ علیؑ وہ ہیں جو اللہ ورسول کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ ورسولؐ انکو دوست رکھتے ہیں٬ علیؑ وہ ہیں جو پوشیدہ و اعلانیہ خیرات کرتے ہیں اور مسکینوں و یتیموں کو شکم سیر کراتے ہیں٬ علیؑ و نبیؐ کا نور ایک شجر ایک٬ علیؑ و نبیؐ کا گوشت ایک خون ایک٬ علیؑ اللہ کے ولی بھی ہیں اور وصی رسولؐ بھی٬ علیؑ نفسِ رسول بھی ہیں اور زوج بتول بھی٬ علیؑ سابق الایمان بھی ہیں اور سابق الصلوٰۃ بھی٬ علی خیر البشر بھی ہیں اور خیر الامت بھی٬ علیؑ وارث علم لدنی بھی ہیں اور شہر علم کا دروازہ بھی٬ علیؑ سید الوصیین بھی ہیں اور امام المتقین بھی٬ علیؑ ولیوں کے ولی بھی ہیں اور قلندروں کے رہبر بھی٬ علیؑ صدیق اکبر بھی ہیں اور فاروق اعظم بھی٬ علیؑ خیر البریہ بھی ہیں اور کرم اللہ وجہہ بھی٬ علیؑ حکمت کا در بھی ہیں اور حلم کا مینار بھی٬ علیؑ مولائے امت بھی ہیں اور مشکل کشاء بھی٬ علیؑ باب حطہ بھی ہیں اور عز الثقلین بھی٬ علیؑ شب ہجرت بستر رسولؐ پر بھی ہیں اور یوم فتح مکہ دوش پیمبرؐ پر بھی٬ علیؑ خاتونِ جنت کے شوہر بھی ہیں اور سرداران جنت کے پدر بھی٬ علیؑ "لافتی الا علیؑ" بھی ہیں اور کرار غیر فرار بھی٬ علیؑ علمدار لشکر رسولؐ بھی ہیں اور صاحب ذوالفقار بھی٬ علیؑ فاتح خندق و خیبر بھی ہیں اور غیر فرار احد و حنین بھی٬ علیؑ آیہ تطہیر میں بھی ہیں اور آیہ مباہلہ میں بھی٬ علیؑ

چار یاروں میں بھی ہیں اور پنجتن پاک میں بھی٬ علیؑ عشر مبشرہ میں بھی ہیں اور بارہ اماموں میں بھی٬ علیؑ صلح حدیبیہ میں بھی ہیں اور بیعت رضوان میں بھی٬ کیا شان ہے شان علی ابن ابیطالب۔ انہی علیؑ کی شان میں حضرت امام شافعی علیہ رحمۃ نے فرمایا ہے کہ۔

اِلیٰ مَا اَلا مُ وَ حَتّیٰ مَتیٰ   اُعَاتِبُ فِی حُبِّ هٰذَا الْفَتیٰ
فَهَل زُوِّجَت فَاطِمَةُ غَیْرُہُ   وَفِیْ غیرہٖ هَلْ اَتیٰ هَلْ اَتیٰ

ترجمہ : اس جوان کی محبت میں مجھے کب تک لوگ ملامت کریں گے۔ کیا فاطمہؑ کا شوہر ان کے سوا کوئی اور ہے ؟ کیا ان کے سوا کسی اور کی شان میں بھی سورۂ ھل اتی نازل ہوا ہے ؟

ترجمہ: اللہ ہی کے بہترین نام ہیں، اور تم انہی ناموں سے پکارا کرو۔ (القرآن)
وظائف اسماء الحسنیٰ
مرتبہ: ارتضٰی بن رضا نواز پوری
اس کتاب میں اللہ کے پاک و پاکیزہ نام،
ان ناموں کے خواص، ابجد قمری کے حساب سے انکے اعداد،
ورد کرنے کے اوقات و ایام اور طریقہ استخراج اسمِ اعظم وغیرہ
اردو اور انگریزی میں درج کئے گئے ہیں۔
ہدیہ: -/36 روپے

اولادِ امیر المومنینؑ

حضرت علیؑ کی اولاد سے متعلق مورخین و نسابین کے متضاد بیانات پائے جاتے ہیں جن کے باعث قارئین اکثر و بیشتر الجھن کا شکار رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہاں اولاد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بابت قدرے تفصیل سے جائزہ لیں گے۔ گرچہ ہم آپ کی اولاد کا مختصر تذکرہ اس کتاب کی جلد دوئم میں تحریر کر چکے ہیں۔

نسب نگاروں نے حضرت علیؑ کی اولاد کی کم سے کم تعداد ستائیس اور زیادہ سے زیادہ تینتیس بیان کی ہے۔ جیساکہ شیخ مفید علیہ رحمۃ اور شیخ محمد عباس قمی نے ستائیس [1]٬ عبیداللہ امر تسری نے اٹھائیس [2]٬ ریاض ہاشمی نے انتیس [3] اور سید ظفریاب ترمذی نے حافظ محمد بن شہر آشوب اور مولانا عارف حسین صاحب کے حوالوں سے تینتیس فرزندان و دختران کی تفصیل تحریر فرمائی ہے [4]۔ مورخین نے بعض اولاد کے ناموں اور ان کی ماؤں کی بابت بھی اختلافی بیانات تحریر کئے ہیں۔ ہم یہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بیان کردہ ناموں کی فہرست مرتب کر کے مورخین کے اختلافی بیانات کی روشنی میں جائزہ لے رہے ہیں تاکہ بات واضح ہو سکے۔

---

[1] منتہی الامال ص : ۲۲۹ ج : ۱٬ [2] ارجح المطالب ص : ۸۳۲٬ [3] الکرار ص : ۳۹۸٬
[4] تاریخ انوار السادات ص : ۱۳۱٬

نمبر شمار	ماؤں کے نام	فرزندان	دختران
۱	جناب فاطمہ زہراؑ	حسنؑ، حسینؑ، محسن☆	زینب کبریٰ، ام کلثوم
۲	جناب خولہ بنت جعفر حنفیہ	محمد اکبر (محمد حنفیہ)	-
۳	جناب ام البنین بنت حزام	عباس، جعفر، عثمان اور عبداللہ	-
۴	جناب ام حبیب بنت ربیعہ	عمر اکبر، عباس اصغر	رقیہ
۵	جناب ام سعید بنت عروہ	-	رقیہ کبریٰ، رقیہ صغریٰ، زینب صغریٰ، ام کلثوم صغریٰ، ام اکرام، ام سلمہ اور رملہ
۶	جناب ام شعیب مخزومیہ	-	ام الحسن اور رملہ
۷	جناب لیلیٰ بنت مسعود نہشلیہ	عبداللہ اور ابو بکر	-
۸	جناب امامہ بنت ابو العاص	محمد اوسط	-
۹	جناب محیاۃ بنت امراء القیس	احمد -	خدیجہ، تممہ، ام ہانی، میمونہ، فاطمہ اور آمنہ
۱۰	جناب اسماء بنت عمیس	یحییٰ، عون اور محمد اصغر	-

☆ چونکہ محسن کی ولادت نہیں ہوئی بلکہ ساقط ہو گئے تھے لہٰذا بہت سے مورخین نے ان کا ذکر نہیں کیا اور جنھوں نے ذکر کیا بھی ہے انہوں نے ان کو اولاد علیؑ کی تعداد میں شمار نہیں کیا۔

مذکورہ فہرست کے مطابق زوجہ اول کی اولاد پر جملہ مورخین متفق ہیں۔ زوجہ دوئم کی اولاد پر بھی اتفاق ہے۔ زوجہ سوئم جناب ام البنین کے چار فرزندان پر بھی متفق ہیں لیکن عبیداللہ امرتسری نے ایک اور فرزند بنام عمر کا اضافہ کیا ہے اور عبداللہ کے بجائے عبیداللہ لکھا ہے۔ زوجہ چہارم ام حبیب کے فرزند عمر اکبر اور دختر رقیہ جڑواں پیدا ہوئے۔ سید نجم الحسن فضلی صاحب نے ام حبیب کو ام ولد بتایا ہے۔[1] نیز نساب سید کاظم یمانی نے ایک اور فرزند عباس اصغر کو عمر اکبر کا حقیقی بھائی بتایا ہے۔ ناسخ التواریخ میں بھی عباس اصغر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ عباس اصغر حیات امیر المومنینؑ میں انتقال کر گئے تھے کیونکہ وارثوں کے تذکرے میں ان کا نام نہیں آیا ہے۔[2] زوجہ پنجم ام سعید و زوجہ ششم ام شعیب اور زوجہ نہم محیاۃ کی اولاد کی بابت مورخین کے بیانات میں کثیر اختلاف ہے۔ جسکی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ ان تینوں ازواج کے نرینہ اولاد نہیں تھی صرف اولاد اناث تھی جنکے ناموں میں یکسانیت کے باعث اختلاف کی بہت گنجائش ہے۔ جیساکہ شیخ عباس قمی نے ام الحسن، رملہ کبریٰ، نفیسہ، زینب صغریٰ اور رقیہ صغریٰ کو ام سعید کی دختران بتایا ہے جبکہ ام الحسن اور رملہ کبریٰ کو ام شعیب کی بیٹیاں بتایا ہے۔ اور محیاۃ کی اولاد کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ نیز ام ہانی، ام الکرام، امامہ، جمانہ، ام سلمہ، میمونہ اور خدیجہ کو ام الولد کے بطن سے بتایا ہے۔

اسی طرح عبیداللہ امرتسری نے ان تینوں ازواج یعنی ام سعید، ام شعیب اور محیاۃ کی اولاد کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرنے کے بجائے رملہ، ام الحسن، زینب صغریٰ، امامہ، میمونہ، حذیفہ، فاطمہ، ام ہانی، ام الکرام اور ام سلمہ کو متفرق ماؤں سے لکھ کر بات ختم کر دی۔

[1] اشراف عرب ص: ۵۸، [2] حوالہ صحیفہ وفا ص: ۱۰۷

اسی طرح ریاض بنارسی نے ام ہانی، میمونہ، زینب صغریٰ، ام کلثوم صغریٰ، فاطمہ، رملہ، خدیجہ، ام الکرام، ام سلمہ، ام جعفر اور حمامہ کو محیاۃ کی دختران بتایا ہے جبکہ ام الحسن اور رملہ کبریٰ کو ام سعید کی دختران ظاہر کیا ہے۔

زوجہ ہفتم لیلیٰ کو سید ظفریاب ترمذی صاحب نے ہملہ بنت مسروق نہشلیہ تحریر کیا ہے جبکہ دیگر تمام کتب میں ان کا نام لیلیٰ بنت مسعود نہشلیہ لکھا ہے۔ ان دونوں ناموں کی مماثلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتابت میں غلطی ہوئی جسکی تصحیح نہ ہو سکی۔ بہر حال لیلیٰ کے ایک بیٹے ابو بکر کی بابت شیخ عباس قمی اور عبیداللہ امرتسری نے تحریر کیا کہ ان کا نام محمد اصغر اور کنیت ابو بکر تھی جبکہ بعض نے ان کا نام عبیداللہ بتایا ہے۔ زوجہ ہشتم امامہ کے بیٹے محمد اوسط کا شیخ عباس قمی نے ذکر ہی نہیں کیا۔ اور زوجہ دہم اسماء کے صرف ایک بیٹا یحییٰ بتایا ہے۔ جب کہ ریاض بنارسی اور سید نجم الحسن فضلی نے اسماء کے دو بیٹے محمد اصغر اور یحییٰ تحریر کئے ہیں[1] بعض نے یحییٰ اور عون کو اسماء کے بیٹے قرار دیے جب کہ دیگر مورخین نے اسماء کے تین فرزندان یحییٰ، عون اور محمد اصغر تحریر کئے ہیں۔

دختران: اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؑ کی دس ازواج کے بطن سے سولہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ مورخین کے بیان کے مطابق ان میں چھ دختران کے نکاح ہوئے جبکہ بعض مورخین نے آٹھ دختران کی شادی کی بابت تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ باقی دختران قبل از بلوغ فوت ہو گئیں۔[2] اسی طرح سولہ فرزندان میں سے احمد، صغر سنی میں اور عباس اصغر کم عمری میں انتقال کر گئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ امیر المومنین کی شہادت کے وقت آپکے چودہ فرزندان اور آٹھ دختران بقید حیات تھیں۔

[1] اشراف عرب ص: ۵۸ [2] منتہی الامال ص: ۲۳۱ ج: ۱، تذکرۃ الخواص ص: ۲۲۸

نیز آپ کی چار ازواج ام البنین، لیلیٰ، امامہ اور اسماء بھی حیات تھیں۔[1]

اب ہم ان دختران کا ذکر کرتے ہیں جن کی شادیاں ہوئیں:

۱) زینب کبریٰ: زینب کبریٰ کا عقد عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوا۔ آپ کے حالات قدرے تفصیل سے علیحدہ عنوان کے تحت آئندہ صفحات میں تحریر ہیں۔

۲) ام کلثوم: بعض نے آپ کا نام زینب صغریٰ اور کنیت ام کلثوم تحریر کی ہے۔ آپ کا عقد محمد بن جعفر طیار سے ہوا۔

۳) میمونہ: میمونہ کا عقد عقیل بن عبداللہ بن عقیل بن ابی طالب سے ہوا۔

۴) رملہ کبریٰ: رملہ کبریٰ کا عقد ابو الہیاج عبداللہ بن مغیرہ (ابو سفیان) بن حارث بن عبد المطلب سے ہوا۔

۵) ام کلثوم صغریٰ: ابن شہر آشوب کے حوالہ سے شیخ عباس قمی نے ان کا نام نفیسہ اور کنیت ام کلثوم صغریٰ بیان کی ہے۔[2] ان کا عقد کثیر بن عباس بن عبد المطلب سے ہوا۔

۶) فاطمہ: فاطمہ کا عقد محمد بن عقیل سے ہوا جب کہ عبدالرزاق موسوی نے لکھا ہے کہ "ان کے شوہر سعید بن عقیل تھے آپ کے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے نام حمیدہ و خدیجہ تھے"۔[3]

۷) رقیہ صغریٰ: جو عمر اطرف کی جڑواں بہن تھیں۔ ان سے جناب مسلم بن عقیل کا نکاح ہوا۔ آپکے تین فرزند عبداللہ، علی اور محمد پیدا ہوئے۔ صاحب عمدۃ الطالب کا بیان ہے کہ ام کلثوم دختر امیر المومنین کا عقد جناب مسلم سے ہوا تھا جن سے ایک لڑکی حمیدہ پیدا ہوئی جن کی

[1] تاریخ انوار السادات ص: ۱۴۲، مناقب سروی ص: ۷۶ ج: ۲، [2] منتہی الامال ص: ۲۳۰ ج: ۱ [3] صحیفہ وفا ص: ۱۱۱

شادی عبداللہ بن محمد بن عقیل سے ہوئی۔ جن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ جناب عقیل کی نسل ذنبی محمد سے آگے بڑھی۔ عمدۃ الطالب نے یہ صراحت نہیں کی کہ رقیہ اور ام کلثوم میں پہلے کس سے عقد ہوا تھا۔ چونکہ شرعاً ایک وقت دو بہنیں ایک شخص کے عقد میں نہیں آسکتی ہیں۔[1]

۸) ام الحسن : ام الحسن کا پہلا عقد جعدہ بن ھبیرہ سے ہوا۔ ان کے بعد جعفر بن عقیل سے نکاح ہوا۔

بعض مورخین نے امامہ بنت علی کی تزویج صلت بن عبداللہ جو جناب عبدالمطلب کے پرپوتے تھے سے بتائی ہے جو درست نہیں کیونکہ صلت کی زوجہ امامہ بنت مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب تھیں۔ امامہ بنت علیؑ کی شادی نہیں ہوئی بلکہ وہ بچپن میں فوت ہو گئیں۔

فرزندان : امیر المومنین حضرت علیؑ کے چودہ فرزندان جو آپ کی شہادت کے وقت حیات تھے ان کے نام یہ ہیں حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، محمد اکبر، عمر اکبر، عباس، جعفر، عبداللہ، عثمان، ابوبکر، محمد اوسط، محمد اصغر، عون، عبیداللہ اور یحییٰ۔ ان فرزندان میں سے حضرت امام حسنؑ اپنی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ظلم کا شکار ہوئے۔ اور نو فرزندان حضرت امام حسینؑ، ابوالفضل العباس، جعفر، عبداللہ، عثمان، ابوبکر، محمد اوسط، محمد اصغر اور عون میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ بقیہ چار فرزندان محمد اکبر، عمر اکبر، عبیداللہ اور یحییٰ میں سے بھی عبیداللہ اور یحییٰ کا نسلی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حضرت علیؑ کے پانچ فرزندان حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، محمد اکبر، عمر اکبر اور ابوالفضل العباس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نسلی تسلسل کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ خوب پھیلایا۔ جیسا کہ عبیداللہ امرتسری

[1] صحیفہ وفا ص: ۱۱۱

نے ارزل الابرار کا ترجمہ کر کے لکھا ہے کہ :

"اور نرینہ اولاد سے جناب امیر علیہ السلام کی نسل مبارک جناب امام حسن اور حسین علیہم السلام اور محمد بن حنیفہ اور عمر اور عباس رضی اللہ عنہم سے چلی اور خدائے پاک نے ان سے بہت سے طیب و طاہر پیدا کئے ہیں"۔ (ارجح المطالب ص: ۸۳۴)

الغرض حضرت علیؑ کے ان پانچوں فرزندان کی نسل دنیائے عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلی اور ان میں سے حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی نسل سادات فاطمی کہلاتی ہے اور اپنے جد کی مناسبت سے حسنی اور حسینی سادات مشہور ہے۔ جبکہ بقیہ تین فرزندان محمد اکبر، عمر اکبر اور ابوالفضل العباس کی نسل علوی سادات کہلاتی ہے۔

اب ہم حضرت علیؑ کے ان فرزندان کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے کربلا کے میدان میں یزیدی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

ابوبکر (ت) : حضرت علیؑ کی اولاد میں سے میدان کربلا میں جنگ کے لئے پہلے جانے والے ابوبکر تھے۔ بعض مورخین نے ان کا نام محمد اصغر اور بعض نے عبداللہ لکھا اور ابوبکر کنیت بتائی ہے۔ شیخ ابو علی رجال کہتے ہیں کہ ان کی ماں لیلیٰ بنت مسعود بن خالد دارمیہ تھیں اور ان کے خالو ابو الاسود دوئلی تھے۔ ابوالفرج اصفہانی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ اہل ہمدان میں سے ایک ملعون نے آپ کے ایک ضرب کاری لگائی اور آپ گھوڑے سے زمین پر گرے۔ علامہ مجلسی نے تحریر کیا ہے کہ اس ملعون کا نام عبداللہ بن عقبہ غنوی تھا۔ جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ ان کا قاتل زجر بن البحر تھا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ابوبکر کے بعد عمر بن علی لڑنے کیلئے میدان کربلا میں نکلے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ عمر واقعہ کربلا کے بعد حیات تھے ان کے تفصیلی واقعات آئندہ صفحات میں تحریر کریں گے۔

عثمان (ت) : انہوں نے قتال کیلئے حضرت امام حسینؑ سے اذن حاصل کیا میدان میں پہنچے جنگ کی بہت سے ملاعین کو فی النار کیا ابھی جنگ جاری تھی کہ بقول علامہ مجلسی خولی اصبحی نے زہر آلود تیر پھینکا جو آپ کی پیشانی پر لگا اور آپ نے جان جان آفریں کو سپرد کی۔ بنو ابان بن دارم کے ایک شقی نے آپ کا سر قلم کیا۔ بقول ابوالفرج اصفہانی "وھوابن ا حدی وعشرین سنۃ" یعنی ان کی عمر اکیس سال تھی۔

عبداللہ (ت) : یہ بھی امام عالی مقام سے اذن حاصل کر کے میدان قتال میں پہنچے جنگ کی بروایت روضۃ الشہداء انہوں نے ایک سو ستر ملعین کو قتل کیا۔[1] فوج یزید نے آپکو نرغہ میں لیکر حملہ کیا اور شہید کر دیا۔ بقول ابوالفرج اصفہانی آپ کو ہانی بن شیث خضرمی نے شہید کیا۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی۔

جعفر (ت) : یہ اپنے ماں جائے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے ابوالفرج نے شہادت کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال بیان کی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جعفر اور حضرت عباسؑ ایک ساتھ میدان کربلا میں گئے اور شہید ہوئے۔ ابوالفرج کے بیان کے مطابق جعفر کو بھی خولی بن یزید اصبحی لعین نے قتل کیا۔[2]

محمد اوسط (ت) : ابن اثیر نے ان کی بابت تحریر کیا ہے کہ یہ اپنے بھائی ابوالفضل کے ہمراہ تھے قبیلہ بنو ابان بن دارم کے ایک شخص نے ان کو شہید کیا اور سر کو جسم سے جدا کر دیا۔[3]

[1] حوالہ ریاض القدس ص: ۱۳۶ ج: ۲، [2] مقاتل الطالبین ص: ۵۴، [3] تاریخ الکامل ص: ۳۱ ج: ۴

عون (ت) : ان کی بابت آقائی صدرالدین قزوینی کا بیان ہے کہ کتب معتبرہ میں عون بن علیؑ کا نام نہیں ملتا حالانکہ معین الدین صاحب نے روضۃ الشہداء میں انکی بابت بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور عون بن علی کو شہدائے کربلا میں قرار دیا ہے۔ جناب عون کا مزار مقدس کربلا میں روضۂ حسینیہ سے ایک فرسخ کے فاصلہ پر ہے جو مشہور و معروف ہے زائرین اس مزار کی زیارت کرتے ہیں۔

جب یہ میدان کربلا میں جنگ کیلئے پہنچے تو حجر بن ابجار نے دو ہزار سواروں کے ساتھ آپ پر حملہ کیا آپ نے مقابلہ کیا بہت سے سواروں کو قتل کیا اور خود زخمی ہو کر واپس خدمت امام میں آئے۔ اس کے بعد دوبارہ جنگ کیلئے گئے۔ یزیدی لشکر نے آپ پر سنگ باری کر دی اور خالد بن طلحہ نے نیزہ سے آپ پر حملہ کیا جس سے آپ شہید ہو گئے۔[1]

محمد اصغر (ت) : ان کو بھی قزوینی نے شہدائے کربلا میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ عبداللہ کی شہادت کے بعد محمد اصغر میدان کارزار میں پہنچے اپنے بھائی عبداللہ کے قاتل کو قتل کیا اور بھائی کی لاش کے برابر ڈال دیا اور خود جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

ابوالفضل العباس (ت) : ابوالفضل العباسؑ اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت ان کے تفصیلی حالات کے ساتھ مرقوم ہیں۔

ایک اعتراض کا جواب : اہلبیت رسولؐ کے مخالفین اور بنی ہاشم کے حاسدین کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ معززین بنی ہاشم اور اولاد رسولؐ کے فضائل کو گھٹانے اور خود ساختہ نقائص کو مشہور کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں اور طرح طرح کی الزام تراشیوں سے سیدھے سادھے مسلمانوں کے ذہنوں میں زہر گھولتے رہتے ہیں۔ انہی الزام تراشیوں میں

[1] ریاض القدس ص: ۱۳۷

ایک الزام یہ بھی ہے کہ " اگر صحابہ ثلاثہ حضرت علیؑ کے دشمن تھے تو انہوں نے اپنے بعض بیٹوں کے نام خلفائے ثلاثہ کے ناموں پر کیوں رکھے ؟" گو کہ ایسے الزاموں اور اعتراضوں کے جواب اکثر و بیشتر دیئے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ اعتراض کا جواب جناب شہید ثالث حضرت قاضی نوراللہ شوشتری علیہ رحمۃ نے اپنی کتاب مصائب النواصب میں تحریر فرمایا ہے آپ لکھتے ہیں کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ نے اپنے بیٹوں کے نام خلفائے ثلاثہ کے ناموں پر ابوبکر، عمر اور عثمان رکھے۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ دراصل آپ کے زمانہ میں اور اس سے قبل ابوبکر، عمر، عثمان نام پہلے ہی رکھے جاتے تھے۔ مثلاً ابوبکر بن عیسیٰ، ابوبکر بن شعوب، ابوبکر بن حفص، عمر بن ابی سلمہ، عمر بن ابی سفیان بن عبداللہ الاسد، عمر بن مالک بن عتبہ، عمر بن یزید کعبی، عمر بن وہب ثقفی، عمر بن عبدود، عمر بن عوف نخعی، عثمان بن خیف، عثمان بن مظعون وغیرہ۔

جناب عثمان بن مظعون جن کی کنیت ابو سائب تھی جلیل القدر صحابی اور محبّ اہلبیت تھے۔ حضرت علیؑ نے عثمان بن مظعون کے نام پر اپنے ایک بیٹے کا نام عثمان رکھا اور فرمایا "میں اپنے بھائی عثمان بن مظعون کے نام پر اس فرزند کا نام رکھ رہا ہوں"۔ اس طرح علیؑ نے دوسرے حضرات نیک صالح بزرگوں کے نام پر ابوبکر اور عمر نام رکھے۔

اب ہم محمد حنفیہ، ابوالفضل العباسؑ، عمر اطرف اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے حالات قدرے تفصیل سے تحریر کر رہے ہیں۔

محمد حنفیہؒ ابن علیؑ

نام و کنیت : آپ کا نام محمد تھا۔ ماں کی نسبت سے آپ محمد بن حنفیہ مشہور ہوئے۔ آپ رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد تولد ہوئے اور تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے مسند میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ " آپ مناسب سمجھتے ہیں اگر آپ کے بعد میرا کوئی بیٹا پیدا ہوا تو میں اس کا نام اور کنیت آپ کے نام و کنیت پر رکھ لوں"۔ آپ نے فرمایا "ہاں"۔[1] اس اجازت کے بعد جب فرزند تولد ہوئے تو حضرت علیؑ نے اپنے اس فرزند کا نام محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھی۔ جبکہ شیخ محمد عباس قمی تحریر فرماتے ہیں کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیرالمومنینؑ را بمیلاد محمد بشارت داد و نام و کنیت خود را عطای او گذاشت" (منتہی الامال ص: ۲۲۹ ج: ۱)

ترجمہ : رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیرالمومنینؑ کو محمد کی ولادت کی خوشخبری دی اور ان کو اپنا نام وکنیت عطا فرمائی۔

آپ کی والدہ خولہ بنت جعفر بن قیس بن مسلمہ بن ثعلبہ بن الدول بن حنفیہ تھیں اور آپ کی نانی عمرو بن ارقم حنفی کی بیٹی تھیں۔ جناب خولہ بنت جعفر سے حضرت علیؑ کے عقد کی بابت مختلف اقوال مشہور ہیں مثلاً

۱) عمرو بن معد یکرب کی رہبری میں بنی زبید نے بنی حنفیہ پر حملہ کیا اور انھیں اسیر کر لیا ان اسیروں میں جناب خولہ بھی تھیں۔ آنحضرتؐ نے

[1] حوالہ تذکرۃ الخواص ص: ۳۵۲

ان مرتدوں کی سرکوبی کے لئے حضرت علیؑ کو یمن بھیجا آپ بنی حنفیہ کے لوگوں کو رہا کرا کے مدینہ لے آئے۔ بعد میں جناب خولہ سے حضرت علیؑ کا عقد ہوا۔

۲) حضرت ابوبکر کے زمانہ میں خالد بن ولید نے جناب خولہ کے قبیلہ پر حملہ کیا۔ جناب خولہ قیدیوں میں آئیں تو حضرت ابوبکر نے انھیں حضرت علیؑ کو دے دیا۔

۳) زمانہ ابوبکر میں قبیلہ حنفیہ پر حملہ کیا گیا۔ قیدیوں میں جناب خولہ بھی تھیں حضرت علیؑ نے انھیں خرید لیا اور آزاد کر کے ان سے عقد فرمایا۔ الغرض اسی قسم کے متعدد بیانات نقل ہوتے آرہے ہیں لیکن یہ امر حقیقت ہے جناب خولہ کنیز ہرگز نہ تھیں بلکہ ایک آزاد خاتون تھیں جن سے حضرت علیؑ نے عقد فرمایا۔

ولادت : جناب محمد بن حنفیہ کی ولادت سے متعلق بھی مختلف اقوال ملتے ہیں مثلاً ایک قول ہے کہ آپ حضرت ابوبکر کے دور میں پیدا ہوئے۔ ابن خلکان کا قول ہے کہ آپ حضرت عمر کی حکومت کے خاتمہ سے ایک سال قبل یعنی ۲۲ھ میں پیدا ہوئے۔ جبکہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں آپ کی ولادت ۱۶ھ اور وفات ۸۱ھ میں تحریر کی ہے۔ شیخ عباس قمی کا بیان ہے کہ

"محمد در زمان حکومت عمر بن خطاب متولد شد و در ایام عبدالملک بن مروان وفات کرد و سن او را شصت و پنج گفتہ اند"

(منتہی الامال ص: ۲۲۹ ج: ۱)

ترجمہ : محمد زمانہ حکومت حضرت عمر بن خطاب میں پیدا ہوئے۔ اور عبدالملک بن مروان کے دور میں وفات پائی۔

اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ اس طرح شیخ عباس قمی اور ابن کثیر کی

یکساں رائے ہے اور یہی درست بھی ہے کیونکہ دیگر متعدد مورخین نے بھی یہی بیان کیا ہے۔

تربیت : آپ کی پرورش و تربیت بھی دیگر برادر انکے ہمراہ بیت الشرف امیرالمومنینؑ میں حضرت علیؑ و دیگر بزرگان بنی ہاشم کی زیر نگرانی ہوتی رہی۔ آپ کے ابتدائی دور کے واقعات کتب تواریخ و احادیث میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہر حال آپ نے علم دینی و ادب مجلسی کے ساتھ فن سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی۔

شجاعت : جہاں تک شجاعت و بہادری کا تعلق ہے تو وہ ورثہ میں ملی تھی۔ بقول شیخ عباس قمی "محمد مردی عالم و شجاو نیرومند و قوی بودہ۔"[1] آپ کی بابت سبط ابن جوزی نے زہری کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ "محمد عقلمند ترین اور شجاع ترین اشخاص میں سے تھے۔ فتنوں اور جھگڑوں سے کنارہ کش رہتے تھے"۔[2] جناب محمد حنفیہ کی شجاعت و بہادری کے نمونے جنگ جمل، صفین اور نہروان میں کھل کر ظاہر ہوئے جنہیں مورخین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ جنگ جمل سے متعلق اعثم کوفی کا بیان ہے کہ جناب امیرالمومنین حضرت علیؑ نے محمد حنفیہ کو علم دیکر فرمایا۔ "اے بیٹے یہ علم لیکر دشمن پر حملہ کرو" اور حضرت علیؑ نے اس موقع پر اس طرح خطاب فرمایا۔

"خبردار پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تم نہ ہٹنا، اپنے دانتوں کو بھینچ لینا، اپنا کاسہ سر اللہ کے حوالے کر دینا، زمین میں قدم گاڑ دینا، نگاہ آخر قوم پر رکھنا، آنکھوں کو بند رکھنا اور یہ یاد رکھنا کہ مدد اللہ ہی کی طرف سے آنے والی ہے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ :۱۱ ص :۳۹)

محمد نے حملہ کیا صفوں کے مقابل آکر رجز پڑھی، توقف کے بعد حملہ کیا بہت

[1] منتہی الامال ص :۲۲۹ ج : ۱ [2] تذکرۃ الخواص ص :۳۵۲

سے دشمن مار گرائے۔ وہ ایک طرف سے دوسری طرف حملہ کر رہے تھے اور جناب امیر المومنینؑ ملاحظہ فرما رہے تھے اور بیٹے کی شجاعت و طریقہ جنگ سے خوش ہو رہے تھے اور فرما رہے تھے "اطعن بها طعن ابيك محمد لاخير في الحرب اذالم توقد" محمد بن حنفیہ نے کچھ دیر تک جنگ کی پھر علم لئے ہوئے واپس ہوئے اور اپنی صف میں آملے۔[1]

شیخ مفید نے بیان کیا ہے کہ جب جنگ جمل کے موقعہ پر حضرت علیؑ نے اپنے بیٹے محمد حنفیہ کو علم دیا تو محمد حنفیہ نے کہا" یہ رسول اکرمؐ کا علم ہے جو آج تک سر نگوں نہیں ہوا"[2] جناب محمد حنفیہ نے حق علمداری کو اسی کروفر سے انجام دیا جس کی پروردہ آغوش علیؑ سے امید کی جاسکتی ہے۔ اور جنگ جمل ہی کے موقع پر حضرت علیؑ نے محمد حنفیہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ " حسنینؑ میری آنکھیں ہیں اور تم محمد میرے دست وبازو"۔[3]

جنگ صفین میں حضرت علی نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ سواروں کے میمنہ پر جناب حسنؑ و حسینؑ کو مقرر کیا۔ پیادوں کے میمنہ پر عبداللہ بن جعفر طیارؓ اور مسلم بن عقیلؑ کو' سواروں کے میسرہ پر محمد حنفیہ اور محمد بن ابوبکر کو' پیادوں کے میسرہ پر ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص اور اس کے بھائی عمر بن عتبہ کو مامور کیا اور سواروں کے قلب میں عبداللہ بن عباس اور عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کو جگہ دی۔[4]

جنگ صفین کے ایک معرکہ میں کریب نامی شامی فوج کا جنگجو میدان میں آیا۔ اس نے حضرت کے ساتھیوں میں مرتفع زبیدی' شرجیل' حرث شیبانی کو یکہ بعد دیگرے شہید کر دیا یہ منظر دیکھ کر حضرت علیؑ اسکے مقابلہ کو گئے اور کریب کا خاتمہ کر کے واپس لوٹے۔ اور اپنے فرزند محمد حنفیہ سے فرمایا کہ :

---

[1] تاریخ اعثم کوفی ص: ۳۶۷ [2] الجمل ص: ۱۷۵ [3] صحیفہ وفا ص: ۱۰۲ [4] تاریخ اعثم کوفی ص: ۴۷۶

" جاؤ ابھی اسکے ورثاء قاتل کو تلاش کرتے ہوئے آئیں گے' محمد حنفیہ میدان میں پہنچے کریب ملعون کا چچازاد بھائی پہنچا اور قاتل کے متعلق سوال کیا جناب محمد نے فرمایا میں اسکی جگہ پر ہوں اس نے حملہ کر دیا جنگ ہوئی محمد حنفیہ نے اسکو موت کے گھاٹ اتار ادوسرا آیا تیسرا آیا یہانتک کہ سات عدد شامی محمد کے ہاتھوں سے واصل جہنم ہوئے۔" (مناقب خوارزمی ص: ۱۴۷)

سبط ابن جوزی نے ثوری کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ صفین کے میدان میں ایک مرتبہ دونوں فوجیں مقابل ہوئیں تو مالک اشتر نے محمد حنفیہ سے کہا کہ آپ دونوں فوجوں کے درمیان کھڑے ہو کر حضرت امیر المومنینؑ کی مدح کیجئے اور مناقب بیان کیجئے پس آپ دونوں صفوں کے درمیان پہنچے اور شامی لشکر کی طرف اشارہ کر کے کہا

" اے اہل شام اے نفاق کی ذریت اور آگ کے بچے ہوئے اور جہنم کے ایندھن دور ہو جاؤ چودویں کے روشن اور واضح چاند سے اور نجم ثاقب سے' نفوذ کرنے والے نیزے سے' روشن ستارے سے' ہلاک کرنے والی تلوار اور صراط مستقیم اور ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر سے جو بہت علم رکھتا ہے قبل اس کے کہ ہم تمہیں فی النار کر دیں یا تم پر لعنت کریں جس طرح یہود پر کی"۔ (تذکرۃ الخواص ص: ۳۵۵)

یہ خطبہ بہت طویل ہے جس میں جناب محمد حنفیہ نے حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب بیان کئے۔ آپ کے انداز بیان اور لب ولہجہ سے دشمنوں کے اوسان خطا ہو گئے اور دونوں لشکروں کے افراد نے محمد حنفیہ کے فضل وبزرگی کا اعتراف کیا۔

جنگ نہروان میں بھی حضرت علیؑ نے محمد حنفیہ کو علمدار لشکر بنا کر

بھیجا اس جنگ میں بھی آپ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھلائے اور دشمنوں کے پرّے تتر بتر کر دیئے۔ جنگ جمل اور جنگ نہروان میں جناب محمد حنفیہ نے علمداری کے فریضہ کو بہت بہتر طور پر انجام دیا اور منصب کی ذمہ داری کو شایان شان طریقہ سے ادا کیا۔ اسلام آپ کی شجاعت کا مرہون منت ہے درآنحالیکہ اس وقت سن مبارک زیادہ نہ تھا۔ بقول سبط ابن جوزی اور ابن اثیر آپ کی وفات ۸۱ھ میں پینسٹھ سال کی عمر میں ہوئی اس حساب سے آپ کی ولادت ۱۶ھ میں ہوئی لہٰذا جنگ جمل جو ۳۶ھ میں شروع ہوئی اس وقت آپکی عمر تقریباً بیس سال تھی لیکن بھرپور فن حرب وضرب سے آشنا تھے۔[1]

قدرو منزلت : حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اپنے بھائی محمد حنفیہ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپ کی شرافت و جلالت کے معترف تھے مثلاً ایک مرتبہ جناب امام حسنؑ نے محمد حنفیہ کو بلوایا۔ دونوں بھائیوں میں گفتگو ہو رہی تھی جسکے دوران امام حسنؑ نے فرمایا اے بھائی محمد میں نے آپ سے متعلق بابا جان کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص دنیا و آخرت میں میرے ساتھ حُسن سلوک کرنا چاہے' میرے بیٹے محمد کیساتھ حُسن سلوک کرے"۔[2]

مدینۃ الرسول سے روانگی سے قبل جب امام حسینؑ نانا کے روضہ اقدس سے رخصت ہو کر گھر تشریف لائے تو محمد بن حنفیہ بھی وہاں آگئے۔ انہوں نے کہا "اے بھائی میری جان تم پر فدا ہو میں آپ کو کچھ نصیحت کرنا چاہتا ہوں"۔ امام حسینؑ نے فرمایا "اے بھائی بیان کرو تمہاری نصیحت میرے لئے فائدہ سے خالی نہ ہو گی۔" محمد حنفیہ نے کہا کہ

"اپنے آپ کو یزید اور اسکے شہروں سے جس قدر ممکن ہو دور رکھیں اور لوگوں سے اپنے واسطے بیعت لیں اگر انہوں نے بیعت کر لی اور

---

[1] البدایہ والنہایہ ص: ۳۸ ج: ۱ [2] صحیفہ وفا ص: ۹۸

فرمانبرداری سے پیش آئے تو شکر خدا کر کے رسولؐ خدا کی سنت اور علی مرتضیٰؑ کی سیرت کے ساتھ زندگی بسر کیجئے۔۔۔۔ اور اگر یہ لوگ کسی اور کی بیعت اختیار کر لیں اور آپ کی طرف متوجہ نہ ہوں تو خاموشی سے شکر الٰہی بجالا کر خانہ نشین ہو جایئے۔ پھر نہ گھر سے باہر نکلئے اور لوگوں سے ملنا جلنا بند کر دیجئے۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کسی شہر میں جائیں اور وہاں کچھ آدمی آپ کی بیعت کر لیں اور کچھ مخالفت کریں پھر آپ میں اور ان میں معرکہ آرائی ہو"۔

حضرت امام حسینؑ نے فرمایا :

" تم نے بہت اچھی بات کہی۔ اب کس شہر میں جانا مناسب معلوم ہوتا ہے"۔ محمد حنفیہ نے کہا "فی الحال مکہ تشریف لے جایئے وہاں کے باشندوں نے آپ کی بیعت کی تو اچھی بات ہے اور اگر نہ کریں تو آپ یمن چلے جائیں وہاں کے آدمی آپ کا ساتھ دیں گے"۔

(تاریخ اعثم کوفی ص: ۷۶۳)

مذکورہ بالا دونوں واقعات سے واضح ہو جاتا ہے جناب امام حسنؑ و حسین علیہما السلام کی نظر میں محمد حنفیہ کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ نیز مذکورہ بالا گفتگو کے دوران حضرت امام حسینؑ نے محمد حنفیہ سے کہا تھا کہ

"تم مدینہ میں رہنا چاہو تو کوئی اندیشہ کی بات نہیں تم سے کوئی کچھ نہ کہے گا۔ مگر لازم ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل اور حالات سے خبردار رہ کر جو کچھ واقعات پیدا ہوں ان سے برابر مجھے مطلع کرتے رہو۔ یزید اور اسکے ہواخواہوں کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہ رکھو" اسکے بعد ایک وصیت نامہ لکھا اور اپنے بھائی محمد حنفیہ کے حوالہ کیا۔

(تاریخ اعثم کوفی ص: ۷۶۴)

ایک روایت میں جناب محمد حنیفہ کی بابت حضرت علیؑ کا یہ قول بھی بیان کیا گیا ہے کہ

"یہ چند افراد جن کے نام محمد ہیں ان کے ضمیر انہیں گناہ کی اجازت نہیں دیتے۔ ان سے مراد محمد بن حنفیہؓ محمد بن جعفر طیارؓ اور محمد بن حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ ہیں" (صحیفہ وفا ص: ۱۰۰)

حضرت علیؑ کے اس ارشاد نے کہ "محمد کے نفس کی عزت و حمیت گناہ کی اجازت نہیں دیتی" جناب محمد حنیفہ کے اعتقاد راسخ اور ایمان کامل کی سند فراہم کردی۔ نیز آئمہ اہلبیت حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کی نظروں میں آپ کی قدر و منزلت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

شہادت حسینؑ کے اثرات: محرم ۶۱ھ میں کربلا کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ جس کے بعد اہل کوفہ کو اپنی بد عہدی پر شدید ندامت ہوئی اور وہ قاتلان حسین سے بدلہ لینے پر آمادہ ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں پہلا معرکہ ۲۶ ر جمادی الاول ۶۵ھ میں جنگ عین الورد سے شروع ہوا۔ اسی دوران مختار بن عبیدہ ثقفی نے قاتلان حسینؑ سے بدلہ لینے کی ٹھانی مگر وہ قید کردیئے گئے۔ جب رفاعہ بن شداد عین الورد سے کوفہ لوٹ کر آئے تو مختار نے قید خانہ سے ایک خط ان کو لکھا کہ " میں ابھی مقید ہوں انشاء اللہ یہاں سے نکل کر جناب امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لوں گا۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔ مجھ کو محمد بن حنفیہ نے اس بات پر مامور کیا ہے۔" جناب مختار عسکری صلاحیت کے ساتھ سیاسی ذہنیت کے بھی مالک تھے۔ قید سے رہائی پانے کے بعد انہوں نے اپنے حامیوں کی تنظیم اور ان کی تعداد میں اضافہ پر خصوصی توجہ دی۔ اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے کوشاں رہے۔

انہوں نے محمد حنفیہ کو ایک خط لکھا جس میں اپنی وفاداری کا یقین

دلایا اور لکھا کہ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں مدینہ کی جانب ایک فوج جرار بھیجدوں" لیکن محمد حنفیہ نے مختار کی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ یہ جواب دیا کہ " تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میں لڑائی کا ارادہ کروں تو میرے بہت سے مددگار فوراً میری حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے مگر میں سب سے الگ ہوں اور چپ بیٹھا ہوں اب جو اللہ کرے اور وہی بہتر فیصلہ دینے والا ہے۔ " نیز قاصد سے زبانی کہا کہ "مختار سے کہنا کہ اللہ سے ہر وقت ڈرتا رہے اور خونریزی سے بچے۔ "[۱]

چونکہ مختار خفیہ طور پر اپنی تحریک کو مضبوط کررہے تھے اور اپنے آپ کو محمد حنفیہ کا نائب ظاہر کررہے تھے لہٰذا شعیان علیؑ کا ایک وفد جن میں قدامہ بن مالک الجشمی، اسود بن جراد الکندی، سعر بن ابوسعر اور سعید بن منقذ شامل تھے۔ جناب محمد حنفیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "مختار ہم کو دعوت دے رہا ہے اور ہم سے کہتا ہے کہ اس مقصد میں شریک ہو کر اس کی مدد کریں اب ہم آپ کی اجازت طلب کرتے ہیں کہ اُس کی پیروی کریں۔" جناب محمد حنفیہ نے خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کہا کہ " تم لوگ جس شخص کا ذکر کرتے ہو کہ وہ تم کو ہم لوگوں کے خون کا بدلہ لینے کے لئے دعوت دیتا ہے اس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ میں خود یہ چاہتا ہوں کہ اگر خدا کو منظور ہو تو وہ اپنی مخلوق میں سے جس شخص کے ذریعہ چاہیے ہم کو ہمارے عدو کے خلاف مدد دے اور اگر میں نہ چاہتا تو کہہ دیتا کہ ایسا نہ کرو"[۲] طبری نے اس جواب کو اس طرح لکھا ہے۔" آپ نے ہمارے خون کا بدلہ لینے والوں کا ذکر کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ اپنی مخلوق میں سے جس کسی کے ذریعہ سے چاہے ہمارے دشمن سے بدلہ لے۔

[۱] نورالابصار تیمن من حیات الصادقین ص: ۱۲۵ [۲] تاریخ الکامل (اردو ترجمہ) ص: ۳۶۰ ج: ۱

اس کے بعد اپنے اور آپ کیلئے اللہ سے طلب مغفرت کرتا ہوں۔"[۱] ان حضرات نے آپ کے اس بیان کو مختار کی متابعت کی اجازت سمجھا اس کے بعد یہ لوگ کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

ادھر مختار ان حضرات کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کیونکہ انہیں توقع تھی کہ محمد حنفیہ ان کی مدد کی اجازت نہیں دیں گے۔ جب یہ لوگ کوفہ پہنچے تو سیدھے مختار کے پاس گئے مختار نے اپنی توقع کے مطابق بات کا آغاز کیا لیکن جب ان لوگوں نے مختار کو بتایا کہ ہم تیری مدد کا حکم لیکر آئے ہیں تو مختار کی خوشی کی انتہا نہ رہی انہوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس کے بعد جناب مختار نے ابراہیم بن مالک اشتر کے پاس چند آدمی بھیجے۔ ان لوگوں نے ابراہیم کو بتایا کہ مختار کو جناب محمد حنفیہ نے امیر کیلئے مامور کیا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم خاموش ہو گئے۔ ابراہیم خود اس تحریک کا امیر بننا چاہتے تھے اور یہ لوگ ناکام لوٹے۔ اس کے بعد مختار خود ان آدمیوں کے ہمراہ ابراہیم کے گھر پہنچے اور ابراہیم کو ایک خط دکھا کر کہا کہ یہ خط حضرت محمد حنفیہ کی طرف سے آپ کے نام ہے۔ ابراہیم نے یہ خط پڑھ کر کہا کہ " کیا ثبوت ہے کہ یہ خط جناب محمد حنفیہ کا ہے۔ میری ان کیساتھ خط و کتابت رہ چکی وہ ہمیشہ اپنے خطوں کو اپنے اور اپنے باپ کے نام سے شروع کرتے ہیں۔" ابراہیم نے ثبوت مانگا تو مختار کے ساتھ والوں نے گواہی دی کہ یہ خط محمد حنفیہ کا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم نے مختار کی بیعت کرلی جس سے مختار کی طاقت بہت بڑھ گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شہادت حسینؑ کے بعد مکہ و حجاز عبداللہ بن زبیر کے زیر تسلط تھے۔ کوفہ و عراق کے بعض علاقے جناب مختار کے زیر انتظام تھے اور شام و دیار بکر پر عبدالملک بن مروان قابض تھا۔ اس طرح ملت

[۱] تاریخ طبری (اردو ترجمہ) ص: ۲۸ حصہ دوئم ج: ۲

اسلامیہ تین مختلف کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور اسلامی مملکت افراتفری کا شکار تھی۔ جناب امیر مختار اور عبداللہ بن زبیر ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے اپنی اپنی چالیں چل رہے تھے لیکن یہ امر واضح تھا کہ امیر مختار کا مقصد قاتلین حسینؑ کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ جس کے لئے وہ حکمت عملی سے کام کررہے تھے۔

اسی زمانہ میں جناب محمد حنفیہ مکہ میں خانہ نشینی اور عزلت گزینی کی زندگی بسر کر رہے تھے عبادت واطاعت پروردگار میں مصروف رہتے تھے۔ ایک روز عبداللہ بن زبیر نے اپنے ایک کارندہ جسکا نام قیس تھا کے ذریعہ محمد حنفیہ کو بلوایا۔ قیس نے محمد حنفیہ کو عبداللہ بن زبیر کا پیغام دیا اور درخواست کی کہ آپ کا وہاں تشریف لیجانا ہی بہتر ہے لہٰذا آپ قیس کے ہمراہ چلنے پر آمادہ ہوئے قیس نے سواری کیلئے اپنا گھوڑا پیش کیا تو محمد حنفیہ نے فرمایا" میں نے اپنے بھائی حسین بن علیؑ کی شہادت کے بعد سے گھوڑے کی سواری ترک کردی ہے۔" یہ سن کر قیس نے اپنا گھوڑا غلام کے سپرد کیا اور خود پاپیادہ جناب محمد حنفیہ کے ہمراہ روانہ ہوا۔ ضعف و ناتوانی کے باعث محمد حنفیہ تھوڑی دور چل کر ٹھہر جاتے اور اپنے عصا پر تکیہ کر لیتے تھے۔ جب آپ عبداللہ بن زبیر کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو آسمان کی جانب رخ کر کے یہ دعا پڑھی۔ وکفنی من ظلم الظالمین وشر الحاسدین وکید الکائدین یاحنانُ یا منانُ یا دیّانُ یا حیُّ یاقیومُ اعصمنی بعصمتک۔ اس کے بعد دربار ابن زبیر میں داخلہ کے وقت ایک اور دعا پڑھی۔ دربار میں چند معززین مکہ جمع تھے۔ ابن زبیر نے تعظیم و تکریم سے آپ کا استقبال کیا اور عزت سے بٹھایا۔ گفتگو کے دوران ابن زبیر نے دوستداران اہلبیت کی شکایت کی اور کہا کہ " میں بات کو زیادہ طوالت دینا نہیں چاہتا ہوں صاف صاف یہ ہے کہ تم اس

وقت میرے ہاتھ پر بیعت کرلو کہ میرے معاملات میں اس سے سر سبزی اور رونق ہو جائے گی اور میرا کام مکمل ہو جائیگا۔" اس موضوع پر گفتگو بڑھتی رہی ابن زبیر الزام تراشی کرتے رہے اور محمد حنفیہ جواب دیتے رہے۔ آخر کار عبداللہ بن زبیر غصہ میں بھر گئے اور محمد حنفیہ سے کہنے لگے۔ "میں اس وقت تک تم سے دستبردار نہیں ہوں گا اور نہ تم کو چھوڑوں گا جب تک کہ تم مختار کو حکومت سے دستبردار ہونے کو نہیں لکھو گے" محمد نے جواب میں کہا کہ "مجھ پر کچھ واجب نہیں کہ میں مختار کو روکوں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ میری تحریر کو قبول و منظور کر کے اس پر عملدرآمد کرے" اس وقت جو شرفائے مکہ وہاں موجود تھے ان میں سے عثمان بن شیبہ جو مکہ کا بہت ہی معزز اور ذی وجاہت شخص تھا بولا کہ "اے ابن زبیر تجھ کو اس قدر درشتی اور تندی ہر گز مناسب نہیں۔" اس پر عبداللہ بن زبیر نے محمد بن حنفیہ سے کہا کہ تم کو اتنی مہلت ہے کہ تمہارا نامہ بر کوفہ جائے اور جواب لیکر واپس آجائے۔ اگر مختار دستبردار ہو گیا تو خیر ورنہ تم کو قتل کر دیا جائے گا۔ ابن زبیر کے حکم سے محمد حنفیہ کو چاہ زمزم کی حدود میں واقع ایک قبہ میں قید کر دیا گیا اور چالیس محافظ مقرر کئے گئے۔

محمد حنفیہ نے اپنے ایک غلام جس کا نام سعد تھا کے ذریعہ مختار کو ایک خط بھیجا جس میں اپنے حالات کا ذکر کیا۔ جب یہ خط مختار کو ملا تو اس نے فوراً ابراہیم بن مالک اشتر اور ہانی بن قیس باہلی کو طلب کر کے واقعہ کی تفصیل بتائی اور محمد حنفیہ کی مدد کے لئے فوج کی مکہ روانگی کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ تدبیر بتائی کہ پہلے ابو عبداللہ الجدلی ستر چنیدہ بہادر شہسواروں کے ہمراہ روانہ ہوں، پھر ہانی بن قیس باہلی اور ابو معمر ایک ایک سو سواروں کے ہمراہ روانہ ہوں، ان کے بعد عمیر بن طارق اور یونس بن عمران چالیس چالیس سپاہیوں کے

ہمراہ اور ان کے بعد طبیان بن عمارہ دو سو سواروں کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ اور طفیل بن عامر اور محمد بن قیس باہلی کے ذریعہ مختار نے اپنا ایک خط محمد حنفیہ کو بھیجا۔ مختار نے ہانی کو ہدایت کی کہ مکہ میں داخل ہوتے ہی محمد حنفیہ کو آزاد کرائے اور اطمینان رکھے کہ اس کی مدد کے لئے کمک پہنچتی رہے گی۔

ہانی باہلی نے حسب ہدایت چاہ زمزم پر پہنچ کر پہرداروں کو مار بھگایا اور جناب محمد حنفیہ کو قید سے چھڑا لیا۔ دوسرے دستے بھی یکہ بعد دیگرے مکہ پہنچنے لگے۔ مکہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ عراقی فوجیں مکہ میں داخل ہو گئیں اہل مکہ جوق درجوق چاہ زمزم پر جمع ہونے لگے۔ عبداللہ بن زبیر بھی وہاں پہنچ گئے اور محمد حنفیہ سے سخت کلامی کرنے لگے اس پر ہانی نے محمد حنفیہ کے فضائل بیان کرنے شروع کر دیئے جس پر ابن زبیر نے انہیں قید کرنے کی دھمکی دی۔ ابھی یہ تکرار ہو ہی رہی تھی کہ عمیر بن طارق اور یونس بن عمران اپنے اپنے دستوں کو لئے نوبت و نقارہ کے ساتھ یالثارات الحسین کے نعرہ لگاتے ہوئے زمزم پر پہنچ گئے ابن زبیر اور ان کے ہمراہی یہ منظر دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ ابن طارق نے حالات کا جائزہ لیا تو وہاں دیکھا کہ عبداللہ بن زبیر نے محمد حنفیہ اور ان کے ساتھیوں کو جلانے کیلئے لکڑیوں کا انبار لگا رکھا تھا اور بیعت کرنے کی جو مہلت دی گئی تھی اس میں صرف دو دن باقی تھے۔[1] اسی دوران طبیان کا لشکر پہنچا الغرض اس طرح عراقی فوجوں کو آراستہ دیکھ کر اہل مکہ حیران و ششدر ہو گئے۔ ابن زبیر نے ہانی کو مخاطب کر کے کہا "اے ہانی تو جو اپنی فوج کو اس طرح جوق درجوق لایا ہے تو کیا میں تیری فوج سے ڈر جاؤں گا۔ میرے لئے یہ ہزار دو ہزار سوار بھیڑوں کے گلے کے مانند ہے۔" ہانی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا کہ "میں تجھے

[1] نور المشرقین من حیات الصادقین ص: ۱۲۵

مہلت ہی نہیں دونگا" یہ سن کر ابن زبیر نے تلوار نیام سے نکال لی ان کے ہمراہیوں نے بھی اپنی اپنی تلواریں برہنہ کیں۔ ابن زبیر کو یقین تھا کہ اگر معرکہ ہوا تو اہل مکہ ان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب ہانی نے اپنی فوج کو صف بندی کا حکم دیا اور بآواز بلند اہل مکہ سے کہا کہ " تم لوگ علیحدہ ہو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ دھوکے میں مارے جاؤ" تو تمام مجمع منتشر ہو گیا جس سے ابن زبیر خوفزدہ ہو گئے۔ ہانی کی فوجوں نے بھی تلواریں نکال لیں اور حملہ کی تیاری کی۔ مگر محمد حنفیہ درمیان میں آگئے اور ارشاد فرمایا "حرم خدا میں خونریزی حرام ہے یہاں جنگ نہیں کرنا۔" اور ہانی سے کہا "میں تم کو حرم میں جنگ کرنے کی کبھی اجازت نہیں دوں گا" اسطرح جنگ رک گئی اور عبداللہ بن زبیر وہاں سے چلے گئے اور عراقی فوجیں بھی محمد حنفیہ کے کہنے پر مکہ سے کچھ فاصلے پر مقام بطحا میں قیام پذیر ہوئیں۔ اس میں شک نہیں اگر یہ جنگ ہو جاتی تو طرفین کے ہزاروں آدمی مارے جاتے اور حرم مکہ کی حرمت پامال ہو جاتی۔

الغرض ابن زبیر نے اشراف مکہ کے مشورہ پر صلح کیلئے اجلاس منعقد کیا جس میں ایک طرف عبداللہ بن زبیر، جعفر، منذر اور محمد پسران زبیر بن عوام، عثمان بن شیبہ اور دیگر سرداران تھے۔ دوسری طرف محمد حنفیہ، ہانی بن قیس، طبیان بن عمارہ و دیگر عمائدین کوفہ جو لشکر کے ساتھ آئے تھے۔ عبداللہ بن عباس کو فریقین نے ثالث مقرر کیا طویل گفت و شنید کے بعد فریقین میں صلح ہوئی اور صلحنامہ تحریر کیا گیا۔ جس پر فریقین کے دستخط ہوئے جسکے بعد عراقی فوجیں واپس ہوئیں اور محمد حنفیہ اپنے دولتسرا چلے گئے۔

عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ عراقی فوجوں کی واپسی کے بعد محمد حنفیہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور لوگوں سے ملنا جلنا موقوف کر دیا۔ اس کے باوجود ابن زبیر ان کی جانب سے خائف و شاکی رہتے تھے۔ ان کی جانب

سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہونے لگی مسعودی کا بیان ہے کہ

" محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن عباس کو عبداللہ بن زبیر نے اتنا تنگ کیا کہ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ محمد بن حنفیہ تو ایلہ میں چلے گئے اور دو سال تک وہاں رہے جب تک کہ عبداللہ بن زبیر قتل نہ ہو گئے۔ اور عبداللہ بن عباس بھاگ کر طائف چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

(مروج الذہب ص: ۳۳ جزء الثالث مطبوعہ بغداد بحوالہ نور المشرقین ص: ۱۰۳)

وفات: جناب محمد حنفیہ کی وفات ۸۱ھ میں بعمر پینسٹھ سال ہوئی لیکن آپ کی وفات کہاں ہوئی اس کی بابت مورخین کی مختلف آراء ہیں جیسا کہ شیخ محمد عباس قمی نے تحریر کیا ہے کہ

" و در موضع وفات او اختلافست بقولی در ایلہ وبقولی در طائف وبقول دیگر در مدینہ وفات کرد و اورا در بقیع خاک سپردند وجماعت کیسانیہ اورا امام مید انستند و اورا مہدی آخر زمان میخواندند و باعتقاد ایشاں آنکہ محمد در جبال رضوی کہ کوہستان یمن است جای فرمودہ است و زندہ است تا گاہی کہ خروج کند والحمد اللہ اصل آمذہب منقرض شدند۔" (منتہی الامال ص: ۲۲۹ ج: ۱)

ترجمہ: اور کس موضع میں آپ نے وفات پائی اس میں اختلاف ہے ایک قول کے مطابق آپ نے مقام ایلہ میں وفات پائی، دوسرا قول ہے کہ آپ طائف میں فوت ہوئے تیسرا قول ہے کہ آپ نے مدینہ میں وفات پائی اور بقیع میں دفن کئے گئے جب کہ جماعت کیسانیہ جو آپ کو امام اور مہدی آخر زمانہ تسلیم کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ محمد حنفیہ کوہستان یمن کے ایک پہاڑ جبل رضوی میں روپوش ہیں اور زندہ ہیں حتیٰ کہ وہ خروج فرمائیں

گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ مذہب (کیسانیہ) ختم ہو چکا ہے۔

کیسانیہ فرقے کا جو نظریہ کتب تواریخ میں بیان کیا جاتا ہے کہ محمد حنفیہ روپوش ہیں اور عدل وانصاف کی حالی کے لئے ظہور کریں گے قطعی بے بنیاد ہے کیونکہ تاریخ ان کی موت کی شہادت دیتی ہے۔[1]

دعویٰ امامت : جناب محمد حنفیہ کے کردار و عمل سے جہاں آپکے ایمان و تقویٰ اور شرافت و نیک نفسی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں اسی پروپیگنڈے کی بھی پول کھل جاتی ہے جس میں معدوم فرقہ کیسانیہ کو ڈھال بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ محمد حنفیہ نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد امامت کا دعویٰ کیا۔ یہ ایک کھلا بہتان ہے کیونکہ آپکی آخری عمر تک حضرت امام علی زین العابدینؑ حیات تھے کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ملتا جس میں آپ نے امام وقت کی نافرمانی کی ہو۔ علاوہ بریں معترضین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ آپ نے حضرت علی زین العابدینؑ کی امامت کو قبول نہیں کیا اس کے برعکس یہ ضرور لکھا ہے کہ ایک موقع پر حجر اسود کے قریب آپ نے حضرت امام علی زین العابدینؑ سے عرض کیا کہ "آپ اپنی امامت کو عوام کے لئے اثبات فرمائیں" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمد حنفیہ حضرت علی زین العابدینؑ کی امامت کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ نے کبھی بھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اب یہ ان لوگوں کی اپنی مصلحت ہے جو آپ کو امام ظاہر کر کے اپنے پوشیدہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مخالفین بڑے شدومد سے یہ پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کے برادران محمد اور عمر ابنان علی ابن ابیطالب بھی واقعہ کربلا میں آپ کے شریک نہیں ہوئے۔ یہ ایک اور بہتان ہے کیونکہ معرکہ کربلا میں

[1] معارف ص :۱۵' تہذیب التہذیب ص :۳۵۵ ج :۱' معجم البلدان ص :۳۸۷ ج :۳

ان دونوں برادران یعنی محمد حنفیہ اور عمر اطرف کے شرکت نہ کرنے سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ معاذاللہ وہ حضرت امام حسینؑ کے اس اقدام کو برسر ناحق جانتے تھے یا یزید بن معاویہ کو برسر حق سمجھتے تھے۔ بلکہ فی الحقیقت ان کی عدم شرکت کے جائز اسباب اس وقت موجود تھے۔ جہاں تک محمد حنفیہ کا تعلق ہے تو ان کی بابت بیان کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں آپ ایک ہاتھ سے مفلوج ہو جانے کے باعث معذور و مجبور ہو گئے تھے اسکے علاوہ حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے روانگی سے قبل ایک وصیت نامہ تحریر فرما کر آپ کو بعض ہدایات دی تھیں جنکی انجام دہی انکے سپرد کر دی گئی تھی۔ ان حالات میں محمد حنفیہ کا حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

لہٰذا دونوں اعتراضات یعنی دعوۂ امامت اور جہاد حسینی میں عدم شرکت کی بابت ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ معززین بنی ہاشم کے خلاف اموی پروپیگنڈے کی یہ بھی دو مثالیں ہیں۔ نیز تاریخی واقعات سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱) جناب محمد حنفیہ نے تاحیات کبھی بھی نہ تو امامت کا دعویٰ کیا اور نہ مہدیت کا' آپ ہمیشہ حسنؑ و حسینؑ و علی زین العابدینؑ کی امامت کے قائل و مطیع رہے۔ انہی تین آئمہ معصومین کے زمانہ امامت میں جناب محمد حنفیہؒ کی زندگی گذری تھی۔

۲) اگر محمد حنفیہؒ سے یہ خیالات امامت و مہدیت ظاہر ہوتے تو عبداللہ بن زبیر زندہ نہ چھوڑتے۔ محض بیعت نہ کرنے پر تو انہیں قید کیا اور زندہ جلانے کا اہتمام کیا تھا۔

۳) محمد حنفیہؒ سے مختار نے جب بھی جنگ کرنے کی اجازت مانگی آپ نے یہی جواب دیا کہ وہ بات کرو جس سے خدا خوش ہو۔ خدا سے ڈرتے رہو اور فتنہ و فساد نہ کرو۔

۴) محمد حنفیہؒ کو رہائی دلوانے کے بعد مختار کے سپہ سالار نے آپ سے جنگ کرنے کی اجازت چاہی آپ نے اسے اجازت نہیں دی پھر اسی موقع پر ایک وقت ایسا آگیا کہ فوجیں صف بستہ ہو گئیں تو آپ درمیان میں آگئے اور پرزور الفاظ میں کہا کہ مکہ میں خونریزی حرام ہے۔ عراقی فوجوں کو مخاطب کر کے کہا میں تمہیں حرم میں جنگ کرنے کی کبھی اجازت نہیں دونگا۔ اس طرح آپ نے ایک خونریز جنگ کو رکوایا۔

۵) نہ علی زین العابدینؑ نے نہ محمد حنفیہ نے مختار کو خروج پر آمادہ کیا اور نہ اجازت دی لیکن اسکو خروج سے روکا بھی نہیں۔ اور مختار نے بھی ہمیشہ خروج کی اجازت چاہی مگر کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر آپ اجازت نہیں دینگے تو میں خروج نہیں کروں گا وہ تو صرف اپنی تحریک کو تقویت حاصل کرنے کیلئے اجازت چاہتے تھے۔

۶) مختار کا یہ دعویٰ کہ جناب محمد حنفیہؒ نے انہیں اپنا نائب بنا کر جہاد کیلئے مقرر کیا قطعی غلط تھا۔ جو اس خط سے ثابت ہوتا ہے جو مختار نے ابراہیم کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ یہ محمد حنفیہ کا خط ہے گو کہ وہ خط جعلی تھا جسے پڑھ کر ابراہیم سمجھ گئے تھے اور دوسرے لوگ بھی جان گئے تھے۔

۷) اگر مختار' محمد حنفیہؒ کو درمیان میں نہ لاتے' آپ کا نام استعمال نہ کرتے تو کیا ابراہیم بن مالک اشتر اور دیگر شعیان کوفہ اس کا ساتھ دیتے۔ اس کا واضح جواب ہوگا ہرگز نہیں۔ لہٰذا مختار نے اپنی تحریک کی تقویت کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔

اولاد : جناب محمد حنفیہ کی زیادہ سے زیادہ اولاد چوبیس بتائی گئی ہے۔ ویسے عام طور پر مورخین نے صرف چودہ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے صرف چار فرزندان سے آپکی نسل پھیلی ہے۔ جیسا کہ شیخ عباس قمی نے لکھا ہے کہ "محمد بن حنفیہ را بیست و چہار فرزند بودہ کہ چہاردہ تن از ایشان ذکور بودند۔"

سبط ابن جوزی نے جو اولاد محمد حنفیہ کے نام تحریر کئے ہیں وہ پچیس بنتے ہیں ان میں ایک نام محمد فاضل معلوم ہوتا ہے۔ الغرض محمد حنفیہ کی اولاد کے نام اور ان کی ماؤں کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱) عبداللہ : ان کی کنیت ابوہاشم تھی یہ سب سے بڑے بیٹے تھے ان کی بابت ابن جوزی نے لکھا ہے کہ انھیں سلیمان بن عبدالملک نے زہر آلود دودھ پلایا تھا۔[1] ان کی ماں نائیلہ بنت خالد بن علقمہ بن حویرث کنانیہ تھیں لیکن بعض نے انھیں ام ولد لکھا ہے۔ اہل خراسان میں سے کیسانیہ فرقہ کے لوگ عبداللہ کو امام مانتے تھے۔ گو کہ عبداللہ نے بنو عباس کی بیعت کی ہوئی تھی۔

۲) محمد اصغر : یہ عبداللہ (ابوہاشم) کے ماں جائے بھائی تھے۔ ان کے اولاد نہیں تھی۔

۳) محمد اکبر : (۴) لبابہ : ان کی ماں فاطمہ بنت محمد بن عبیداللہ بن عباس بن عبدالمطلب تھیں۔

۵) علی : ان کی ماں کا نام ام عثمان بنت ابی حدیر قضائی تھا۔

۶) ریطہ : انکی ماں ربیعہ بنت حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب تھیں۔ یہ ریطہ زوجہ تھیں حضرت زید شہید ابن علی زین العابدینؑ کی اور ماں تھیں یحییٰ بن زید شہید کی۔

۷) جعفر اکبر : ان کی ماں ام ولد تھیں اور ان کی نسل کثیر ہے۔ یہ یوم حرہ یعنی وہ دن جب یزید بن معاویہ کے حکم سے مسرف بن عقبہ مری نے مکہ کو تاخت و تاراج کیا تھا شہید ہوئے۔

۸) ابراہیم : انکی ماں مسرعہ بنت عماد بن شیبان بن جابر مضری تھیں۔

) قاسم : (۱۰) عبدالرحمن (۱۱) ام ابیہا : ان تینوں کی ماں برہ

[1] تذکرۃ الخواص ص :۳۵۸

بنت عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب تھیں۔

(۱۲) عون، (۱۳) جعفر اصغر، (۱۴) عبداللہ اصغر : ان تینوں کی ماں ام جعفر بنت محمد بن جعفر بن ابیطالب تھیں۔

(۱۵) حمزہ، (۱۶) حسن، (۱۷) جعفر، (۱۸) علی، (۱۹) طالب، (۲۰) عبیداللہ، (۲۱) عون، (۲۲) ام سلمہ، (۲۳) عبداللہ، (۲۴) رقیہ یہ سب مختلف امہات الولد سے تھے۔

جناب محمد حنفیہ کی اولاد میں سے جن چار فرزندان کے ذریعہ آپ کی نسل پھیلی وہ ابوہاشم عبداللہ، جعفر اکبر، علی اور عون ہیں۔ ان میں ابوہاشم عبداللہ، علی اور عون کی نسل کا تذکرہ گاہے گاہے ہی ملتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ابوہاشم عبداللہ اور علی نے کیسانیہ فرقہ کی امامت کی جو محمد حنفیہ کی وفات کے بعد پیدا ہو گیا تھا علی بن محمد حنفیہ کے بیٹے ابو محمد حسن عالم و فاضل شخص تھے۔

جعفر اکبر ابن محمد حنفیہ کی نسل کا ذکر قدرے زیادہ ہے غالباً اس کی وجہ اس نسل کے متعدد افراد کا علم و فضل، عبادت و دیانت سے وابستہ رہنا ہے۔ جعفر اکبر کے ایک بیٹے عبداللہ تھے ان کے بیٹے جعفر ثانی اور ان کے بیٹے عبداللہ راس المذری تھے۔ راس المذری کے چار فرزندان جعفر ثالث، علی، اسحاق اور قاسم تھے۔ جعفر ثالث کے چار بیٹے عبداللہ، موسیٰ، علی اور زید تھے۔ ان میں علی کے ایک بیٹے ابو علی محمد ی جو بصرہ میں آباد تھے اور بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ بعض مورخین نے ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ علی کے دوسرے بیٹے عباس کے پوتے حسن صدیق عمری کہلاتے تھے۔ راس المذری کے دوسرے بیٹے علی کی اولاد میں ابوالحسن احمد جو شریف و نقیب تھے وہ بیٹے تھے قاسم کے اور قاسم بیٹے تھے محمد العوید کے جو بیٹے تھے علی بن راس المذری کے۔ ابوالحسن احمد کے بیٹے ابو محمد حسن جلیل القدر سید تھے

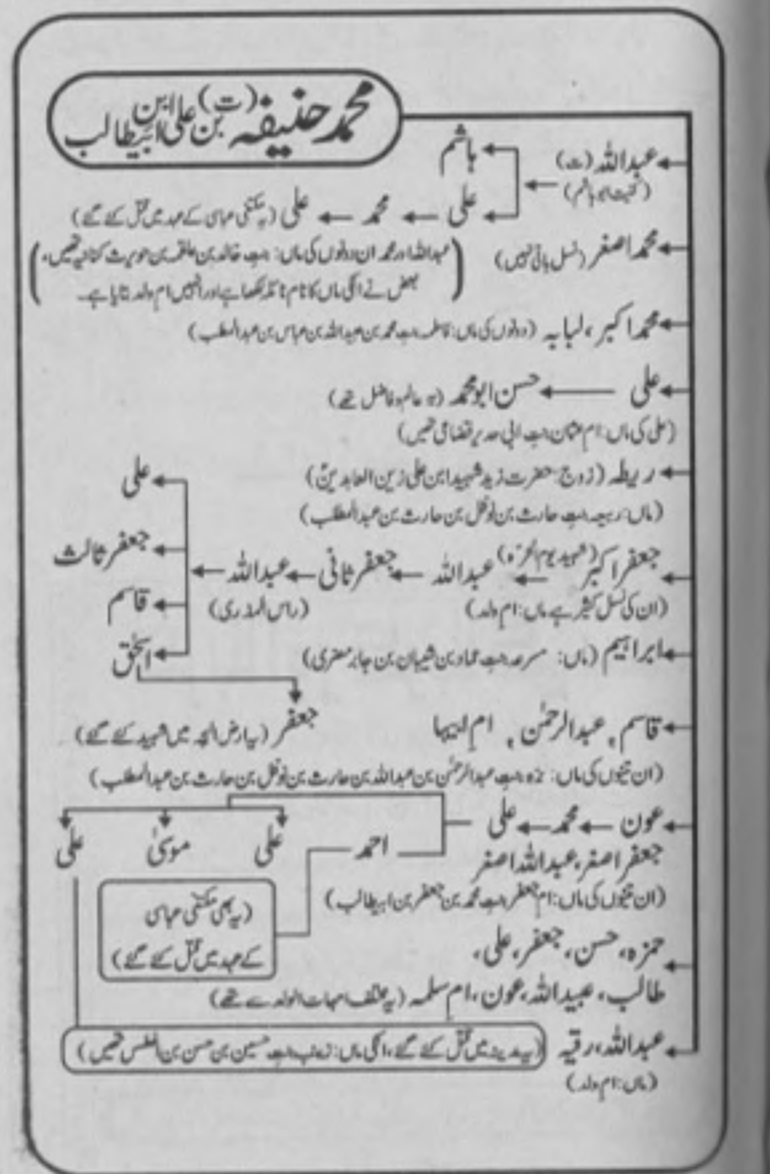

اور بقول خلیفہ سید مرتضیٰ یہ علم و جلالت اور فضل و درایت میں مشہور تھے اور نقیب بغداد کہلاتے تھے۔ راس المذری کے تیسرے بیٹے اسحاق کی نسل میں سے ایک بیٹے جعفر کو مکتفی عباسی کے دور حکومت میں قتل کر دیا گیا جب کہ دوسرے بیٹے علی کی اولاد میں سے ابوالعباس عقیل فقیہہ و محدث اور ثقہ سید تھے۔ یہ عقیل بیٹے تھے حسین کے جو بیٹے تھے محمد کے اور محمد بیٹے تھے اسحاق کے۔ راس المذری کے چوتھے بیٹے قاسم فاضل و محدث تھے ان کے بیٹے ابو محمد عبداللہ تھے۔

کربلا اور کربلا کے بعد

مولف: ارتضیٰ بن رضا نواز پوری

اس کتاب میں تاریخ کی روشنی میں مستند واقعات

- امیہ کا ہاشم سے برسرِ فساد ہونا
- امیہ کے اخراج کا بدلہ صفین و کربلا میں
- حسینی قافلہ کے سفر و منازل سفر کے صحیح واقعات
- شہادتِ امام حسینؑ کے اثرات
- شہر بہ شہر اسیرانِ کربلا کا اعلانِ حق
- قاتلانِ حسین کا انجام
- ناصبی فرقہ کی موشگافیاں
- کربلا سے متعلق دیگر واقعات

بالترتیب بیان کئے گئے ہیں

غیر جانبدارانہ مضامین کی بدولت یہ کتاب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

قیمت: -/60 روپے

حضرت ابوالفضل العباسؑ

ولادت باسعادت : کتنا متبرک و مبارک اور روح پرور ہوگا وہ وقت جب پیکر ایثار و وفا، منبۂ صبر و رضا، سقائے تشنگانِ کرب و بلا، پرچم تسلیم و رضا، جرأت و شہامت کی آیت کبریٰ، محبت و اطاعت کی رمز یکتا، حریم مقصد حسینی، اوج و سماوات کے مہر درخشاں، فرزند فاتح بدر و حنین اور خیبر و خندق، علمدار سپاہ حسینی حضرت ابوالفضل العباس بصورت قمر بنی ہاشم مطلع وفا پر طلوع ہوئے اور دنیائے ایثار آپ کی ضوفشانی سے جگمگا اٹھی۔ ام البنین کی آغوش جنت نظیر بن گئی جبکہ حیدر کرار کا بیت الشرف شمع نور مانند جلوۂ طور روشن و منور ہو گیا۔

تاریخ لکھنے والوں نے اس مبارک دن و تاریخ کو تو یاد نہیں رکھا البتہ یہ ضرور بیان کر دیا کہ آپ نے چونتیس سال کے سن میں شہادت پائی۔ اس اعتبار سے آپ کی ولادت باسعادت ۲۶ھ میں قرار پاتی ہے۔ تاریخ ولادت کی بابت ائمہ اہلبیت سے منقول ہے کہ بنی ہاشم کا یہ قمر ۴ر شعبان کو طلوع ہوا۔ لہٰذا آپ کی متفقہ و مصدقہ تاریخ ولادت ۴ر شعبان ۲۶ھ بروز شنبہ (منگل) قرار پائی۔[1]

ولادت کے بعد نومولود کو امیر المومنین حضرت علیؑ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے نومولود کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہی۔

[1] قمر بنی ہاشم (فارسی) ص: ۲۲

اور عباس نام رکھا۔ جس کے بعد حضرت امام حسینؑ نے بھائی کو اپنی آغوش میں لیا۔ جس طرح آپ کے پدر عالی قدر حضرت علیؑ نے وقت ولادت اپنے برادر بزرگ ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰؐ کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں اسی طرح جناب عباسؑ نے اپنے برادر محترم کی گود میں آنکھیں کھول کر سب سے پہلے آپ ہی کی زیارت فرمائی۔

القاب وکنیت : جناب عباس کے بہت سے القاب ہیں (ان میں سے کچھ ایسے جو واقعہ کربلا کے بعد مشہور ہوئے۔) جیسے قمر بنی ہاشم، سقائے حرم، عبد صالح، باب الحوائج، حامل اللواء، ابو القربہ، الضیغم، المواسی، الحامی وغیرہ۔ آپ کی کنیت ابوالفضل اور ابوالقاسم ہے۔ چند اہم القاب وکنیت کا مختصر تعارف پیش ہے۔

قمر بنی ہاشم : فضل وکمال کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صفات حسن وجمال سے بھی نوازہ تھا۔ اسی خوبصورتی و رعنائی کے سبب آپ کا مشہور ترین لقب قمر بنی ہاشم تھا۔ ویسے بھی خاندان بنی ہاشم کے بزرگ خوبصورتی وخوش شکلی میں بے نظیر تھے۔ ہر دور میں ان کے نمایاں حضرات کو ان کے غیر معمولی حسن وجمال کے باعث قمر کے لقب سے ملقب کیا جاتا رہا تھا۔ جیسے جناب ہاشم کے والد عبد مناف بن قصیٰ کا لقب "قمرِ بطحا" تھا۔ جناب رسالتمآبؐ کے پدر محترم جناب عبداللہ بن عبدالمطلب "قمرِ حرم" کہلائے۔ آنحضرتؐ کو جناب فاطمہ زہراؑ " کانه القمر فی لیلته تمامه و کماله" کے لقب سے یاد فرمایا کرتی تھیں۔ اور حضرت امام حسینؑ کیلئے مورخین نے " کفلقة القمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اسی طرح حضرت عباس قمر بنی ہاشم مشہور ہوئے۔ قمر کا ایک معنوی وصف یہ بھی ہے کہ وہ خود ذاتی نور کا حامل نہیں ہوتا بلکہ اسکا نور مہر تاباں کا عطیہ ہوتا ہے

ابو القربہ : قربہ کے معنی مشک کے ہیں۔ یہ لقب آپ کو واقعہ کربلا کے بعد ملا۔ چونکہ آپ میدان کربلا میں مشک لیکر نکلے تھے لہٰذا ابو القربہ کہلائے۔

سقائے حرم : سقائی ایک سعادت ہے جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ حضرت عباس نے جس طرح اہل حرم کی سقائیت کا فرض ادا کیا اس کی تاریخ انسانیت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ سقائیت کی بابت رسالتمآبؐ سے بہت سی روائتیں منقول ہیں۔ مثلاً آنحضرت صلعم کا ارشاد گرامی ہے :

> ترجمہ : "خدا کے نزدیک بہترین عمل تشنہ جگر کو پانی پلانا ہے خواہ حیوان ہو یا انسان" (دارالسلام ص : ۱۶۲ ج : ۳)

ایک اور حدیث میں ارشاد پیغمبرؐ ہے۔

> ترجمہ : "اگر کسی نے پانی کی فراہمی و موجودگی کے باوجود پانی پلایا تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح درختوں کے پتے جھڑتے ہیں" (جامع الصغیر ص : ۳۳ ج : ۱)

حضرت امام جعفر الصادقؑ کا ارشاد ہے :

> ترجمہ : " اگر کسی نے پانی کی موجودگی و فراہمی میں کسی کو سیراب کیا تو گویا اس نے راہ خدا میں غلام آزاد کیا اور اگر کسی ایسی جگہ پر سیراب کیا جہاں پانی نہیں تھا تو اس کی حیثیت اس شخص جیسی ہے جس نے کسی کو زندہ کیا ہو اور اگر کسی نے ایک شخص کو زندگی دی گویا اس نے بنی نوع انسانی کو حیات بخشی"
>
> (مکارم الاخلاق ص : ۸۵ فصل ۷، باب اول)

یہی وجہ ہے کہ بنی ہاشم نے ابتدا ہی سے سقایت پر خصوصی توجہ دی۔ جناب قصیٰ نے شہر میں ایک کنواں کھدوایا جس کا نام "بذر" رکھا اور اعلان کرایا کہ اس کنویں کے استعمال سے کوئی کسی کو نہ روکے۔ جناب

عبدالمطلب نے بھی اپنے زمانہ میں چاہ زمزم کی کھدائی کی جس سے چشمہ پھوٹ پڑا۔ انہوں نے اسے عوام الناس کیلئے بطور سبیل مباح قرار دیا۔

عبد صالح : ارباب تاریخ ومقاتل نے آپ کے اس لقب کا ذکر نہیں کیا درآنحالیکہ یہ وہ لقب ہے جو آپ کی عظمت و منزلت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس لقب سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے آپ کو زیارت میں "السلام علیك ایها العبد الصالح" کہہ کر مخاطب فرمایا۔ عبد صالح وہ فضیلت ہے جو انسان کے کمال کی آخری حد ہوتی ہے۔

باب الحوائج : آپ کا یہ لقب جملہ مسلمانوں میں بالاتفاق یکساں طور پر شہرت رکھتا ہے جب کوئی صاحب حاجت خواہ وہ کسی فرقے اور کسی عقیدہ کا ہو اپنی بے چارگی میں آپ کو وسیلہ بناتا ہے تو مراد پاتا ہے۔

حامل اللواء : یعنی علمدار۔ کربلا کے میدان میں حضرت عباس کی چند روزہ علمداری تاریخ میں یادگار ہے اس کی تفصیل ہم آئندہ صفحات میں تحریر کریں گے۔

ابوالفضل : حضرت عباسؑ کے ایک فرزند کا نام فضل تھا اس اعتبار سے آپ کی کنیت ابوالفضل ہوئی۔ لیکن یہ آپ کا لقب بھی ہے چونکہ آپ بڑے فضل وکمال کے حامل تھے لہٰذا آپ کا لقب ابوالفضل مشہور ہوا۔

ابوالقاسم : آپ کے ایک فرزند کا نام قاسم تھا جن کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوالقاسم ہوئی۔ یہ کنیت کتب تواریخ میں مرقوم نہیں ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری جب سب سے پہلے اربعین میں کربلا پہنچے تو انہوں نے حضرت عباس کی زیارت ان کلمات میں پڑھی :

> " السلام علیك یا اباالقاسم. السلام علیك یا عباس ابن علیؑ"
>
> ترجمہ : سلام ہو تم پر اے ابوالقاسم، سلام ہو یا عباس ابن علی

حسب ونسب : جناب ابوالفضل العباس کا پدری نسب دنیائے عرب کا معزز ترین و مشہور ترین نسب ہے۔ یعنی عباس بن علیؑ بن ابیطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیٰ۔ آپ کا مادری نسب بھی کچھ کم باعث عزوشرف نہ تھا۔ آپ کی مادر گرامی کا نام فاطمہ اور کنیت ام البنین تھی۔ یہ معظمہ اپنی کنیت ہی سے مشہور ومعروف ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب ام البنین بنت حزام بن خالد بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب ہے۔ اور ام البنین کی والدہ ثمامہ بنت سہل بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب تھیں۔ قبیلہ بنی کلاب قبائل قریش کے صاحب فضیلت و عزت قبائل میں سے ایک تھا۔ اس قبیلے کے لوگ جری وبہادر، نڈر وحاضر جواب اور شاعر وادیب تھے۔ قبیلہ کلاب کے ایک مشہور ومعروف شخص لبید بن ربیعہ تھے جو عہد جاہلیت کے ان سات بڑے آدمیوں میں سے ایک تھے جو "سبعہ معلقات" کے نام سے مشہور تھے اور جن کے اشعار دیوار کعبہ پر آویزاں کئے جاتے تھے۔ لبید بن ربیعہ بڑے شجاع، کریم اور حق پسند تھے انہوں نے دین اسلام قبول کرنے میں ذرا دیر نہیں کی۔ عرب کے مشہور بہادر ابوبرا عامر بن مالک، عامر بن طفیل اور عتبہ بن جعفر کا تعلق بھی اسی قبیلہ سے تھا۔

ام البنین کا عقد : حضرت علیؑ کی دلی تمنا تھی کہ پروردگار عالم انہیں ایک جری وبہادر فرزند عطا فرمائے۔ لہٰذا حضرت علیؑ نے اپنے بڑے بھائی عقیل سے جو انساب عرب کے ماہر تھے اپنی خواہش کا اظہار فرمایا جناب عقیل نے تلاش وکوشش کے بعد جناب ام البنین سے آپ کا عقد کرایا۔ اس عقد کی بابت شیخ عباس قمی نے تحریر کیا ہے کہ :

> "وقتی امیر المومنینؑ برادر خود عقیل را فرمود کہ تو عالم بانساب عرب زنی برای من اختیار کن کہ برای من فرزندی بیاورد کہ فحل

وفارس عرب باشد۔ عرض کردم کہ ام البنین کلابیہ را تزویج کن کہ شجاعتر از پدران او ہیچکس در عرب نبودہ پس جناب امیر المومنین اور ا تزویج کرد وازاو جناب عباس وسہ برادر دیگر متولد گشت۔" (منتہی الآمال ص: ۲۳۰ ج:۱)

جناب ام البنین کی شادی کے وقت کی بابت مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد حضرت علیؑ کا پہلا عقد ام البنین سے ہوا۔[1] دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا کے بعد امامہ بنت ابی العاص سے پہلا عقد ہوا اور اس کے بعد دوسرا عقد ام البنین سے ہوا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ جناب خولہ کے بعد آپ حضرت علیؑ کے عقد میں آئیں۔ جناب عبید اللہ امر تسری نے ازواج علیؑ کی ترتیب و تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ حضرت علیؑ کی زوجہ اول حضرت فاطمہ زہرا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھیں ان کی حیات میں آپ نے کوئی دوسرا عقد نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد دوسری بی بی ام البنین بنت حزام بن خالد تھیں۔ تیسری بی بی اسماء بنت عمیس الخثعمیہ تھیں چوتھی بی بی امامہ بنت ابی العاص تھیں۔ جناب امیر کی شہادت کے بعد امامہ نے مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبد المطلب سے نکاح کیا۔ اور امامہ ۵۰ھ میں فوت ہوئیں۔ پانچویں بیوی محیاۃ بنت امراء القیس تھیں چھٹی بی بی ام سعید بنت عروہ بن مسعود ثقفی تھیں ساتویں بی بی لیلیٰ بنت مسعود بن خالد تمیمیہ تھیں ان سات پر مورخین کا اتفاق ہے بقیہ دو بیویوں جن پر اختلاف ہے کہ آیا یہ مملوکہ تھیں یا آزاد' ان میں ایک خولہ بنت جعفر بن قیس حنفیہ تھیں اور دوسری ام حبیب بنت ربیعہ ثعلبیہ تھیں۔[3]

[1] تاریخ کامل ص: ۲۰۰ ج: ۳ [2] تاریخ طبری ص: ۸۹ ج: ۶ [3] ارجح المطالب ص: ۸۳۳

عام طور سے جملہ مورخین نے جناب ام البنین کے بطن سے چار بیٹے عباس' عبد اللہ' جعفر اور عثمان بتائے لیکن بعض نے رقیہ نامی ایک بیٹی کا بھی ذکر کیا ہے اور انھیں جناب مسلم بن عقیل کی زوجہ بتایا ہے جو درست نہیں کیونکہ ام البنین کے بطن سے کوئی بیٹی پیدا نہیں ہوئی۔ عبد اللہ بن مسلم بن عقیل کے ضمن میں ابو الفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ "وامہ رقیہ بنت علی ابن ابیطالب وامہا ام ولد"[1] یعنی ان (عبد اللہ) کی ماں رقیہ بنت علی بن ابیطالب تھیں جن کی ماں ام ولد تھیں۔ انہی عبد اللہ کی بابت سبط ابن جوزی کا بیان ہے کہ "اور عبد اللہ بن مسلم بن عقیل شہید ہوئے ان کی والدہ رقیہ بنت علی تھیں اور رقیہ کی والدہ کنیز تھیں"[2] اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے جناب مسلم بن عقیل کی زوجہ رقیہ بنت علی ام البنین کے بطن سے ہرگز نہیں تھیں۔ حضرت علیؑ کی دو دختران کے نام رقیہ تھے جن میں سے ایک ام حبیب بنت ربیعہ ثعلبیہ کے بطن سے تھیں اور دوسری ام سعید بنت عروہ ثقفیہ کے بطن سے تھیں جناب مسلم بن عقیل کی زوجہ رقیہ انہی دونوں میں سے ایک تھیں بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رقیہ عمر الطرف کی جڑواں بہن تھیں جیسا کہ ہم دختران کے ذکر میں لکھ آئے ہیں۔

جناب ام البنین واقعہ کربلا کے بعد تک زندہ رہیں۔ انہوں نے حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد دوسرا عقد نہیں کیا گو کہ مغیرہ بن نوفل نے نکاح کا پیغام بھی دیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "رسولؐ اور جانشین رسولؐ کی بیویاں کسی اور سے عقد نہیں کرتیں"۔[3] جناب ام البنین کے علاوہ حضرت علیؑ کی تین ازواج امامہ' اسماء اور لیلیٰ نے بھی آپ کے بعد عقد ثانی نہیں کیا اور یہی وہ چار ازواج تھیں جو حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد

[1] مقاتل الطالبین ص: ۶۲ [2] تذکرۃ الخواص ص: ۳۰۸ [3] ابن شہر آشوب ص: ۳۰۵ ج: ۳

حیات تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبید اللہ امر تسری کا یہ بیان کہ امامہ نے مغیرہ بن نوفل سے عقد ثانی کیا درست نہیں البتہ مغیرہ نے عقد کا پیغام ضرور دیا تھا جسے ان ازواج علیؑ نے مسترد کر دیا تھا۔

طفولیت و تربیت: آپ کا بچپن انتہائی شفقت و محبت میں گزرا۔ والدین کی آغوشِ پرورش بھائیوں کی رفاقت و عنایت' بہنوں کا لطف و کرم اور دیگر بنو ہاشم کی نازبرداری میں پرورش پانے والا یہ بچہ جب بڑا ہوا تو اسکی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ دانش گاہ و خانہ رسالتمآبؐ جسکے سرپرست اعلیٰ حضرت علیؑ ابن ابیطالب تھے اور نگران معلم حسنین علیہم السلام تھے۔ اس درسگاہ میں جناب عباس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اسی دانش گاہ سے آپ نے اخلاق و آداب' علم و معرفت ایثار و شجاعت' اطاعت و فرمانبرداری' عصمت و طہارت' ثبات و استقامت اور یقین و شہادت میں کمال حاصل کیا۔ اسی اعلیٰ تربیت کے پیش نظر حضرت امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا "بے شک عباس ابن علیؑ کو علوم بھر دیئے گئے تھے۔"[1]

حضرت عباس کے بچپن کا ایک واقعہ اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ جناب امیر المومنین حضرت علیؑ اپنے اس فرزند کو آغوش میں لئے ہوئے فرماتے ہیں:

> "بیٹا ایک کہو' حضرت عباس نے کہا 'ایک' حضرت علیؑ نے فرمایا 'بیٹا دو کہو' حضرت عباس نے جواب دیا 'جس زبان سے ایک کہہ چکا ہوں شرم آتی ہے کہ اسی سے دو کہوں۔"
>
> (مستدرک حاکم ص: ۸۱۵ ج: ۳)

اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت علیؑ کی تربیت اور آپ کی آغوش علم' عمل و ایمان نے حضرت ابو الفضل العباس کو توحید کے بلند ترین مقام پر گامزن کر دیا تھا۔

[1] اسرار الشہادت ص: ۳۲۴

حضرت عباس نے اپنی زندگی کے ابتدائی چودہ سال دامنِ ابو الآئمہ حضرت علیؑ کے عصمتی کردار سے استفادہ کیا' دس سال امام دوئم حضرت امام حسنؑ مجتبیٰ اور دس سال امام سوئم حضرت امام حسینؑ مظلومِ کربلا کی تربیت سے مستفید ہوئے۔ عباس علیؑ کی تمنا' عباس شجاعت علیؑ کے وارث' عباس اہلبیت کی ڈھارس' عباس شجاعت و وفا کے پیکر' عباس آئینہ کردار علیؑ' عباس لشکر شبیر کے علمدار' عباس سپاہ حسینی کے سپہ سالار' عباس تیغ ید اللہ کی جھنکار' عباس تسکین قلب سید ابرار' عباس سقائے سکینہ' عباس کربلا کے پیاسوں کی آخری امید۔

علم و علمداری: مختلف زبانوں اور علاقوں میں علم کے ہم معنی مختلف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً رایت' لواء' پرچم' نشان' جھنڈا' بیرق' درفش وغیرہ۔ موقع کی اہمیت کی مناسبت سے ان الفاظ کا مفہوم تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً لفظ "علم" ایک خاص قسم کے نشان کو کہتے ہیں جو عزاداری سید الشہداء کیلئے مخصوص ہے۔ جب کہ قومی و ملکی نشان کو عام طور سے پرچم کہا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاسی' مذہبی و لسانی جماعتوں کے نشان کو جھنڈے کا نام دیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں رایت اور لواء کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جیسا کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسالتمآبؐ نے 'رایت' کا لفظ استعمال کیا جب کہ میدان حشر میں "لواء الحمد" کا ذکر ہے۔

تاریخی اعتبار سے علم یا پرچم کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت شیث اور قابیل کی جنگ میں فرشتے ایک سفید رنگ کا علم حضرت شیث کے لئے لائے تھے اور فرشتے ہی اس کے علمبردار تھے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ رومیوں سے جنگ کے دوران حضرت ابراہیم سب سے پہلے علمدار تھے۔ علم یا پرچم کی اہمیت ہر دور' ہر علاقے اور ہر قوم

میں قائم رہی۔ مشرق ہو یا مغرب، دورِ جاہلیت ہو یا زمانہ اسلام جب بھی جنگیں ہوتیں ان میں ہر فوج کا ایک علم اور اس کا ایک علمدار ہوتا تھا۔ اس علم کے ذریعہ فوجوں کی تنظیم و ترتیب قائم رہتی تھی۔ اور یہ علم ہر قوم کے مزاج و مقصد کے مطابق مختلف رنگوں اور مختلف نقش و نگار سے مزین ہوتے تھے اور متعلقہ اقوام انہیں باعث عزت و افتخار مانتی تھیں۔ یہاں تک کہ بہادر و زندہ قومیں اپنے پرچم کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں اور قومی عظمت کا نشان تصور کرتی تھیں۔

زمانہ قدیم کی طرح دورِ حاضر کی اقوام بھی اپنے قومی پرچم کا احترام کرتی ہیں۔ قومی پرچم کے علاوہ مذہبی، سیاسی و لسانی جماعتیں بھی اپنے پرچم یا جھنڈے کا اسی طرح احترام کرتی ہیں۔ جماعت کے ہر فرد کے لئے اپنی پارٹی کے جھنڈے کا احترام لازم ہے۔

قبائل عرب کے بھی اپنے اپنے پرچم ہوتے تھے جنہیں وہ جاہلیت اور زمانہ اسلام میں میدان جنگ میں لیکر نکلتے تھے۔ عہد اسلام میں جب سرایہ و غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو رسالتمآبؐ نے ہر جنگ میں پرچم اسلام حضرت علیؑ کی موجودگی میں کسی اور کو نہیں دیا۔ یہانتک کہ غزوۂ خیبر میں جب حضرت علیؑ آشوب چشم میں مبتلا تھے اور قموس کا قلع فتح نہیں ہو رہا تھا تو رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا۔ "لاعطین الرایة غداً رجلا یحب الله ورسوله ویحبه الله و رسوله یفتح الله علی یدیه کرار لیس بفرار" ترجمہ: کل یہ علم اسکو ملے گا جو مرد ہوگا، کرار ہوگا، غیر فرار ہوگا وہ خدا و رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اسکو دوست رکھتے ہوں گے اور خدا اسکے ہاتھ فتح دیگا"[1]۔

[1] یہ حدیث بالتفصیل کتب حدیث و تاریخ میں الفاظ کے رد و بدل کیساتھ مرقوم ہے۔ صحیح بخاری ص ۹۲، ۱۰۲ باب ۲، صحیح مسلم ص ۲۷۸، ج ۲، مستدرک ص ۱۳۵، ج ۳، مسند امام حنبل ص ۳۹۹، ج ۲ وغیرہ

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد رسالتمآبؐ نے علم حضرت علیؑ کو دیا۔ آپ میدان میں گئے اور نصرتِ خداوندی سے کامیابی حاصل ہوئی (اس واقعہ کی تفصیل گذشتہ صفحات میں مرقوم کی جاچکی ہے) علم اور علمداری کی بابت حضرت علی ابن ابیطالب نے جنگ صفین کے موقع پر ارشاد فرمایا:

> "خبردار پرچم اپنے مرکز سے نہ ہٹنے پائے اسے صرف بہادروں کے پاس رہنا چاہئے جو شخص مصائب کو برداشت کر سکے اور شدائد کا مقابلہ کر سکے وہی مجاہد کہا جاسکتا ہے اور جو محافظت کا اہل ہوتا ہے وہی پرچم کے گرد و پیش رہتا ہے اور چاروں طرف سے اس کی حفاظت کرتا ہے، محافظ افراد اپنے پرچم کو ضائع نہیں کرتے وہ نہ پیچھے رہ جاتے ہیں کہ پرچم دوسروں کے حوالے کر دیں اور نہ آگے نکل جاتے ہیں کہ پرچم کو پیچھے چھوڑ دیں"۔
>
> (نہج البلاغہ)

ارشاد پیغمبرؐ اور فرمانِ وصی پیغمبرؑ سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ علم اس شخص کو عطا کیا جاتا ہے جس میں مذکورہ بالا صفات موجود ہوں۔

کربلا کے میدان میں حضرت امام حسینؑ نے اپنے بھائی ابو الفضل العباسؑ کو علمداری کے لئے منتخب فرمایا جن میں مذکورہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور جنہوں نے اس ذمہ داری کو اس بہترین انداز میں ادا کیا کہ چند روزہ جنگ کی علمداری کے باوجود لفظ علمدار آپ کے نام کا جزبن گیا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تمام اقوام و ممالک کے پرچموں کی حدود معین ہیں لیکن لشکر حسینی کے علمدار کے پرچم کی کوئی حد مقرر نہیں یہ دنیا کے کونے کونے میں لہرایا جاتا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے حضرت عباس کا علم لہراتا رہیگا انشاءاللہ۔

اولاد: مورخین اور ماہرین انساب نے جناب ام البنین کے بطن سے صرف چار فرزندان عباس، عثمان، جعفر اور عبداللہ کا ذکر کیا۔ ان میں حضرت عباس سب سے بڑے تھے۔ آپ کی ولادت ۴ر شعبان ۲۶ھ میں ہوئی جب کہ جعفر کی ولادت ۳۲ھ میں، عبداللہ کی ۳۶ھ اور عثمان کی ۴۰ھ میں ہوئی۔ حضرت عباسؑ کے یہ تینوں ماں جائے کارزار کربلا میں ۱۰ر محرم ۶۱ھ کو شہید ہوئے۔ جناب عبداللہ اور جعفر کو ہانی بن ثبیت حضرمی نے شہید کیا اور عثمان، خولی بن یزید اصحی کے تیر سے شہید ہوئے۔ شہادت کے بعد قبیلہ ابان بن دارم کے ایک شقی نے سر قلم کیا۔ عثمان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

حضرت عباس بن علیؑ بھی میدان کربلا میں شہید ہوئے آپ کے مقتل کے واقعات واقعہ کربلا کے ضمن میں تفصیلاً بیان کئے جائیں گے۔ یہاں آپ کی اولاد کی تفصیل درج ہے۔ جناب ابو الفضل العباسؑ کی اولاد کی تعداد میں مورخین نے اختلاف کیا ہے اور ان کے ذکر میں ناموں کی یکسانیت کے باعث اکثر غلطی ہوئی ہے۔ ہم نے مختلف کتب اور شجرۂ نسب کی مدد اور موازنہ کر کے آپ کی اولاد کی ترتیب دی ہے۔

کسی نے آپکے ایک فرزند، کسی نے دو اور کسی نے تین فرزند بتائے ہیں جبکہ بعض نے پانچ فرزند تحریر کئے ہیں جنکے نام۔ فضل، عبداللہ، حسن، قاسم اور محمد تھے۔[1] جبکہ بعض نے چار بیٹے فضل، عبداللہ، حسن اور قاسم بتائے ہیں اور یہی درست ہے لیکن ابن شہر آشوب نے آپ کے ایک فرزند محمد کو شہدائے کربلا میں قرار دیا ہے۔ حالانکہ صاحب کبریت الاحرام کا بیان ہے کہ حضرت عباسؑ کی شہادت کے بعد آپ کے دو فرزندان محمد اور عبداللہ

[1] شخصیت ابو الفضل ص: ۴۹

یا قاسم میدان میں جانے کیلئے خیمہ سے نکلے لیکن حضرت امام حسینؑ نے فرمایا تمہارے باپ کی شہادت کافی ہے۔ جناب محمد ابن عباس ہی کا نام فضل تھا اور فضل جناب عباس کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ اس بحث سے یہ پتہ چلا کہ جناب عباس کے چار فرزند فضل، عبداللہ، حسن اور قاسم تھے۔ لیکن تاریخ میں فضل اور قاسم کا ذکر نہیں ملتا۔ مورخین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جناب عباس کی نسل عبداللہ سے باقی رہی اور حسن سے بھی آپ کی نسل چلی جبکہ بعض نسب نگاروں نے حسن بن عباس سے نسل چلائی ہے اور عبداللہ کے صرف ایک دختر نفیسہ نامی کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ایک بات قابل توجہ یہ بھی ہے کہ جنہوں نے عبداللہ سے نسل چلائی ہے انہوں نے عبداللہ کو عبیداللہ لکھ کر حسن کو ان کا بیٹا ظاہر کیا اور نسل کو آگے بڑھایا۔ بہر حال عبداللہ بن عباس کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی جناب عباس کی نسل حسن بن عباس کے ذریعہ تمام عالم میں پھیلی۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

حسن بن ابو الفضل العباس کے پانچ فرزند۔ ۱) عبیداللہ جو قاضی الحرمین تھے۔ ۲) عباس جو شاعر و خطیب تھے۔ ۳) حمزۃ الاکبر ان کی کنیت ابو القاسم تھی اور ان کا چہرہ حضرت علیؑ سے مشابہ تھا۔ ۴) ابراہیم جرّقہ یہ ادیب و فقیہ تھے۔ ۵) فضل جو فصیح البیان، شدید الدین اور شجاع تھے۔

۱) عبیداللہ: یہ صاحب ہیبت و حشمت و مروت تھے یہ مامون الرشید کے عہد حکومت میں مکہ و مدینہ کے متولی و قاضی تھے۔ ۲۰۴ھ اور ۲۰۶ھ میں امیر حج مقرر ہوئے۔ اور مامون کے عہد ہی میں بغداد میں وفات پائی۔[1] عبیداللہ کے دو بیٹے حسن اور علی تھے علی کے بیٹے حسین، حسین کے بیٹے داؤد اور داؤد کے بیٹے ہارون تھے۔ علی بن عبیداللہ کی جو اولاد "دمیاط"

[1] تاریخ بغداد ص: ۳۱۳، ج: ۹

میں آباد ہوئی وہ بنو ہارون کہلائی اور جو مقام "فسا" میں آباد ہوئی وہ بنو بدبد کہلائی۔ حسن بن عبیداللہ کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا جن کے گیارہ بیٹے تھے ان میں ایک بیٹے کا نام قاسم تھا جو حضرت امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں شمار ہوتے تھے اور صاحب شان و منزلت تھے یہ مدینہ میں آباد تھے ان کے فرزندان میں علی و جعفر تھے۔

۲) عباس : یہ خطیب فصیح، شاعر بلیغ، صاف گو اور جری تھے۔ مدینہ میں آباد تھے ہارون رشید کے عہد میں بغداد آئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ یہ ہارون رشید اور مامون رشید کے اصحاب میں تھے۔ بعض نے ان کے دس فرزند بتائے ہیں جبکہ بعض نے چار بیٹے احمد، عبیداللہ، علی اور عبداللہ بیان کئے ہیں ان میں عبداللہ بن عباس جن کی والدہ کا نام الفطیسہ تھا شاعر و ادیب تھے مامون کے مصاحب تھے جب ان کا انتقال ہوا تو مامون نے پاپیادہ جنازے میں شرکت کی اور سردار ابن سردار کا لقب دیا۔ عبداللہ بن عباس کے ایک بیٹے کا نام حمزہ تھا۔ حمزہ کے ایک بیٹے ابوطیب محمد تھے جو اپنی مروت وصلہ رحمی اور فضل کثیر کے باعث عظمت و منزلت رکھتے تھے۔ اردن کے علاقہ طبریہ میں ان کی بہت زیادہ جائیداد تھی۔ طغج بن جف خرغانی نے ماہ صفر ۲۹۱ھ میں اپنے کارندوں کے ذریعہ انہیں قتل کرا دیا۔ شعراء نے انکے مرثیے کہے۔ ابوطیب محمد کے ایک بیٹے کا نام ابو شہد تھا جو شاعر تھے یہ متوکل کے بعد تک زندہ رہے۔ الغدیر میں علامہ امینی نے شعرائے غدیر میں انکا تذکرہ کیا ہے۔

۳) حمزۃ الاکبر : مامون نے انہیں ایک ہزار درہم عطا کئے کیونکہ یہ حضرت علیؑ سے مشابہ تھے۔ شیخ عباس قمی کے بیان کے مطابق حمزہ کے بیٹے محمد تھے اور ان کے بیٹے علی تھے جو آئمہ سے حدیث روایت کرتے تھے ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی حمزہ کے دوسرے بیٹے قاسم تھے جن کی کنیت ابو محمد تھی یہ یمن

میں آباد تھے اور صوفی مشہور تھے۔[۱] بعض مورخین نے حمزۃ الاکبر اور ان کے پسران محمد اور قاسم کے درمیان ایک نام علی کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے اور بصرہ میں سکونت پذیر تھے یہ حضرت امام رضا و دیگر آئمہ سے روایت کرتے تھے۔ بقول عمدۃ الطالب ۲۸۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ قاسم بن علی بن حمزۃ الاکبر جن کی کنیت ابو محمد تھی یمن کی عظیم القدر اور صاحب جمال شخصیت تھے اور صوفی مشہور تھے۔ قاسم کے ایک بیٹے ابو یعلی حمزۃ ثقہ و جلیل القدر تھے ان کے متعلق شیخ نجاشی نے نجم الثاقب میں بیان کیا ہے کہ غیبت کبریٰ میں حضرت امام صاحب العصر عجل اللہ فرجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ عباس قمی نے بھی ان کی بابت تفصیل سے بیان کیا ہے۔[۲]

۴) ابراہیم جروقہ : ابراہیم کی شہرت جروقہ سے ہے یہ اپنے وقت کے زاہد، فقیہہ اور ادیب تھے ان کے تین بیٹے حسن، محمد اور علی تھے۔ ان میں علی اپنے زمانہ کے فیاض اور صاحب جاہ و حشمت و جلال تھے ان کی وفات ۲۶۴ھ میں ہوئی۔ ان کے انیس (۱۹) فرزند تھے ان میں ایک عبداللہ بن علی تھے ان کی کنیت ابو علی تھی جو بغداد گئے اور خطیب بغداد کہلائے پھر بغداد سے مصر چلے گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ آپ کی چند کتابیں تھیں جن کے مجموعہ کو "جعفریہ" کہتے تھے یہ مجموعہ شیعہ فقہ پر مشتمل ہے۔ شیخ رضی الدین علی اور زبیر بن بکار نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن علی عالم و فاضل اور جواد تھے۔ ان کی وفات مصر میں ۳۱۲ھ میں ہوئی۔ علی بن ابراہیم جروقہ کے دوسرے بیٹے یحییٰ تھے جن کے ایک فرزند کا نام علی تھا علی کی کنیت ابوالحسن تھی یہ بغداد میں ابی عبداللہ داعی کی جگہ پر نقیب علوئین قرار پائے۔

[۱] منتہی الامال ص: ۲۳۲ ج: ۱ [۲] ایضاً ص: ۲۳۳ ج: ۱

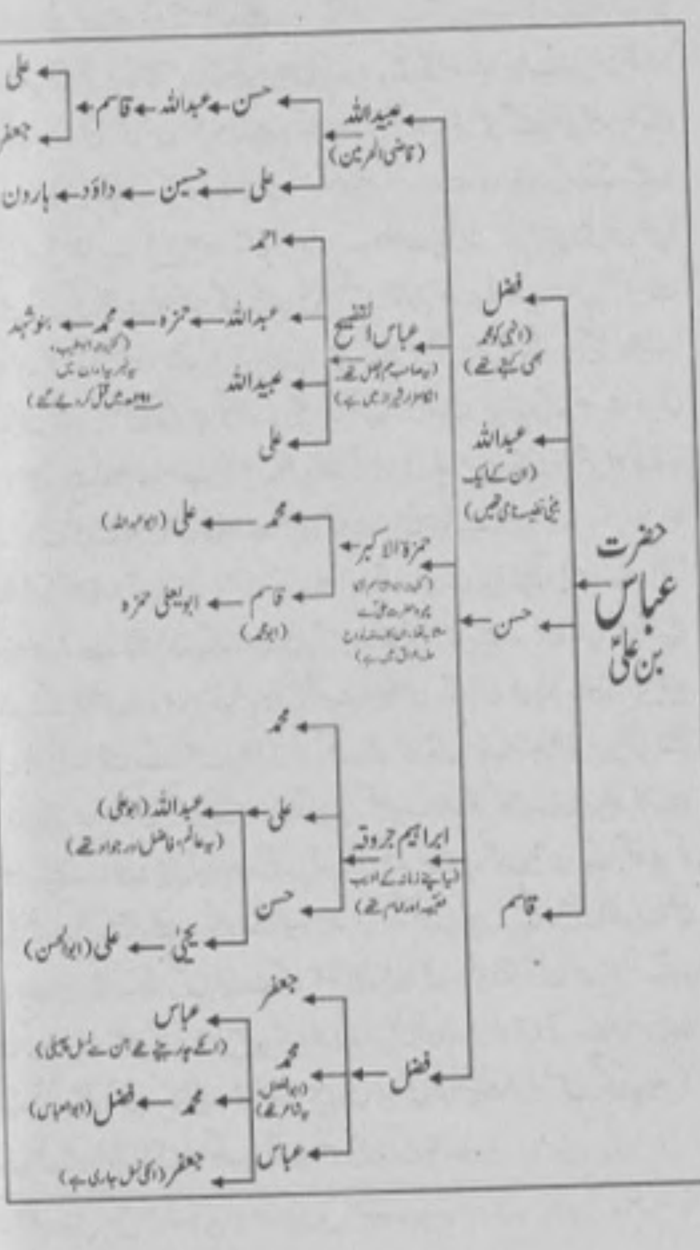

۵) فضل : یہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ فصیح، متکلم، حاضر جواب، باتقوی اور شجاع تھے۔ حکمرانوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اور ابن الہاشمیہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان کے تین بیٹے جعفر، عباس اکبر اور محمد تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اولادیں تھیں جو تم طبرستان میں پھیلی ہوئی تھیں اور جو اپنے اپنے وقت کی ادیب و شاعر تھیں۔ محمد بن فضل کے ایک بیٹے کا نام بھی فضل اور کنیت ابوالعباس تھی وہ پائے کے شاعر و سخن ور تھے۔

عمر اطرف

نام و کنیت: حضرت علیؑ کے ایک فرزند کا نام عمر تھا بعض نے انہیں عمران بھی لکھا ہے۔ شیخ عباس قمی نے ان کی کنیت ابو القاسم تحریر کی ہے۔ ان کا مشہور ترین لقب اطرف ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک ہی وقت میں دو عمر بن علی تھے یعنی ایک عمر بن علیؑ بن ابیطالب اور دوسرے عمر بن علیؑ بن حسینؑ (علی زین العابدینؑ) لہٰذا دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کو عمر اطرف اور دوسرے کو عمر اشرف کہا جانے لگا۔ چونکہ عمر بن علی زین العابدینؑ کی شرافت و کرامت حضرت علیؑ و فاطمہ زہراؑ دونوں کی جانب سے تھی لہٰذا وہ عمر اشرف کہلائے۔ یہ عمر اشرف حضرت زید شہید کے حقیقی بھائی تھے اور چونکہ عمر بن حضرت علیؑ ابن ابیطالب کو یک طرفہ یعنی صرف حضرت علیؑ کی طرف سے انتساب تھا لہٰذا وہ عمر اطرف مشہور ہوئے۔ ان کی بابت شیخ عباس قمی کا بیان ہے کہ

> "وچوں شرافتش از یک طرف است اورا اطرف گویند کما عمرو بن علی بن الحسین چون شرافتش از دو طرف است اورا عمر اشرف گویند مادرش صہباء ثعلبیہ است و ان ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ بن یحییٰ است از بنی یمامہ و بقول از بنی خالد بن ولید است از عین التمر کہ امیر المومنین (ع) آنرا خرید و عمر با رقیہ خواہرش توام بدنیا آمدند و او آخرین اولاد امیر المومنین (ع) است کہ بدنیا آمد و او صاحب لسان بود و دارای فصاحت و جود و عفت بود۔
> (منتہی الامال ص: ۲۳۶ ج: ۱)

عمر اطرف اور رقیہ دونوں جڑواں پیدا ہوئے اور ان کی ماں ام حبیب صہبا بنت ربیعہ ثعلبیہ تھیں۔ بعض حضرات جیسے ابن شہاب عکبری، ابو الحسن العشانی، ابن جراح وغیرہ نے عمر اطرف کو حضرت عباس بن علی سے بڑا مانا ہے لیکن شیخ عباس قمی کے مذکورہ بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف حضرت عباس سے بلکہ حضرت علیؑ کے جملہ فرزندان سے چھوٹے تھے کیوں کہ وہ امیر المومنین کی آخری اولاد تھے۔ نیز ابن داؤدی کا بھی یہی قول ہے کہ "عمر اطرف حضرت علیؑ کے آخری فرزند تھے"۔[1]

ایک اعتراض: بعض حضرات نے عمر اطرف کو واقعہ کربلا میں شریک اور شہدائے کربلا میں ان کا ذکر کیا ہے جو تاریخی واقعات کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ابن طاؤس کا بیان ہے کہ عمر اطرف نے حضرت امام حسینؑ کو یزید کی بیعت کر لینے کا مشورہ دیا تھا جس کے جواب میں امام عالی مقام نے فرمایا تھا کہ "تم سمجھتے ہو کہ جس کو تم جانتے ہو اس کو میں نہیں جانتا۔ خدا کی قسم اپنے کو ذلت و رسوائی کے حوالے نہیں کر سکتا ہوں"۔

ابو حنیفہ الدینوری نے جناب مختار اور مصعب بن زبیر کے درمیان ہونے والی جنگ میں عمر اطرف کو مصعب کا طرفدار بتایا اور اسی جنگ میں ان کے مارے جانے کو ثابت کیا ہے۔[2] جب کہ یافعی نے طرفداران مختار میں شمار کرتے ہوئے ان کے مقتولین میں قرار دیا ہے۔[3]

حقیقت یہ ہے کہ عمر اطرف شہادت حسینؑ کے بعد بھی حیات تھے۔ بعض مورخین نے انکی بابت تحریر کیا ہے کہ اوقاف امیر المومنینؑ کی تولیت کیلئے کوشاں رہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ عمر اطرف نے حضرت زین العابدینؑ سے تولیت کی بابت تنازعہ کیا کسی نے تحریر کیا کہ حسن مثنیٰ سے اس

[1] عمدة الطالب ص: ۳۵۰، [2] الاخبار الطوال ص: ۲۹۷، [3] مرآة الجنان ص: ۱۴۳ ج: ۱

معاملہ میں اختلاف کیا اور اس مسئلہ میں عبدالملک اموی حاکم وقت سے رجوع کیا۔ یہ سب ایسی موضوعہ روایات ہیں جو امویوں کی خوشنودی کیلئے مشتہر کی گئیں جنکا مقصد بنی ہاشم میں اختلاف ظاہر کر کے انکو بدنام کرنا تھا۔

بنی ہاشم کی تحقیر و تذلیل کی غرض سے بیان کردہ موضوعہ روایات کو ہمارے لکھنے والے بھی بلا کسی تحقیق و جستجو کے نقل کرتے رہتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بیانات سے نہ صرف یہ کہ بنی ہاشم کے افراد کی باہمی چپقلش کے شواہد فراہم ہوتے ہیں بلکہ حضرات آئمہ طاہرین علیہ السلام کی مخالفت کا جواز بھی میسر آتا ہے۔ لہٰذا ہمارے لکھنے والوں کو چاہئے کہ بنو ہاشم سے متعلق اس قسم کے بیانات کا حالات و واقعات سے مکمل طور پر جائزہ لیں۔ اور ان مخالفانہ بیانات کا ٹھوس ثبوت نہ ہو تو ان بیانات کو نقل کرنے سے گریز کریں اور صحیح صورتحال کو واضح کریں۔ چونکہ حضرت امام جعفر الصادقؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ

> "ترجمہ: ہمارے گھرانے کے افراد اس وقت تک دنیا سے نہیں جاتے جب تک اپنے وقت کے امام کی امامت کا اقرار نہ کر لیں خواہ آخری وقت ہی کیوں نہ ہو"

امام صادقؑ کا یہ قول صادق اس امر کی واضح دلیل ہے کہ امام زادوں نے اگر کبھی اپنے زمانہ کے امام کی مخالفت کی بھی تو اس وقت تک دنیا سے رخصت نہیں ہوں گے جب تک اپنے اعمال کی توبہ نہ کر لیں۔ اور بلاشبہ آیات قرآنی و احادیث نبوی کی روشنی میں توبہ گناہوں کا کفارہ ہے۔ لہٰذا افراد بنی ہاشم کے خلاف پھیلائی جانے والی غیر یقینی حدیثوں کی بنیاد پر خاندان رسالتؐ کے بعض افراد کی توہین کرنا یا ان سے نفرت کا برتاؤ کرنا شیوہ اہلبیت کے قطعی خلاف ہے۔

وفات: عمر اطرف کی وفات کب ہوئی اس کی بابت بھی مورخین کے اختلافی بیانات ملتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمانہ عبدالملک بن مروان یا ولید بن عبدالملک میں پچھتر یا اٹھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس ضمن میں شیخ عباس قمی تحریر کرتے ہیں کہ

> "حجاج خواست عمر را با حسن بن حسنؑ شریک سازد در صدقات امیر المومنین (ع) و میسر نشد، وفات کرد عمر در ینبع بسن ہفتاد و ہفت یا ہفتاد و پنج۔" (منتہی الامال ص: ۲۳۶ ج: ۱)

اولاد: عمر اطرف کے ایک بیٹے محمد سے آپ کی نسل کثیر پھیلی جن میں بہت سے عالم، فقیہ، محدث، جلیل القدر اور صاحب کرامت بزرگ ہوئے۔ محمد بن عمر اطرف کے چار فرزند عبداللہ، عبیداللہ، عمر اور جعفر تھے۔ ان سے تین فرزندان عبداللہ، عبیداللہ اور عمر کی ماں خدیجہ بنت حضرت امام علی زین العابدینؑ تھیں جبکہ چوتھے بیٹے جعفر ام ولد کے بطن سے تھے۔

عبداللہ: عبداللہ بن محمد بن عمر اطرف کے بھی چار بیٹے احمد، محمد، عیسیٰ المبارک اور یحییٰ الصالح تھے۔ ان میں سے احمد کے دو بیٹے ابو یعلیٰ حمزہ اور عبد الرحمٰن تھے ان عبد الرحمٰن بن احمد نے یمن میں خروج کیا۔ محمد بن عبداللہ کے ایک بیٹے قاسم تھے اور ان کے ایک بیٹے محمد تھے جنھوں نے طبرستان میں اپنی سلطنت قائم کی جس کا نام "ملک جلیل" رکھا۔ اور ان کی نسل میں ابو عبداللہ جعفر بن ملک ملتانی تھے جنھوں نے ملتان میں سلطنت قائم کی۔ ان کی اولاد کثیر تھی جو ملوک، امراء، علماء اور نساب تھی۔ ان میں سے بہت سے اسماعیلیہ ہو گئے اور ہندی میں تکلم کرنے لگے۔ جعفر ملک ملتانی کی اولاد میں ابو یعقوب اسحاق بن جعفر ملتانی کا شمار علماء و فضلاء میں کیا جاتا تھا۔ ان کے ایک بیٹے احمد درجہ جلالت پر فائز تھے اور مملکت فارس میں آباد تھے۔ احمد

بن اسحاق کے بیٹے ابوالحسن علی ماہر انساب تھے۔ عضد الدولہ نے ان کو نقیب الطالبین قرار دیا۔

عیسیٰ المبارک بن عبداللہ بن محمد بن عمر اطرف سیادت و شرافت میں مشہور اور راوئی حدیث تھے۔ ان کی اولاد میں ابو طاہر احمد فقیہ 'نساب' محدث اور شیخ اہلبیت اور صاحب علم و زہد اور وجیہ بزرگ گذرے ہیں۔ ان کی نسل میں ایک بزرگ ابوالحسن علی بن یحییٰ بن محمد بن عیسیٰ بن ابو طاہر احمد تھے جو نقیب ابوالحسن علی کے لقب سے مشہور تھے۔ عیسیٰ المبارک کے ایک بیٹے احمد کو ابوالفرج اصفہانی نے عباسی حکمران المقتدر کے دور میں مقتول قرار دیا ہے۔[1]

یحییٰ الصالح بن عبداللہ بن محمد بن عمر اطراف جن کی کنیت ابوالحسین رشید تھی ان کو قید کر کے قتل کر دیا گیا۔ ان کے دو بیٹے ابو علی محمد صوفی اور ابو علی تھے یہ ابو علی مامون عباسی کی قید میں رہے جہاں انہوں نے شدید مصائب برداشت کئے۔ ان کی اولاد میں ایک حسن تھے یہ جد اعلیٰ تھے ہو مراقد کے جو کلی طور پر نیل اور حلہ میں آباد رہے۔ ابو علی محمد صوفی کی نسل میں شیخ ابوالحسن علی بن ابی الغنائم محمد بن علی بن محمد ملقطہ بن علی الضریر بن محمد صوفی تھے جو اپنے زمانہ کے ماہر نسب تھے اور ان کا قول حجت ہوتا تھا انکے والد ابی الغنائم محمد بھی نساب تھے۔ انہوں نے متعدد کتب تصانیف کیں۔ پہلے یہ بصرہ میں سکونت پذیر تھے لیکن بعد میں ۴۲۳ھ میں موصل منتقل ہو گئے۔

عبیداللہ : عبیداللہ بن محمد بن عمر اطرف کے ایک بیٹے کا نام طیب تھا اور طیب کے ایک بیٹے علی تھے۔ ان کی نسل بنو طیب کہلائی۔ طیب کے دوسرے بیٹے احمد تھے اور ان کے بیٹے ابو احمد محمد تھے۔ عبیداللہ بن محمد بن عمر اطرف کی

---

[1] مقاتل الطالبین ص: ۴۵۷

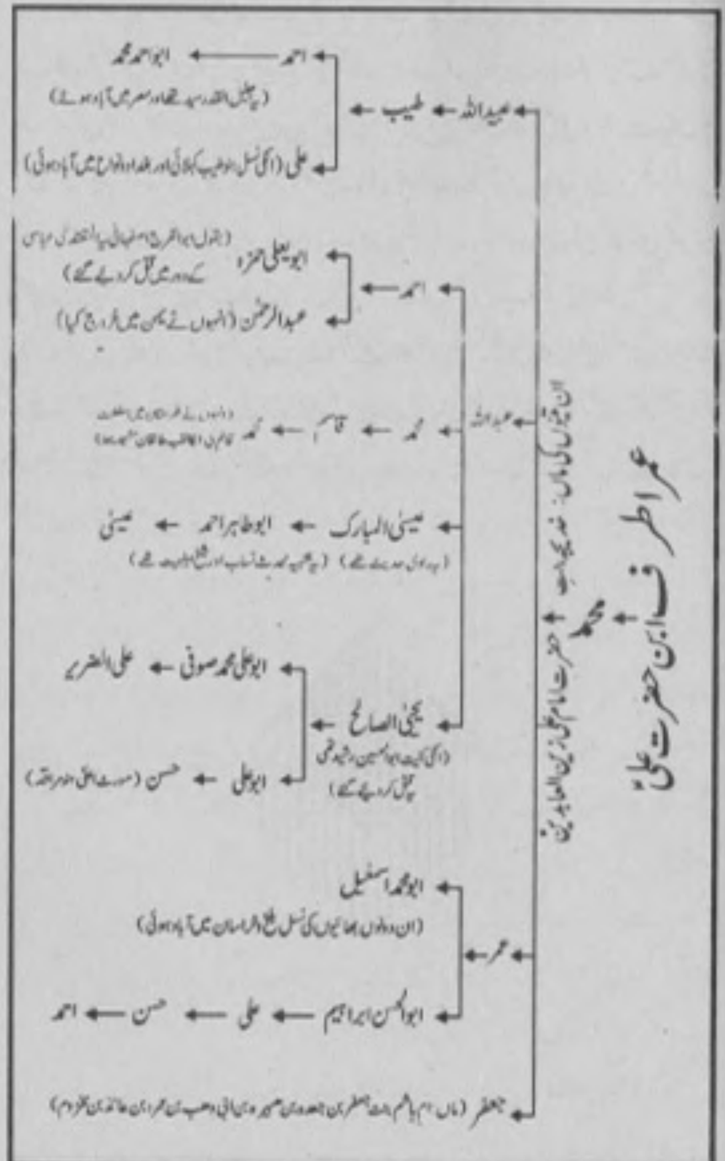

بابت صاحب عمدۃ الطالب نے تحریر کیا ہے کہ ان کی قبر النذور (بغداد) میں ہے اور انہیں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ جب کہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور حموی نے معجم نے محمد بن موسیٰ بن حماد بربری کی روایت بیان کی ہے کہ عبیداللہ بن محمد بن عمر اطرف کی قبر النذرہ نہیں بلکہ ان کی قبر نواح کوفہ میں ناحیہ کے مقام پر ہے اور صاحب قبر النذرہ عبیداللہ بن محمد بن عمر بن علی بن حسین بن ابیطالب ہیں۔

عمر بن محمد بن عمر اطرف کے دو بیٹے ابو المحمد اسمٰعیل اور ابی الحسن ابراہیم تھے۔ ابراہیم کے پڑپوتے احمد بن حسن بن علی بن ابی الحسن ابراہیم تھے جن کو ابوالفراج اصفہانی نے المقتدر عباسی کے دور حکومت میں قتل کئے جانے والے طالبین میں شمار کیا ہے۔[1]

---

[1] مقاتل الطالبین ص: ۴۵۳

حضرت زینب بنت علیؑ

نام کنیت والقاب : آپ کا اسم گرامی زینب اور کنیت ام الحسن ہے واقعہ کربلا کے بعد آپ کی کنیت ام المصائب مشہور ہوئی۔ آپ کے القاب بہت ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ فہیمہ' فاضلہ' کاملہ' عاقلہ' زاہدہ' عابدہ' محدثہ' مظلومہ' مرضیہ' فصیحہ' بلیغہ' باکیہ' نائبۃ الزہرا' عالمہ غیر معلّمہ' راضیہ بالقدر والقضا وغیرہ۔

ولادت : جناب زینب کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی یہ متفق علیہ ہے لیکن تاریخ ولادت میں مورخین مختلف الرائے ہیں مثلاً مرزا عباس قلی خان نے "طراز المذہب" میں ۹ھ تحریر کی ہے۔ سید نورالدین نے "خصائص زینبیہ" میں ۵/ جمادی الاول ۵ھ یا ۶ھ رقم کی ہے۔ الحاج محمد علی صاحب نے شعبان ۶ھ بتائی ہے۔ مصنف "بحر المصائب" نے پہلی یا اوائل شعبان ۶ھ مقرر کی ہے۔ جب کہ بعض مورخین نے جناب سیدہ سے روایت نقل کی ہے کہ "بی بی زینب ۵/ جمادی الاول ۵ھ کو پیدا ہوئی تھیں" اور یہی قرین قیاس ہے۔[1] جناب زینب حضرت امام حسینؑ سے تقریباً دو سال چھوٹی تھیں۔

تعلیم و تربیت : آپ کی تربیت حضرت فاطمہ زہرا نے فرمائی۔ اور بقول جناب رازق الخیری :

---

[1] سیدۃ جناب زینب ص: ۱۶ مطبوعہ دکن

"ایثار اور قربانی' فراست اور دانشمندی' استقامت واستقلال' صداقت اور جرات' تواضع اور مہمان نوازی' زہدو تقویٰ' عبادت وریاضت' خلق وکرم' سادگی وپاکیزگی ان تمام صفات کا بی بی زینب میں جمع ہو جانا نہ صرف اثر تھا انکے بزرگوں کے خون کا جوان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا بلکہ فیض تھا اس ماحول اور صحبت کا جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور بچپن گذارا۔ پھر سونے پر سہاگہ اس محترم اور مقدس ماں کی تربیت تھی جس نے غیروں تک کو جانوروں سے انسان' پیتل سے سونا اور پتھر سے ہیرا بنا دیا۔"

(سیدہ کی بیٹی حوالہ سیرۃ زینب سلام اللہ علیہا ص :۱۹)

جب جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے رحلت فرمائی اس وقت جناب زینب چھ یا سات سال کی تھیں۔ کم سنی میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد جب امیر المومنین حضرت علیؑ نے جناب ام البنین سے عقد فرمایا تو ان معظمہ نے اولاد فاطمہؑ کی تربیت وخدمت کو اپنا اولین فریضہ سمجھا۔ یہ معظمہ صالح' دیندار' رحمدل اور سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ انہوں نے جناب زینب کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور انتہائی شفقت ومحبت اور ذمہ داری سے اس فریضہ کو انجام دیا۔ اس کے علاوہ جناب امیر المومنین کی تعلیم کے نتیجہ میں جناب زینب نے علوم قرآن وتفسیر' ادب وعلم' کلام وبیان پر عبور حاصل کیا۔

عقد: جناب زینب کا عقد جناب عبداللہ بن جعفر طیار بن ابیطالب سے ہوا جو آپ کے چچا کے بیٹے تھے۔ آپ کا نکاح حضرت علیؑ نے خود پڑھایا۔ مہر وجہیز کی بابت مورخین نے اپنے اپنے قیاس وخیال کے مطابق اندازے لگائے ہیں لیکن صحیح صورتحال سے شاید ہی کوئی آگاہ ہو۔

اولاد: جناب زینب کے چار بیٹے علی (جو علی زینبی کہلاتے تھے)' عون' محمد اور عباس تھے اور ایک بیٹی ام کلثوم تھیں۔ ابن قطیبہ نے جعفر بن عبداللہ کو بھی جناب زینب کا فرزند بتایا ہے درآنحالیکہ جعفر بن عبداللہ کی ماں ام عمرو بنت خراش بن بغیض تھیں۔ جناب زینب کے دو بیٹے محمد اور عون کربلا میں شہید ہوئے ان میں عون چھوٹے تھے اور وقت شہادت نو یا دس سال کے ہوں گے۔ عام طور سے مورخین نے فرزندان عبداللہ جو کربلا میں شہید ہوئے ان کی بابت اختلاف کیا ہے لیکن صحیح تر یہی ہے کہ محمد اور عون پسران عبداللہ بن جعفر کربلا میں شہید ہوئے۔

فضائل ومراتب: جناب زینب کے فضائل کثیر ہیں جن کے تفصیلی بیان کی یہاں گنجائش نہیں مختصرا ہم اتنا ضرور تحریر کریں گے کہ فضائل وخصائل میں جناب زینب اپنی مادر گرامی قدر حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی صحیح معنوں میں وارث وجانشین تھیں۔ جناب زینب کے فضائل وخصائل' حلم وعلم' فہم وفراست' قوت نفس وصداقت ایمان' کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ وقت کے امام حضرت علی زین العابدین علیہ السلام نے آپ کو عالمہ غیر معلمہ' فہیمہ' عارفہ' زاہدہ' کاملہ وغیرہ جیسے القابات سے ملقب فرمایا ہے۔

جہاں تک جناب زینب کے مراتب کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جب قافلہ حسینی مدینہ سے روانگی کیلئے تیار تھا مخدرات عصمت وطہارت کیلئے چالیس محملیں آراستہ تھیں اور جوانان بنی ہاشم اپنے محارم کو سوار کرا چکے تو آخر میں جناب زینب وام کلثوم کو حضرت امام حسینؑ اور حضرت ابو الفضل العباس نے نہایت عزت واحترام سے سوار کرایا۔ اس واقعہ کو میر انیس نے بہت خوب انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ع

پہنچی جو نہی ناقے کے قریں دختر حیدر خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبرؐ
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشہ چادر تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمربستہ چپ وراست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

جناب زینب کربلا میں: اپنے بھائی حسینؑ سے جناب زینبؑ کی رفاقت ومحبت کا کیا کہنا گو کہ روانگی مدینہ سے قبل جناب زینب کو ان واقعات ومصائب کا یقینا پورا علم تھا جو بعد میں پیش آنے والے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے بھائی کا ساتھ چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب زینب کو اپنے بھائی سے کس قدر محبت تھی۔ آپ نے طویل سفر کی تکلیف اور کربلا وشام میں پیش آنے والے مصائب وآلام کا برداشت کرنا منظور کیا لیکن فرقت کی تلخی گوارہ نہ فرمائی۔ نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو الٰہی مشن حضرت امام حسینؑ کے سپرد کیا گیا تھا اس کی تکمیل آپ کی شرکت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ کفر یزید کا قلع قمع کرنے کیلئے اگر حضرت امام حسینؑ نے جہاد بالسیف کیا تو جناب زینب نے جہاد باللسان سے یہ فریضہ انجام دیا۔

جب یوم عاشورہ گلشن فاطمہ زہراؑ کو یزیدی لشکر تاراج کر چکا' اصحاب حسینؑ اور افراد بنی ہاشم تین شب وروز کے بھوکے پیاسے شہید کردیئے گئے اور جگر گوشہ علی وبتول کا سر اقدس تن مطہر سے جدا اور خیموں کو نذر آتش کردیا گیا تو ستم رسیدہ بیبیاں اور مصیبت زدہ یتیم بچے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور وہ بچے جو کچھ دیر پہلے العطش العطش کی صدائیں بلند کررہے تھے اب دشمنوں کے خوف سے دم بخود زمین پر پڑے تھے۔ شام غریباں آئی کربلا والوں کے لئے قیامت کی رات آئی۔ اس بھیانک رات میں رسولؐ کی نواسی اور علی کی بیٹی زینب ہاتھ

میں ایک ٹوٹا ہوا نیزہ لئے اس لٹے ہوئے قافلے کی حفاظت کررہی تھیں۔ کبھی بیبیوں کو صبر کی تلقین کرتیں کبھی خوفزدہ بچوں کی ڈھارس بندھاتیں اور کبھی بھتیجے کی تیمارداری فرماتیں۔ حسینؑ کے بعد خواہر حسینؑ پر بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی۔

جناب زینب کوفہ میں: غم زدہ وپریشان حال اہلبیت رسول کو عمر سعد لعین کے حکم سے ۱۱ر محرم ۶۱ھ زوال آفتاب کے بعد کوفہ کی جانب روانہ کیا گیا۔[۱] جب یہ قافلہ شہر کوفہ کے قریب پہنچا تو یزیدیوں نے اس کی ترتیب اس طرح دی کہ سب سے آگے شہدائے کربلا کے سر نیزوں پر بلند کئے ان کے بعد لاغر وبیمار امام علی زین العابدینؑ جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں' پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق پڑا ہوا تھا اونٹوں کی مہار تھامے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے ان کے پیچھے بے کجاوا اونٹوں کی قطار جن پر گرد وغبار میں اٹے ہوئے کچھ پریشان حال بچے اور سر برہنہ خواتین بالوں سے اپنے چہرے چھپائے سوار تھیں جب یہ قافلہ شہر کوفہ میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر تماشائیوں کی حالت غیر ہوگئی اور بجائے خوش ہونے کے وہ افسردہ ہوگئے۔ قافلہ کو بازار کوفہ میں گھمایا گیا۔ اس موقع پر حضرت علی زین العابدینؑ' فاطمہ بنت حسینؑ اور زینب بنت علیؑ نے فلسفۂ شہادت حسینؑ بیان کرنے کیلئے حقائق ومعارف سے لبریز خطبات ارشاد فرمائے جن کو سن کر اہل کوفہ شرمندگی وندامت کی حالت میں منہ چھپا چھپا کر زار وقطار رونے لگے۔

حافظ نے اپنی کتاب "البیان" میں خزیمہ الاسدی کی روایت بیان کی ہے اور علامہ مجلسی نے باسناد خود از شیخ مفید سے روایت کی کہ اسیران

[۱] لہوف ص: ۵۴

اہلبیت کا قافلہ بازار کوفہ میں پہنچا اور زنان کوفہ نے اہل حرم کو شتران بے کجاوا پر دیکھا تو اکثر عورتیں چاک گریباں پاپیادہ گھروں سے نکل آئیں اور گریہ وبکا کرنے لگیں۔ جناب زینبؑ نے جب زنان کوفہ اور ان کے مردوں کا رونا پیٹنا دیکھا تو اہل کوفہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا "یاقوم واللہ نحن عترۃ رسول اللہ فاکرموا الاجل رسول اللہ" یعنی (اے اہل کوفہ کے مردوزن ہم تو آل رسول ہیں ہمارا اکرام واحترام سب پر واجب ہے) آپ نے یہ کلمات کچھ اس انداز وہیبت سے فرمائے کہ تمام شوروغل ختم ہوگیا اور لوگ متوجہ ہوگئے۔ اس کے بعد جناب زینبؑ نے ایک فصیح وبلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔

خطبہ جناب زینبؑ :

الحمد للہ والصلوۃ علی ابی محمد والہ الطیبین الاخیار امابعد یا اھل الختل والغدروالخذل والمکر اتبکون فلارقات الدمعۃ ولاھدات الزفرۃ. فانما مثلکم کمثل التی نقضت غزلھامن بعد قوۃ انکاثا. تتخذون ایمانکم دخلابینکم الاوھل فیکم الاالصلف والنطف والصدر الشنف والکذب والملق الاماء وغمرالاعداء والمرعٰی علیٰ دمنۃ اوکفضۃ علیٰ ملحودالاساء ماقد مت لکم انفسکم. ان سخط اللہ علیکم وفی العذاب انتم خالدون. اتبکون وتنتحبون اخی اجل واللہ فابکوا فانکم احریاء بالبکاء. فابکوا کثیراواضحکوا قلیلا فقد بلیتم بعارھاومنیتم بشنارھاولن ترحضوھابغل بعد ھاابدا. وانی ترحضون قتل سلیل خاتم النبوۃ ومعدن الرسالۃ وسیدشباب اھل الجنۃ وملاذحربکم و معاذحزبکم ومقرسلمکم واساس کلمتکم ومفزع نازلتکم ومنار حجتکم ومددۃ سنتکم والمرجع عند مقالتکم الاساء ماقد متکم لانفسکم وساء ماتذرون لیوم بعثکم

وبعدالکم وسحقاوتعساو نکساً لقدخاب السعیٰ وتبت الایدی وحسرت الصفقہ فبوتم بغضب من اللہ وضربت علیکم الزلۃ والمسکنۃ ویلکم اھل الکوفہ اتدرون ای کبدکمحمد فریتم وای عھد نکثتم وای کریمۃ لہ ابرزتم وای دوسفکتم وای حرمۃ ھتکتم لقد جئتم شیا ادا تکادالسمٰوات یتفطرون منہ وتنشق الارض وتخرالجبال ھدًا. لقد جئتم بھا شوھاء خرقاء صلعاء عنقاء فقماء کطلاع الارض وملاء السماء . افعجبتم ان مطرت السماء دماء ولعذاب الاٰخرۃ اخزی وھم لا ینصرون فلایستخفنکم المھل فانہ عزوجل لا یحفزہ البدار ولایخاف علیہ فوت الثاروان ربکم لبا المرصاد.

ترجمہ : تعریف ہے خدا کیلئے اور درود میرے باپ محمدؐ اور ان کی آل پر جو پاک وطیب اور اخیار ہیں۔ امابعد اے اہلِ کوفہ' اے دھوکے باز' اے اہلِ غدر ومکر۔ اے اہل خذل تم اب روتے ہو؟ خدا تمہارے آنسو خشک نہ کرے اور تمہارے سینے آتش غم واندوہ سے ہمیشہ جلتے رہیں۔ تمہاری مثال اس عورت کی طرح ہے جس نے بڑی محنت ومشقت سے مضبوط ڈوری بانٹی اور پھر اس کو خود کھول دیا اور اپنی کی ہوئی محنت کو ضائع اور رائیگاں کیا۔ تم ایسی جھوٹی قسمیں کھاتے ہو جن میں صدق وسچائی کا مطلق دخل نہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تمہارے پاس سوائے یاوہ گوئی' جھوٹی شیخی' فسق وفجور' بغض وکینہ' کذب وچاپلوسی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ آگاہ ہو کہ تمہاری حالت لونڈیوں اور زرخرید کنیزوں جیسی ہے جو ذلیل ترین ہوتی ہیں۔ تمہارے دلوں میں عداوت وکینہ بھرا ہوا ہے۔ تمہاری کیفیت مثل اس سبزی کے ہے جو غلیظ وکثیف زمین میں اگتی ہے اور سرسبز ہوتی ہے یا اس گچ کی ہے جو قبروں پر لگائی جاتی ہے۔ آگاہ ہو کہ تم نے بڑے ہی بُرے اعمال کا اقدام کیا ہے اور اپنی آخرت سخت کیلئے

ناپسندیدہ توشہ تیار کرلیا۔ جس کی وجہ سے خداوند متعال تم سے سخت ناراض ہوا اور تم پر اس کا عذاب وارد ہوگا۔ اب تم میرے بھائی کیلئے روتے اور گریہ وزاری کی آوازیں بلند کرتے ہو؟ ہاں! خدا کی قسم روؤ اس لیے کہ تم سزاوار رونے کے ہو۔ ہاں' خوب روؤ اور کم ہنسو! اس لیے کہ تم امام زمان کے قتل کے ننگ وعار میں مبتلا ہو چکے ہو۔ انکے خون ناحق کا دھبہ تمہارے دامنوں پر لگ چکا ہے جس کو اب تم دھو نہیں سکتے اور سلیل خاتم النبوۃ' معدن الرسالہ اور سید شباب اہل الجنۃ کے قتل کے الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ تم نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا ہے جو تمہارا پشت وپناہ تھا' جو تمہاری گفتار وکلام کا اساسہ تھا' جو تمہاری مصیبت میں تمہارا پشت وپناہ' تمہاری حجت کا منارہ' تمہاری سنت کا عالم اور تمہاری قول کا مرجع تھا۔ آگاہ ہو کہ اس دنیا میں بہت ہی بُرے کام کے تم مرتکب ہوئے ہو اور کیا ہی بُرا توشہ روز قیامت کیلئے تم نے تیار کرلیا۔ لعنت ہو تم پر اور ہلاکت وبربادی ہو تمہارے لیے۔ تمہاری کوششیں ناکام رہیں اور تم ہلاک ہوگئے۔ تمہاری تجارت گھاٹے میں رہی۔ تم مغضوبِ الٰہی ہوگئے اور ذلت وخواری میں مبتلا ہوگئے۔ وائے ہو تم پر اے اہلِ کوفہ' کیا تم جانتے ہو کہ تم نے محمدؐ مصطفےٰ کے جگر کے کس ٹکڑے کو کاٹا اور کون سا عہد وپیمان توڑا؟ کس کا خون تم نے بہایا؟ کس کی ہتک حرمت تم نے کی ہے؟ تحقیق کہ تم نے ایسے فعل بد' حماقت' کار شنیع' سرکشی وناسپاسی کی ذمہ داری لے لی۔ ان سب امور کے واقع ہو جانے کے بعد اگر آسمان سے خون برسے تو کیا تم کو تعجب ہوتا ہے؟ ہاں یاد رکھو کہ آخرت کا عذاب بہت سخت ہوگا' اس وقت تمہاری کوئی مدد اور نصرت کرنے والا نہ ہوگا۔ خدا نے جو تم کو تھوڑی مہلت دی ہے اس کو حقیر وذلیل نہ سمجھو اور اس سے مطمئن نہ ہو جاؤ اس لئے کہ خدا کو جلدی سے کام نہ لینا عاجز نہیں کرتا اور وہ انتقام کا وقت گذر جانے کا اندیشہ نہیں رکھتا۔ تمہارا خدا تمہاری

گھات میں لگا ہوا ہے۔ (مظلومہ کربلا ص: ۷۔۱۳ ریاض القدس ص ۸۔۷۔۳ ج:۲)

الغرض اسیران کربلا اور سرہائے شہدائے کربلا کو ابن زیاد لعین کے دربار میں پیش کیا اس موقع پر ثانی زہرا حضرت زینب نے سید الشہداء اور اہلبیت سے متعلق ابن زیاد کے متکبرانہ اور جارانہ الزامات کے جواب میں جو کلمات ارشاد فرمائے ان کو جملہ کتب مقاتل نے تحریر کیا ہے۔ جن کی بابت آل کاشف الغطانے تحریر کیا ہے کہ :

"جناب زینبؑ نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھا جس کو انصار حسین نے کربلا کے میدان میں قطع کیا۔ ان طاقت رُبا اور ہمت شکن حالات میں ابن زیاد کے سامنے زینبؑ کی زبان میں لکنت یا ان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب یا ان پر کسی خوف ودہشت کا اثر نہ تھا۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انھیں نے اس موقع پر حقائق پر تقریریں کیں جن کو اگر ایک فارغ البال اور مطمئن شخص کئی رات دن کی فکر میں تیار کرتا تب بھی وہ اپنی نوعیت میں یادگار کی حیثیت نہ رکھتیں۔ پھر جناب زینبؑ نے تو ہزاروں اشخاص کے مجمع میں ایسے موقع پر ان خطبوں کو ارشاد فرمایا تھا جب وہ مصائب اور شدائد کے بتیس دانتوں میں زبان کی طرح گھری ہوئی تھیں۔" (مظلومہ کربلا ص: ۷۔۱۴)

حضرت زینب شام میں : یزید کا خط ملنے پر ابن زیاد نے ۱۸ر صفر کو اہلبیت رسول کو کوفہ سے شام کے لئے روانہ کیا کربلا پہنچے وہاں دو روز قیام کیا پھر دمشق کیلئے روانہ ہوئے۔ مورخین نے اس چھ سو میل کے طویل سفر کی کم سے کم تیرہ اور زیادہ سے زیادہ چوالیس منازل بتائی ہیں لیکن ابی مخنف نے اپنے مقتل میں سہیل سے روایت بیان کی ہے۔ (سہیل کوفہ سے اہلبیت کے قافلہ کیساتھ ہو گیا تھا) وہ کہتا ہے کہ کوفہ سے دمشق تک کا فاصلہ چوبیس

منازل میں طے ہوا۔ راستہ میں مزاحمت و مخالفت کے خوف سے اہلبیت کو نا معلوم راستوں اور گذرگاہوں سے لیجایا گیا۔ اس کے باوجود متعدد مقامات پر وہاں کے باشندوں نے محافظ فوجی دستوں پر حملے بھی کئے۔

الغرض ۱۶ ربیع الاول کو یہ قافلہ دمشق پہنچا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو اہلیان شہر کا بہت بڑا اژدھام تھا جو خوشیاں منا رہا تھا اور اہلبیت رسول کا تماشہ دیکھنے کیلئے جمع تھا۔ جبکہ چند افراد صاحبِ علم و بصیرت عترتِ رسول کی حالت زار پر افسردہ تھے۔ مجمع میں سے کچھ لوگوں نے اہلبیت کے بچوں کو کھانے کی اشیاء دینے کی کوشش کی تو جناب زینب نے انکو منع کیا اور کہا کہ " ہم اہلبیت رسول ہیں ہم پر صدقہ حرام ہے " آپ نے مزید فرمایا:

" ویحکم ایها القوم الظالمون امّا تستحیون من الله العظیم ولا تخافون "۔

ترجمہ: افسوس ہے تم پر اے قوم ظالمین کیا تم خدا سے شرماتے اور ڈرتے نہیں۔

شمر ملعون جو نیزہ پر حضرت امام حسینؑ کا سر اٹھائے ہوئے تھا اور آپ کو قتل کرنے پر فخر کر رہا تھا اس کا کلام سن کر جناب ام کلثوم نے فرمایا۔

" کذبت یالعین ابن لعین ألا لعنة الله علیٰ قوم الظٰلمین یا ویلك تفتخر علیٰ یزید الملعون ابن ملعون بقتل من ناغاه جبرئیل ومیکائیل ومن اسمه مکتوب علیٰ سرادق عرش رب العٰلمین ومن ختم الله نبّوته بجدم سید المرسلین وقمع بابیه موادالمشرکین فمن این مثل جدّی محمدنِ المصطفیٰ وابی علی نِ المرتضی وامّی فاطمة الزهرا صلوٰت الله احمعین.

ترجمہ: اے لعین ابن لعین تو جھوٹا ہے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے وائے ہو تجھ پر تو یزید لعین پر فخر و ناز کرتا ہے حالانکہ

تو ایسی مقدس ہستی کے قتل کا مرتکب ہوا ہے جسکا جھولا جبرئیل ومیکائیل ہلاتے تھے اور جنکا اسم گرامی سرداق عرش پر لکھا ہوا ہے جنکے نانا پر نبوت و رسالت ختم ہو گئی جنکے پدر بزرگوار نے مشرکین کا قلع قمع کیا۔ کہاں ہے کوئی مثال میرے نانا محمد مصطفیٰ میرے باپ علی مرتضیٰ، میری ماں فاطمہ زہراؑ کی۔ اللہ کی صلوٰۃ و درود ہو ان سب پر۔" (مقلوبہ کربلا ص: ۱۹۱)

جب یزید کو اہلبیت رسول کے دمشق پہنچنے کی اطلاع ملی تو اس نے دربار آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ دربار میں اہلبیت کو پیش کیا گیا۔ سید سجادؑ سے کچھ سوال جواب ہوئے تو یزید نے طیش میں آکر سید سجادؑ کو قتل کی دھمکی دی اس پر جناب زینب نے سلسلہ کلام شروع کیا اور یزید کے ہر کلام کو قطع کر کے ایسے جواب دیئے کہ یزید غصہ میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کتب تواریخ و مقاتل میں یہ مکالمات تفصیل سے تحریر ہیں ہم یہاں حضرت زینبؑ کا وہ احتجاج خیز خطبہ تحریر کر رہے ہیں جو کتاب اللہوف اور سید ابن طاؤس وغیرہ میں مرقوم ہے۔

خطبہ

الحمدلله رب العالمین والصلوٰة علیٰ جدی سید المرسلین صدق الله کذالك یقول ثم کان عاقبة الذین اسآء وا السوای ان کذبوا بایات الله و کانوا بها یستهزون اظننت یایزید حین اخذت علینا اقطار الارض وضیقت علینا افاق السمآء فاصبحنالك فی اساری نساق الیك سرقانی قطارو انت علینا ذواقتدارٍ ان بنامن الله هوانا وعلیك منه کرامة وامتنانا وانّ ذالك لعظم حظرك وجلالة قدرك فشمخت بانفك ونظرت فی عطفك تضرب اصدرلك فرحاً تنفض مذرویك

مرحاً حین رایت الدنیا لك مستوسقة والامور لدیك مسقةً وکفروا انما نُملی لهُم خیر لِانفُسِم انَمَا نُمْلی لَهُمْ لِیَزدَادُوْٓا اِثماً وَلَهُمْ لعَذَابٌ مُهِیْنٌ. أمن العدل یا بن الطلقاء تخدرك حرائرك وامائك وسوئك وبنات رسولُ الله سبایاً قدهتکت ستورهنّ وابدیت وجوههنّ تحدوابهن الا عداء من بلد الیٰ بلدٍ ویستشرفهن اهل المناقل ویبرزن لاهل المناهل ویتصنح وجوههن القریب واللبعید والغائب والشهید وولی ولامن حماتهن حمیم عتوامنك علی الله وحجوداً لرسولَ الله ودفعالِماجاء بهٖ من عندالله. ولاغرومنك ولاعجب من فعلك وانی یرتجی مراقبة من لفظ فوه اکبادالشهدا ونبت لحمه بدماء السعداء ونصب الحرب لِسید الانبیاء وجمع الا حزاب وشهر الحراب وهزالسیوف فی وجه رسول الله صلی الله علیه واله. اشد العرب لله حجوداً وانکرهم له رسولاً واظهرهم عدوانا واعتاهم علی الرب کفراً وَطغیاناً الاانها نتیجة خلال الکفر وضب یجرجرفی الصدر لقتلی یوم بدرٍ فلایستبطی فی بغضنا اهل البیت من کان نظره الیناشنفاًواشناناً واحناً واضغاناً. یظهرِ کفره برسوله ویفصح ذالك بلسانه وهویقول فرحاً بقتل ولده وسبی ذرّیته غیرمتحوب ولا مستعظم لاهلوا واستهلوافرحاً ولقالوا یا یزید لا تشل منتحیاً علیٰ ثنایا ابی عبدالله وکان مقبل رسولَ الله صلی الله علیه واله ینکتها بمحضرته قد السمع السروربوجهه. لعمری لقد نکات القرحة و استاصلت الشانة باراقتك دم سید شباب اهل الجنة وابن یعسوب العرب وشمس ال عبدالمطلب وهتفت باشیاخك تقربت بدمه إلی الکفرة من اسلافك ثم صرحت بندائك

ولعمری لقد نادیتهم ولوشهدوك و وشیکا تشهدهم وان یشهدوك ولتودیمینك کما زعمت شلت بك عن مرفقها وجذت واجبت امك لم تحملك واباك لم یلدك حین تسیرالیٰ سخط الله ومخاصمك رسول الله صلی الله علیه واله.

اللهم خذبحقنا وانتقم من ظالمنا واحلل غضبك بمن سفك دمائنا ونقض ذمارنا وقتل حماتنا وهتك عنا سدولنا وفعلت فعلتك التی فعلت ومافریت الاجلدك وماجزرت الالحمك وسترد علیٰ رسولَ الله بماتحملت من ذریته وانتهکت من حرمته وسفکت من دماء عترته ولحمته حیث یجمع به شملهم ویلم به شعثهم وینتقم من ظالمهم ویاخذلهم بحقهم من اعدائهم فلا یستفزنك الفرح بقتله وَلَاتَحسَبَنّ الذِیْنَ قُتِلُوْا فِی سَبِیْلِ اللهِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیاء عِنْدَرَبِهِم یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. وحسبك بالله ولیاً وحاکماً ورسولَ الله خصیماً وبجبریل ظهیراً. وسیعلم من بواك ومکنك من رقاب المسلمین ان بئسَ للظالمین بدلا وایکم شرمکاناً واضلُ سبیلاً ط

وما استصغاری قدرك ولااستعظامی تقریعك توهما لانتجاع الخطاب فیك بعدان ترکت عیون المسلمین به عبری وصدورهم عندذکره حری فتلك قلوب قاسیة ونفوس طاغیة واجسام محشو قبسخط الله ولعنة الرسولَ قدعشش فیه الشیطان وفرخ ومن هنالك مثلك درج مادرج ونهض.

والعجب کل العجب تقتل الاتقیاء واسباط الانبیاء وسلیل الاوصیاء بایدی الطلقاء الخبیثة ونسدالعهرة الفجرة تنطف اکفهم من دمائنا وتتحلب افواههم من لحومنا وللجثث الزاکیة علی

الجیوب الضاحیة تنابها العواسل وتعفرها الفواعل فلئن اتخذتنا مغنمالتجد بنا وشیکا مغرما حین لاتجد.

اَلا ماقدمَت یداك واماالله بظلاّم لِلعَبیدِفالی اللهِ المشتکیٰ وَالمُعَولُ والیه الملجاء والمومل ثم کدکیدك واجهد جهدك فوالذی شرفنا بالوحی والکتاب والنبوة والانتخاب لاتدرك امدنا ولاتبلغ غایتنا ولا تمحواذ کرنا ولایرحض عناعارها. وهل رایك الا فندوا ایامك الا عدد الابدد یوم ینادی المنادی الالعن الله الظالم العادی والحمدللهِ الذی حکم لاولیائهٖ بالسعادة وختم لاصفیائهٖ ببلوغ الارادة ونقلهم الی الرحمة والرافة والرضوان والمغفرة ولم یشق بهم غیرك ولا ابتلیٰ بهم سواك ونسئله ان یکمل بهم الاجر ویجزل لهم الثوب والذخر ونسئله حسن الخلافة وجمیل الانابة انه رحیم ودود ط

ترجمہ : تعریف اس خدا کی جو رب العالمین ہے اور درود ہو میرے نانا سید المرسلینؐ پر۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور اس کا قول سچ ہے کہ " انجام بُرے کام کرنے والوں کا بُرا ہوگا۔ "جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور انکا مذاق اڑایا۔

اے یزید! کیا تو گمان کرتا ہے کہ تونے ہم پر زمین کے گوشے اور آسمان کے آفاق تنگ کر دیے (یعنی زمین و آسمان تنگ کر دیے) اور ہم تیرے قیدی ہو گئے اس لیے کہ تیرے پاس قطار میں لائے گئے ہیں اور تو ہم پر غلبہ و اقتدار حاصل کر چکا ہے اور کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہم کو ذلت و رسوائی پہنچی اور تجھے عزت و توقیر' اور یہ ظاہری فتح جو تجھے نصیب ہوئی وہ تیری جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کی وجہ ہوئی اور تو اس پر ناک چڑھانے لگا (یعنی مغرور ہو گیا۔) اور اترانے لگا۔ خوشی سے اچھلنے اور شوخی کرنے اور

گستاخی کرنے لگا۔ تو سمجھتا ہے کہ تجھے دنیا مل گئی اور تیرے معاملات مستحکم اور منظم ہو گئے اور ہمارا ملک تیرے قبضہ میں آگیا اور ہماری سلطنت تجھے حاصل ہو گئی ٹھہر جا! جہالت سے اتنا نہ اچھل۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھول گیا " وَلَا تَحسَبَنّ۔۔۔الخ۔۔۔" یعنی ہر گز یہ خیال نہ کرو کہ ہم نے کافروں کو اس لیے مہلت دی ہے کہ اس میں اُن کی بھلائی ہے بلکہ اس وجہ سے مہلت دی کہ اُن کے گناہ زیادہ ہو جائیں اور وہ ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا ہوں۔"

اے آزاد کردہ غلاموں کے بیٹے کیا یہ تیرا انصاف ہے کہ تو اپنی بیویوں اور لونڈیوں کو تو پس پردہ رکھے اور رسولؐ کی بیٹیوں کو قید کر کے دربدر پھرائے؟ تونے ہماری ہتکِ حرمت کی' ہمارے چہروں کو بے نقاب کیا (تیرے حکم سے) اشقیاء ہم کو شہر بہ شہر پھرا رہے ہیں۔ ہمہ اقسام کے لوگ خواہ وہ پہاڑوں میں رہتے ہوں یا پانی کے چشموں پر خیمہ زن ہوں ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ قریب و بعید' غائب و حاضر شریف و رذیل' امیر و غریب سب کی نظریں ہم پر پڑ رہی ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے مرد عزیزوں میں سے کوئی نہیں ہے اور نہ ہمارا کوئی معین و ناصر ہے۔

اے یزید! جو کچھ تونے کیا ہے اس سے تیری خدا سے سرکشی اور رسولؐ اللہ سے انکار ثابت ہوتا ہے اور اس کتاب (قرآن) اور سنت کو رد کرتا ہے' جو رسولؐ اللہ' خدا کی طرف سے لائے اور تیرا یہ فعل کوئی تعجب خیز اور حیرت انگیز بھی نہیں ہے اس لیے کہ جس کے بزرگوں نے شہیدوں کے جگر چابے ہوں' جن کا گوشت اہلِ سعادت کے خون سے نشوونما پایا اور بڑھا ہو' جنہوں نے سید الانبیاء سے جنگ کی ہو اور ان کے مقابلہ کے لیے احزاب (جتھے) جمع کیے ہوں اور رسولؐ اللہ کے مقابلہ میں تلواریں کھینچیں ہوں وہ یقیناً اللہ و رسولؐ کی دشمنی میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

یاد رکھ! کہ جو اعمالِ قبیحہ اور افعالِ شنیعہ تجھ سے سرزد ہوئے یہ طبائع کفر کا نتیجہ اور وہ دیرینہ کینہ ہے جو بدر کے مقتولین کی وجہ تمہارے دلوں اور سینوں میں موج زن ہے۔

جو شخص ہم کو عداوت، بغض اور کینہ کی نظر سے دیکھتا ہے وہ ہم اہلِ بیت رسولؐ سے دشمنی کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ رسولؐ سے اپنا کفر ظاہر کر دیتا ہے اور زبان سے بھی کہہ دیتا اور خوش ہو ہو کر کہتا ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کے فرزندوں کو قتل اور ان کی ذریت کو قید کیا اور اس کو گناہ اور امرِ عظیم نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ اگر اس کے بزرگ اس کے اس کارنامہ کو دیکھتے تو خوش ہو کر کہتے کہ اے یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں کہ تونے ہمارا انتقام لیا وغیرہ اے زیاد تو اس مجمع میں ابو عبداللہ الحسینؑ کے دندانِ مبارک کو چھڑی سے اذیت دے رہا اور بے ادبی کر رہا ہے حالانکہ وہ رسولؐ اللہ کی بوسہ گاہ ہے اور تیرے چہرہ سے خوشی و مسرت ظاہر ہو رہی ہے۔

میری جان کی قسم کہ تونے سردار جوانانِ اہلِ بہشت، یعسوب العرب (علیؑ) کے بیٹے، آفتاب آلِ عبدالمطلب کا خون بہا کر ہمارے زخم کو گہرا کر دیا اور جڑ کو زمین سے اکھاڑ دیا۔ حسینؑ ابنِ علیؑ کو قتل کر کے تونے اپنے کافر اسلاف سے تقرب حاصل کیا اور فخر کے ساتھ انہیں صدا دیتا اور کہتا ہے کہ اگر وہ تجھے دیکھیں تو کہیں گے کہ اے یزید تونے خوب کام کیا خدا تیرے ہاتھ شل نہ کرے۔ اے یزید اگر تو اپنے افعال و کردار پر غور کرے کہ تو کس امرِ عظیم کا مرتکب ہوا تو یقیناً تو تمنا کرے گا کہ واقعی تیرا ہاتھ شل ہو کر کہنی سے علیحدہ ہو جائے اور بول اٹھے گا کہ اے کاش میرے ماں باپ مجھے نہ جنتے کیونکہ تو محسوس کرے گا کہ خدا تجھ سے ناخوش ہو گیا ہے اور رسولؐ اللہ تیرے خصم (دشمن) بن گئے ہیں۔

اے اللہ تو ہمارا حق ہم کو دلا۔ ہمارے ظالموں سے ہمارا انتقام لے اور ان لوگوں پر جنہوں نے ہمارے خون بہائے، ہم سے عہد شکنی کی، ہمارے عزیزوں اور حامیوں کو قتل کیا، ہماری بے عزتی کی تو اپنا غضب نازل فرما۔ اے یزید جو کچھ کرنا تھا تو کر چکا لیکن یاد رکھ کہ تو نے اپنی ہی جلد کاٹی اور اپنے ہی گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کیے، تو عنقریب رسولؐ اللہ کی حضور میں پیش ہوگا اس گناہ کا بار لئے ہوئے جو کہ تونے ان کی ذریت کے ساتھ کیا ہے یعنی ان کی عترت کا خون بہا کر اور ان کی ذریت کی ہتکِ حرمت کر کے۔ یہ وہ مقام و موقع ہوگا جہاں ان کی ذریت جمع ہو گی اور ان کے ظالموں سے انتقام اور ان کے دشمنوں سے بدلہ لیا جائے گا۔

اے یزید تجھے نہ چاہیے کہ تو عترتِ رسولؐ کو قتل کر کے خوشی سے اچھلے اور ہر گز یہ نہ خیال کر کہ (لاتحسبن الذین قتلو فی سبیل الله امواتاً بل احیا عند ربهم یرزقون. فرحین بما اٰتهم الله من فضله) جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوئے (شہید ہوئے) وہ مردہ ہو گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور خدا کی طرف سے انہیں رزق پہنچ رہا ہے اور وہ خوش ہیں اللہ کی نعمت پر جو انہیں ملی ہے۔ تیری خبر لینے کے لئے اللہ کافی ہے۔ رسولؐ خدا تیرے خصم (مخالف دشمن) ہیں' جبرئیل تیرے مقابلہ میں ہماری پشت پناہ ہیں۔

وہ لوگ جنہوں نے تجھے سلطنت دی اور مسلمانوں کی گردنوں پر تجھ کو سوار کر دیا عنقریب جان لیں گے کہ ان کا کیا حشر ہوگا۔ ظالمین کا انجام برا ہے اور یہ کون جانتا ہے کہ تم میں سے برا کون اور گمراہ کون ہے۔

اے یزید میں نے اپنی تقریر میں جو تیری عزت گھٹائی اور تیرے عذاب کی شدت کا اظہار کیا ہے اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ بعد اس کے کہ تونے مسلمانوں کو رلایا اور ان کے دلوں کو رنجیدہ کیا اس سے تو کچھ اثر لے اس لئے

کہ تو ان لوگوں کی لعنت میں مبتلا ہے، تو ان لوگوں میں سے ہے جن کے دلوں میں شیطان نے گھونسلے بنا لئے اور بچے دیئے اور ان گھونسلوں سے بچے نکلے جو نکلے (یعنی تو بھی اس گھونسلے کی پیداوار ہے۔)

تعجب کا مقام ہے کہ نیک بندے جو انبیاء و اوصیاء کے فرزند ہیں وہ آزاد کردہ خبیث غلاموں اور فاسقوں اور فاجروں کی اولاد کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، ہمارے خون سے ان کے ہاتھ رنگے جائیں اور ہمارا گوشت ان کی غذا بنے۔!! افسوس ہے ان پاک بدنوں پر جو دشت بلا میں بے گور و کفن پڑے ہوئے ہیں اور جو تیروں کے زخم خوردہ ہیں۔

اے یزید! اگر تو ہماری شکست کو غنیمت سمجھتا ہے تو یاد رکھ تجھے اس کا تاوان بھی ادا کرنا ہوگا اس روز جبکہ تجھے اپنے کیئے کا پھل ملے گا۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا ہی پر ہمارا بھروسہ ہے، وہی ہمارا ملجاء اور جائے پناہ ہے اور اسی سے ہماری امید وابستہ ہے۔

تو جتنا مکر کرنا چاہتا ہے کرلے اور جس قدر کوشش کرنا چاہتا ہے کرلے۔ اس ذات کی قسم جس نے ہمیں وحی، کتاب اور نبوت و انتخاب سے مشرف فرمایا ہے تو ہمارے درجات نہیں پائے گا اور نہ ہماری منزلت کو پہنچے گا۔ اور نہ تو ہمارے ذکر کو مٹا سکتا ہے۔ نہ اس ننگ و عار کو دور کر سکتا ہے جو تجھ پر ہم پر ظلم و ستم کرنے کی وجہ سے عائد ہوا ہے۔ تیری رائے کمزور اور دن گنتی کے ہیں۔ تیری جماعت منتشر ہو جائے گی اس روز جبکہ منادی ندا کرے گا کہ خدا کی لعنت ہے ظالم اور تعدی کرنے والے پر۔

تعریف ہے اس خدا کے لئے جس نے اپنے اولیاء کا خاتمہ بخیر کیا اور اپنے اصفیاء کی مرادیں پوری کیں۔ اور انہیں اپنی رحمت، مہربانی، خوشنودی کی طرف بلا لیا اور تو ان پر ظلم کر کے بدبختی اور شقاوت میں مبتلا ہو گیا۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ان (اولیاء و اصفیاء) کی وجہ سے ہمارا اجر پورا کرے۔ ہمیں ثواب کثیر عطا کرے اور ہمیں حسن خلافت اور جمال امامت عطا فرمائے۔ وہ (خدا) مہربان ہے اور اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے۔ (مظلوم کربلا ص: ۲۲۸)

بالآخر یزید نے دربار برخاست کیا اور حکم دیا کہ لایکفهنّ من حرٍّ ولایقیهنّ مرد حتیٰ تقشعر وجوههنّ۔ یعنی (اہلبیت رسول کو) ایسے بے سایہ مکان میں رکھا جائے کہ دھوپ کی تپش اور سردی کے اثر سے محفوظ نہ رہیں یہانتک کہ ان کے چہروں کی کھال نکل آئے۔ اس حکم سے یزید کے جذبۂ انتقام اور خاندانِ رسولؐ سے عداوتِ شدید کا اظہار ہوتا ہے۔ الغرض یزید کے حکم سے اسیرانِ کربلا کو ایک خرابہ میں ٹھرایا گیا جواب بھی شہر دمشق میں جناب سکینہ بنت حسینؑ کی ضریح کے قریب ہے۔ اہلبیت نے یہاں چھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ گذارے۔

صاحب بحر المصائب اور مفتاح البکا کی روایت کے مطابق اہلبیت رسول جن کو یزید کے دربار میں لایا گیا ان کی مجموعی تعداد چوالیس تھی۔ مورخین نے دربار یزید میں ثانئ زہرا حضرت زینبؑ کے یزید سے متعدد مکالمات تحریر کئے ہیں۔ نیز دربار یزید میں اہلبیت کو لائے جانے سے متعلق تواریخ و مقاتل میں مختلف اور متضاد روایتیں پائی جاتی ہیں اور جو مکالمات ہوئے ان میں بھی اختلاف ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہلبیت کو یزید کے دربار میں ایک دفعہ نہیں بلکہ دمشق میں ان کے قیام کے دوران متعدد مرتبہ لایا گیا۔ اہلبیت اور یزید کے درمیان جو مکالمات ہوئے وہ انہی مختلف مواقع کے ہیں نہ کہ ایک ہی وقت کے اکثر کتب میں اہلبیت کے واقعات و مکالمات اس انداز سے تحریر کئے گئے ہیں کہ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب

ہم دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ان (اولیاء و اصفیاء) کی وجہ سے ہمارا اجر پورا کرے۔ ہمیں ثواب کثیر عطا کرے اور ہمیں حسن خلافت اور جمال امامت عطا فرمائے۔ وہ (خدا) مہربان ہے اور اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے۔ (مظلوم کربلا ص: ۲۲۸)

بالآخر یزید نے دربار برخاست کیا اور حکم دیا کہ لایکفهنّ من حرٍّ ولایقیهنّ مرد حتیٰ تقشعر وجوههنّ۔ یعنی (اہلبیت رسول کو) ایسے بے سایہ مکان میں رکھا جائے کہ دھوپ کی تپش اور سردی کے اثر سے محفوظ نہ رہیں یہانتک کہ ان کے چہروں کی کھال نکل آئے۔ اس حکم سے یزید کے جذبۂ انتقام اور خاندانِ رسولؐ سے عداوتِ شدید کا اظہار ہوتا ہے۔ الغرض یزید کے حکم سے اسیرانِ کربلا کو ایک خرابہ میں ٹھرایا گیا جواب بھی شہر دمشق میں جناب سکینہ بنت حسینؑ کی ضریح کے قریب ہے۔ اہلبیت نے یہاں چھ ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ گذارے۔

صاحب بحر المصائب اور مفتاح البکا کی روایت کے مطابق اہلبیت رسول جن کو یزید کے دربار میں لایا گیا ان کی مجموعی تعداد چوالیس تھی۔ مورخین نے دربار یزید میں ثانئ زہرا حضرت زینبؑ کے یزید سے متعدد مکالمات تحریر کئے ہیں۔ نیز دربار یزید میں اہلبیت کو لائے جانے سے متعلق تواریخ و مقاتل میں مختلف اور متضاد روایتیں پائی جاتی ہیں اور جو مکالمات ہوئے ان میں بھی اختلاف ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہلبیت کو یزید کے دربار میں ایک دفعہ نہیں بلکہ دمشق میں ان کے قیام کے دوران متعدد مرتبہ لایا گیا۔ اہلبیت اور یزید کے درمیان جو مکالمات ہوئے وہ انہی مختلف مواقع کے ہیں نہ کہ ایک ہی وقت کے اکثر کتب میں اہلبیت کے واقعات و مکالمات اس انداز سے تحریر کئے گئے ہیں کہ ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب

ایک ہی موقع پر ہوئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ابو مخنف نے بھی اپنے مقتل میں یہ سب واقعات شروع سے آخر تک بیان کر دیئے اور یہ تعین نہیں کیا کہ کون سا واقعہ کب اور کس محفل میں پیش آیا اور کونسی گفتگو کب ہوئی۔ اس کے علاوہ چونکہ اہل دربار اور راوی مخدرات عصمت وطہارت کو پہچانتے نہ تھے اسلئے کسی کلام کو حضرت زینب اور کسی کو ام کلثوم سے منسوب کر دیا درانحالیکہ یزید کے دربار میں حضرت زینب ہی نے گفتگو کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مورخین نے یہ وضاحت کی کہ حضرت زینب کی کنیت ام کلثوم تھی۔

حضرت زینب کی بابت علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطا نے تحریر کیا ہے کہ:

> "حضرت زینب کی شجاعت و جرأت ایک مرتبہ دو مرتبہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا ظہور ہر اس موقع پر ہوتا رہا جب مشکلات کا ہجوم اور مصائب کا اژدحام تھا۔ جب کہ تماشائیوں سے بازار، کوٹھے اور برآمدے مملو تھے۔ کوفہ میں داخلہ کے وقت، کوفہ سے نکلنے کے موقع پر، راہ میں، بازار شام میں، ہر مناسب موقع پر زینب کی زبان فریضہ تبلیغ میں گویا تھی۔ انہوں نے حق کو واضح کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ انہوں نے ہر موقع پر ایسی تقریر کی جو کسی ایسے خطیب سے بھی ناممکن ہے جس کیلئے تمام خاطر جمعی اور راحت و اطمینان کے اسباب موجود ہوں۔" (ماخوذ از شہید انسانیت)

جسٹس امیر علی نے حضرت زینب کی شجاعت اس طرح بیان کی ہے:

> "The grand-daughter of Mohammad, Zainab the sister of Hussain, shielded her youthful nephew from the Ommeyyades after the ferocious Obaidullah ibn Ziyad and the pitiless yezid." (Sprit of Islam P.250)

ترجمہ: حضرت محمدؐ کی نواسی اور حضرت امام حسینؑ کی بہن زینبؑ نے اپنے نوجوان بچوں کو ظالم عبیداللہ بن زیاد اور بے رحم یزید اموی کے جور و ظلم سے محفوظ رکھا۔

وفات: مورخین نے حضرت زینب کی تاریخ وفات اور جائے مدفن کی بابت مختلف و متضاد روایتیں بیان کی ہیں۔ اگر ہم ان تمام روایات کو تفصیل سے لکھنے بیٹھیں تو کثیر تعداد میں صفحات درکار ہوں گے لہٰذا اہم چند روایات کا مختصر اجائزہ لے رہے ہیں۔

صاحب بحر المصائب نے روایت بیان کی ہے کہ جناب زینب پر واقعات کربلا اور سفر کوفہ و شام میں پڑنے والی مصیبتوں اور زحمتوں کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ کی کمر خمیدہ ہو گئی اور مسلسل حزن و ملال کے باعث آپ نے رحلت فرمائی۔ اسی کتاب میں یہ بھی روایت ہے کہ شام سے واپسی کے چار ماہ بعد جناب ام کلثوم نے رحلت فرمائی اور ان کے اسی روز بعد جناب زینب کی وفات ہوئی۔

صاحب انوار الشہادۃ نے متعدد کتب کے حوالہ جات سے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یزید کے فسق و فجور، کفر و شقاق اور قتل امام حسینؑ کی وجہ سے اہل مدینہ اس سے متنفر ہو گئے اور اس کی بیعت توڑ دی۔ نیز عبداللہ بن زبیر نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ لہٰذا یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو اہل مدینہ کی سرکوبی کیلئے خصوصی ہدایات دیکر بھیجا۔ اس نے شہر مدینہ کو تاخت و تاراج کیا اور اہلبیت رسول کو اسیر کر کے شام بھیج دیا۔ جب یہ قافلہ شہر دمشق سے ایک منزل پہلے پڑاؤ کئے ہوئے تھا تو جناب زینب نے دعا کی کہ یزید کے دربار میں پیش ہونے سے قبل انہیں موت آجائے۔ معصومہ کی دعا قبول ہوئی اور آپ یکایک علیل ہو گئیں۔ آپ نے حضرت امام

علی زین العابدینؑ کو چند وصیتیں فرمائیں اور آپ کی روح مقدس پرواز کر گئی۔

اب اگر آپ مذکورہ روایت پر تنقیدی نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اہلبیت کی تذلیل کے لئے کیسی کیسی روایتیں گھڑی جاتی رہی ہیں۔ متعدد مستند کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ واقعہ حرہ کے موقعہ پر یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو ہدایت کی تھی کہ تمام اہل مدینہ سے بیعت لینا مگر علی بن الحسینؑ سے ہرگز بیعت کا سوال نہ کرنا۔ ایسی صورت میں حضرت امام زین العابدینؑ کو معہ دیگر اہلبیت رسول اسیر کر کے دمشق بھیجنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ تواریخ میں یہ بھی مرقوم ہے کہ واقعہ حرہ کے وقت حضرت امام زین العابدینؑ مدینہ میں موجود ہی نہ تھے۔ آپ اپنے اہلبیت اور خاندان بنی ہاشم کو ساتھ لے کر مدینہ کے قریب مقام ینبع میں قیام پذیر ہو گئے تھے اس لئے آپ اور آپ کے خاندان کو شاہی فوج سے کوئی گزند نہ پہنچا۔[1]

مزید براں مذکورہ روایت میں حضرت زینب کی جس وصیت کا ذکر کیا ہے اور جسے ہم نے دانستہ نہیں لکھا ہے اس کی بابت صاحب طراز المذہب نے تحریر کیا ہے کہ

"ہرگز در نظر ہیچ خردمند پسند نیاید۔ چگونہ با امام زمان و حجت یزدان ایں گونہ سخن می کنند وآنکہ مثل حضرت زینب کبریٰ را عالمہ وفہیمہ وعارفہ وکاملہ در لسان امام ی خوانند"۔

ترجمہ: کوئی عقلمند اس بات کو نہیں مان سکتا کہ جناب زینب جن کو خود امامؑ نے عالمہ، فہیمہ، عارفہ اور کاملہ کہا ہو امام زماں حجت خدا زین العابدینؑ کو اس قسم کی وصیتیں فرمائی ہوں گی۔

---

[1] تاریخ کامل ص: ۲۵ ج: ۴

ایک اور روایت جسے شیخ محمد بغدادی نے اپنی کتاب "منتخب السیر" میں بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یزید نے بعد شہادت حسینؑ یہ چاہا کہ اپنے افعال قبیحہ کو چھپانے اور واقعات کربلا سے متعلق اعمال کو ابن زیاد سے منسوب کر کے اپنے آپ کو ان سے بری الذمہ ثابت کرنے کیلئے اس نے حضرت عبداللہ کے انتقال کی خبر پا کر حضرت امام زین العابدینؑ کو خط ارسال کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ جناب زینب سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ امامؑ نے یہ خط جناب زینب کو دیا اور فرمایا سفر کی تیاری کریں۔ المختصر منازل سفر طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں آپ کا مزار مطہر ہے یہیں پر ایک باغ تھا جس میں ایک نہر بہتی تھی آپ نہر کے کنارے بیٹھیں گریہ کر رہی تھیں کہ بیہوش ہو کر نہر میں گر گئیں۔ باغبان نے یہ سمجھ کر کہ کوئی چیز پانی میں آگئی ہے جس سے نہر کا پانی رک گیا ہے بیلچہ مارا تو آپ کی پیشانی شگافتہ ہو گئی۔ اسی صدمہ سے آپ کی وفات ہوئی۔[1]

اس روایت پر بھی غور کیجئے اور راوی کی عقل و فراست کی داد دیجئے۔ ہم نے روایت کے بیان میں اختصار سے کام لیا ہے لیکن اگر آپ تفصیل سے روایت کو پڑھیں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ راوی نے اہلبیت رسولؐ پر ڈھائے جانے والے مظالم سے یزید کو کس آسانی سے بری الذمہ قرار دینے کی ناکام کوشش کی ہے اور شہادت حسینؑ پر یزید کی پشیمانی کو ظاہر کر کے اہلبیت رسول سے رشتہ داری قائم کرنے کی خواہش کو بیان کیا ہے۔ یزید کی پردہ پوشی میں راوی نے یہ تحقیق کرنا بھی گوارہ نہیں کیا کہ عبداللہ بن جعفر کی وفات کب ہوئی اور یزید کب مرا۔ تاراجی مدینہ کے بعد یزیدی فوج خانہ کعبہ میں چھپے ہوئے عبداللہ بن زبیر کی جستجو میں کعبۃ اللہ پر سنگ باری و آتش

---

[1] مظلومۂ کربلا ص: ۲۶۷

باری کر رہی تھی اسی دوران ۶۴ھ میں یزید واصل جہنم ہوا جبکہ عبداللہ بن جعفر نوے سال کی عمر میں ۸۰ھ میں فوت ہوئے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ یزید اس قسم کی جرات کرتا البتہ راوی نے یہ جرات کر دکھائی۔ نیز یزید کا خط ملتے ہی حضرت علی زین العابدینؑ سفر پر آمادہ ہو گئے جس سے راوی نے یہ تاثر پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ امام زین العابدینؑ یزید کے مطیع و فرمانبردار تھے۔

الغرض اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں جو اموی دور حکومت میں گھڑی گئیں اور ہماری کتب میں نقل ہوئیں ہیں اور جن کو ہمارے چند ذاکرین مجالس عزاء میں ببانگ دہل بیان فرماتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے ان ذاکرین عظام سے نہایت دست بستہ التماس کرتے ہیں کہ برائے خدا ایسی روایات بیان کرنے سے قبل ان کا ہر پہلو سے جائزہ ضرور لے لیا کریں کیونکہ صرف گریہ و بکا کیلئے ایسی موضوعہ اور حقائق کے منافی روایات کا بیان نہ صرف قوم کی خجالت کا باعث ہوتا ہے بلکہ اہلبیت رسولؐ کی برگزیدہ ہستیوں کی تحقیر و تذلیل کا موجب بھی بنتا ہے۔

حضرت زینب نے کس سن میں وفات پائی اس کا تواریخ سے پتہ نہیں چلتا اور آپکی تاریخ وفات بھی مورخین نے مختلف بیان کی ہیں جن میں ۲۴ صفر اور ۲۱ جمادی الثانی مشہور ہیں ان میں بھی ثانی الذکر زیادہ مقبول ہے۔

جائے مدفن: آپ کے مدفن کی بابت مورخین کے مختلف بیانات ہیں بعض کا کہنا ہے کہ آپ کا انتقال قاہرہ میں ہوا اور آپ وہیں دفن ہوئیں۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ نے مدینہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کی گئیں۔ جبکہ کثیر تعداد نے آپ کا مدفن دمشق کے قریب ایک باغ میں بتایا ہے۔ جہاں تک قاہرہ میں آپ کا مدفن ہونے کا تعلق ہے تو یہ قطعی بے بنیاد ہے کیونکہ کسی

بھی تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے زندگی میں کبھی بھی مصر کا سفر کیا ہو۔ جن مزارات کی طرف مورخین نے اشارہ کیا ہے ان میں سے ایک قبر زینب بنت احمد بن عبداللہ بن جعفر بن محمد بن علی بن ابیطالب کی ہے جو اس کے کتبہ سے ظاہر ہے یہ زینب محمد حنفیہ کی اولاد میں سے تھیں۔ دوسرا مزار جو مسجد "سید تنا زینب" میں ہے وہ مصر کے کسی فاطمی خلیفہ کی بہن زینب کا ہے نہ کہ حضرت زینب بنت علیؑ کا۔

دوئم مدینہ میں آپ کی قبر کا تصور جیسا کہ صاحب طراز المذہب نے پیش کیا کہ " آنچہ صحیح می نماید ایں است کہ حضرت زینب بعد از مراجعت بمدینہ طیبہ وفات کردہ است او در مدینہ مدفون شدہ است " درست نہیں کیونکہ حضرت زینب جیسی برگزیدہ ہستی کی قبر مطہر مدینہ منورہ میں ہو اور کسی کو پتہ نہ ہو، آپکے مزار مقدس کا کوئی نام و نشان نہ ہو یہ کیونکر ممکن ہے۔

سوئم حضرت زینب کا مزار دمشق کے نواح میں ہونا جیسا کہ اکثر مورخین نے بیان کیا ہے درست ہے البتہ آپ کے دوبارہ دمشق میں ورود کی بابت مورخین نے اپنے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے لیکن صحیح تر یہی ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط ہوا تو جناب عبداللہ مع اہل و عیال شام کیلئے روانہ ہوئے جناب زینب بھی آپ کے ہمراہ تھیں۔ آپ مریض و لاغر تو تھیں ہی دوران سفر علیل ہوئیں۔ دمشق کے قریب ایک قریہ میں قیام کے دوران آپ نے انتقال فرمایا۔ جناب عبداللہ نے وہیں پر آپ کو دفن کیا۔ آپ کی نسبت سے یہ قریہ "زینبیہ" مشہور ہوا۔ آپ کی قبر پر شاندار گنبد تعمیر کیا گیا اور روضہ اقدس کے گرد وسیع و عریض باغ لگایا گیا۔ اب یہ روضہ زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ دور دور سے زائرین اس روضہ پر حاضری دیتے ہیں اور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

دمشق میں مخدرات اہلبیت کی متعدد قبور بتائی جاتی ہیں مثلاً جناب ام کلثوم، جناب رقیہ، جناب سکینہ وغیرہ جو تاریخی واقعات کے منافی ہیں دمشق میں صرف جناب سکینہ بنت حسینؑ کی قبر کے علاوہ کسی بی بی کی قبر نہیں ہے دوسرے مزارات نقلی ہیں جو اہل دمشق نے ذریعہ معاش اور متولی کی خدمات حاصل کرنے کی غرض سے قائم کئے ہوئے ہیں۔

شیعہ و شیعت

انسان جو افعال و اعمال اپنی زندگی میں انجام دیتا ہے وہ ایک خاص نظام کے تحت ہوتے ہیں جن کی وہ خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک سعادت مند زندگی بسر کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اسے کامیاب بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے اعمال و افعال کو ان قوانین و ضوابط سے مطابقت دیتا ہے جو اس نے اپنی مرضی سے بنائے ہوں یا دوسروں سے حاصل و قبول کئے ہوں۔ یہ قوانین و ضوابط بنیادی عقیدے پر قائم و استوار ہوتے ہیں اور انسان انہی پر بھروسہ کرتا ہے۔ ان قوانین و ضوابط کے اعتبار سے انسان مختلف افکار و نظریات میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو دنیا کو مادی اور انسان کو صد فی صد مادہ تصور کرتے ہیں وہ اپنے طور طریقے کو اسی انداز میں ڈھالتے ہیں۔ وہ لوگ مادی خواہشات اور چند روزہ دنیاوی لذات کے حصول کی خاطر اپنی تمام تر قوت و توانائی صرف کر دیتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو دنیائے فطرت کو ایک خدائے برتر کی مخلوق تصور کرتے ہیں جو فطرت سے ماوراء ہے اور جس نے کُل کائنات عرش و سما کو خلق فرمایا اور خصوصی طور پر انسان کی تخلیق فرما کر اس کو اپنی گوناگوں نعمتوں سے نوازہ ہے تاکہ وہ ان نعمتوں کی خوبیوں اور لذتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔ یہ لوگ اپنی زندگی کی اس طرح منصوبہ بندی کرتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کر کے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے

ہیں مثلاً مجوسی، یہودی، عیسائی اور مسلمان وغیرہ۔ یہ لوگ اپنی زندگی کو ایسی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں جس میں اعتقاد اور ایمان شامل ہو اور دنیا و آخرت کی سعادت کی ضمانت بھی موجود ہو۔ ایسی راہ صرف دین کے ذریعہ ہی میسر آسکتی ہے۔

دین : جو کچھ خدا کے پیغمبروں کو وحی ربانی کے ذریعہ حاصل ہوا اور انہوں نے پیغام و نصیحت کے طور پر انسان تک پہنچایا اس کو "دین" کہتے ہیں۔ دین اصول کا نام ہے اور شریعت، اصول و فروع کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ اصول کا تعلق اعتقاد قلبی سے ہے۔ فروع کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے۔ دین میں تبدیلی نہیں ہوتی جب کہ فروع میں تغیر و تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ انسان کا دین پر اعتقاد و ایمان اور اس کے مناسب قوانین جن پر وہ اپنی زندگی گذارتا ہے حقیقی سعادت کا باعث ہیں۔ پس دین کا مطلب روش حیات یا زندگی گذارنے کا طریقہ ہے اور انسان ہرگز اس سے جدا نہیں رہ سکتا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ :

> ترجمہ : انسان دین سے نہیں بچ سکتا (دور نہیں رہ سکتا) اور وہ دین ایک ایسا راستہ ہے جس کو انسان کے لئے خدا نے کھول رکھا ہے تاکہ اس راستے پر چل کر اس تک پہنچ سکے۔ البتہ جن لوگوں نے دین حق (اسلام) کو قبول کر لیا وہ یقیناً خدا کے راستے کو طے کر رہے ہیں اور جن لوگوں نے دین حق (اسلام) کو قبول نہیں کیا وہ خدا کے راستے سے منحرف اور گمراہ ہو گئے ہیں"۔ (سورۃ اعراف آیت : ۴۴، ۴۵)

مذہب : جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں یعنی فروع میں تغیر و تبدیل ہو جائے تو ہر فرقے کو "مذہب" کہا جاتا ہے۔ جیسے اسلام دین ہے اور اسکے فرقے شیعہ اور سنی مذاہب ہیں اسی طرح عیسائیت دین ہے جبکہ اسکے فرقے ملکانی اور نسطوری مذاہب ہیں۔ مذہب کے لفظی معنی راہ کے ہیں اور

اصطلاحاً اس سے وہ راہ مراد ہے جسے انسان دنیاوی زندگی میں اختیار کرے تاکہ بہ آسانی وآسائش منازل آخرت کے پسندیدہ مقام پر پہنچ جائے۔ اس اعتبار سے مذہب کے دو جز ہوئے ایک "معاش" اور دوسرے "معاد" ہر فرقے کی اصل غرض وغایت یہی ہے کہ ان دونوں اجزاء سے متعلقہ امور کو اس انداز سے انجام دے جو صلاح وثواب کا باعث ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب اس عقیدے میں متفق ہیں کہ انسان کو جزاول یعنی معاش میں وہ روش اختیار کرنا چاہیے جس سے پاک زندگی اور قیام نوع بشری میں خلل واقع نہ ہو تاکہ انجام خیر ہو اور دوسرے جز یعنی معاد کی اذیتوں اور زحمتوں سے نجات ملے۔ الغرض آج کے لئے وہ عمل کرنا جس سے کل کی راحت وابستہ ہو اسکا نام مذہب ہے۔

صرف دو فرقے "دہریہ" اور "لاادریہ" اس عقیدے میں شریک نہیں۔ فرقہ دہریہ تو وجود الٰہی کا ہی قائل نہیں یعنی یہ فرقہ اس اصل کا ہی منکر ہے جو مذہب اور طرز عمل کی بنیاد ہے۔ جبکہ فرقہ لاادریہ کا قول ہے کہ "علم بشری کو خداوند تعالیٰ کے عدم ووجود پر حکم لگانے کی قوت ہی حاصل نہیں"۔ لہٰذا یہ دونوں فرقے کسی طرز عمل کی پابندی کے قائل نہیں۔

مذہب شیعہ : شیعہ مذہب کی بابت عام طور سے لکھا اور کہا جاتا ہے کہ جنگ صفین کے دوران جو لوگ حضرت علیؑ کیساتھ تھے وہ شیعان علیؑ کہلائے اور جو لوگ معاویہ بن ابو سفیان کی حمایت میں لڑ رہے تھے وہ شیعان معاویہ کہلائے۔ بعض مورخین نے شیعان معاویہ کو شیعان عثمان بھی لکھا ہے۔ جب کہ مورخین کا یہ کہنا ہے کہ بعد میں یہی شیعان معاویہ سنی مشہور ہوئے۔ بعض مورخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جنگ صفین سے بہت پہلے جناب رسول خداؐ کی حیات طیبہ میں شیعان علیؑ موجود تھے لیکن جنگ صفین کے دوران اس نام کو شہرت ملی۔ مثال کے طور پر ابو حاتم رازی نے اپنی کتاب "کتاب الزینة" میں تحریر کیا ہے:

ترجمہ: "یعنی پہلا نام جو اسلام میں بعہد رسالتمآبؐ ظاہر ہوا وہ شیعہ ہے اور یہ نام صحابہ میں سے چار اشخاص ابوذرؓ، سلمان فارسیؓ، مقداد اسودؓ اور عمار یاسرؓ کا لقب تھا یہاں تک کہ جنگ صفین کا موقع آیا اس وقت یہ نام دوستداران علیؑ میں شہرت پکڑ گیا اور پیروان معاویہ سنی کے نام سے مشہور ہوئے"۔ (حوالہ ماہنامہ "....." ص ...)

ہمارے خیال میں یہ نظریہ سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہیں وگرنہ قرآنی آیات، رسالتمآبؐ کے بیانات اور تاریخی واقعات سے واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ مذہب شیعہ قدیم ترین مذہب ہے جس کی اپنی تاریخ ہے۔ مذکورہ بالا نظریہ تاریخ شیعہ کا دوسرا حصہ ہے۔ ہم یہاں اس تاریخ کو مختصراً تحریر کر رہے ہیں۔

تاریخ مذہب شیعہ : شیعت کے آغاز کو ہم دو حصوں میں بیان کر سکتے ہیں اول امم سابقہ کے ادوار میں اور دوئم عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں۔ امم سابقہ کے ادوار کی بابت قرآن مجید، جو بہترین تاریخ بھی ہے، میں اللہ جل شانہ نے لفظ شیعہ کا اشارہ ممدوحیت کے عنوان سے کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ کے تابعداروں اور چاہنے والوں کو شیعہ کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ بیان ہے کہ:

ایک دن اتفاقاً موسیٰ شہر میں ایسے وقت آئے کہ وہاں کے لوگ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔[۱] آپ نے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں لڑ مر رہے ہیں۔

"وهذا من شيعته وهذا من عدوه فاستغاله الذى من شيعته على الذى من عدوه" (سورۃ القصص آیت: ۱۵)

ترجمہ: ایک ان کا شیعہ یعنی پیرو اور دوسرا انکا عدو یعنی دشمن سے پس موسیٰ کے شیعہ نے دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے موسیٰ سے مدد مانگی۔

ایک اور واقعہ جب فرعون کے دربار میں جادوگروں نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھنے کے بعد اپنے ایمان کی بابت کہا

۱۔ بعض نے یہ صبح کا وقت بتایا ہے جب کہ دیگر کا کہنا ہے کہ یہ سہ پہر کا وقت تھا جب اہل عرب عام طور پر سوتے ہیں۔

"قالوا آمنا برب العٰلمين o رب موسى وهرون o"
(سورۃ الشعراء آیت: ۴۷، ۴۸)

ترجمہ: کہنے لگے ہم سارے جہاں کے پروردگار پر ایمان لائے (جو) موسیٰ و ہارون کا پروردگار ہے"۔

اس واقعہ کی بابت علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر فرمایا ہے کہ فرعون کے دربار کے جادوگر جناب موسیٰؑ کی نبوت کے ساتھ ساتھ ہارون کی وصایت کا کلمہ پڑھ کر دولت ایمان سے مالامال ہو گئے تو لوگوں نے ان مومنین کو شیعہ کہنا شروع کر دیا۔[۱]

حضرت موسیٰؑ سے بھی پہلے جناب ابراہیمؑ اور جناب نوحؑ کے زمانہ سے قرآن مجید شیعوں کے وجود کا پتہ دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

و ان من شيعته لابراهيم o (سورۃ الصافات آیت: ۸۳)

ترجمہ: بے شک ابراہیم نوح کے شیعہ (پیرو) تھے۔"

مجاہد اور قتادہ کا بیان ہے کہ جناب ابراہیمؑ جناب نوحؑ کے دین پر تھے اس لئے ان کو شیعہ نوح کہا گیا۔[۲]

قاضی ابوالفضل عیاض نے کتاب شفا میں یہی روایت کلبی سے نقل کی ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ پیروان حضرت نوحؑ شیعہ کہلاتے تھے منجملہ انہی میں حضرت ابراہیمؑ بھی ایک شیعہ نوح تھے لہٰذا قرآن سے ثابت ہوا کہ نوح جو آدم ثانی تھے ان کے وقت سے اہل حق کے لئے لفظ شیعہ کا آغاز ورواج ہوا۔ نیز لفظ شیعہ سب سے پہلے ایک نبی کے متعلق استعمال ہوا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ نبی کے پیرو کو شیعہ کہتے ہیں۔ لفظ شیعہ ہی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ شیعہ کے علاوہ اسلام کے کسی بھی مذہب یا فرقہ کے نام کو قرآن

۱۔ حسن المحاضرہ فی تاریخ المصر والقاہرہ ص: ۲۹ ج: ۱ ۲۔ تفسیر درمنثور ص: ۲۷۹ ج: ۹

میں داخل ہونے کا شرف نصیب نہیں ہے۔

مذہب شیعہ کی تاریخ کا دوسرا دور جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں شیعوں کے وجود وعقائد کی بابت ہمیں کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ ماشاء اللہ سواد اعظم کے موثق ترین علماء نے لفظ شیعہ کی تعریف اور شیعوں کا عقیدہ بھی اپنی معتبر کتابوں میں بڑے اہتمام سے رقم فرمایا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں ان علماء کی بیان کردہ چند روایتیں اور مورخین کے کچھ بیانات پیش کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔

عربی کی مستند لغت "المنجد" میں تحریر ہے کہ

"وقد غلب هوالاسم على كل من يتولى علياً و اهل بية حتى صارهم اسما خاصا"۔

(المنجد طبع بیروت ص: ۴۴۳)

ترجمہ: زیادہ تر کثرت سے یہ اسم ہر اس کے لئے ہے جو علیؑ اور اہلبیت سے محبت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ان سے (محبت کرنے والوں) کے لئے اسم خاص ہو گیا۔

اہلحدیث کے مولوی وحید الزماں حیدرآبادی تحریر کرتے ہیں کہ

"اب اس کا استعمال ان لوگوں کے لئے کیا جاتا ہے جو حضرت علیؑ سے محبت رکھتے ہیں اور آپ کے اہلبیت سے۔"

(لغات الحدیث کتاب شین ص: ۱۹۲)

مقدمہ ابن خلدون اور پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے "دائرہ معارف اسلامیہ" میں مندرج ہے کہ

"اعلم ان الشيعة هم الصحب والاتباع ويطلق فى عرف الفقهاء ومتكلمين من الخلف والسلف على اتباع على وبنيه رضى الله عنهم۔"

(مقدمہ ابن خلدون (قاہرہ) ص: ۲۱۵، دائرہ معارف اسلامیہ ص: ۸۹۹ ج: ۱۱)

ترجمہ: لغت میں شیعہ کے معنی ساتھی اور پیروکار ہے۔ سلف سے اب تک فقہاء متکلمین کے روزمرہ میں حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد رضی اللہ عنہم کے پیروکار کو شیعہ کہا جاتا ہے۔

علامہ ابن حجر مکی کا ارشاد ہے کہ

ترجمہ: "اصطلاحاً اس شخص یا جماعت کو شیعہ کہتے ہیں جو حضرت علیؓ کو دوست رکھے اور آپ کو صحابہ سے مقدم سمجھے۔" (فتح الباری)

علامہ ابن اثیر تحریر فرماتے ہیں کہ

ترجمہ: "شیعہ انھیں لوگوں کو کہتے ہیں جو حضرت علیؓ اور ان کے اہلبیت کو رسول کے نامزد کردہ اوصیاء کے قائل ہوں اور یہ اسی طبقہ کا مخصوص نام ہے۔" (مجمع البحرین فی اوائل الفرقتین ص: ۵۴۰)

صاحب کشاف تحریر فرماتے ہیں کہ

ترجمہ: "یہ ایک بڑا فرقہ ہے جو شیعہ علیؓ کے نام سے مشہور ہے ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ بہ نص جلی و خفی خلیفہ ہیں اور ان کے بعد یہ منصب انھیں کی (معصوم) اولاد میں تا قیامت رہے گا۔" (اصطلاحات الفنون)

ڈاکٹر صبحی محمصانی تحریر فرماتے ہیں کہ

"چونکہ انھوں نے (یعنی ایک جماعت نے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت و پیروی کی اس لئے شیعہ علی رضی اللہ عنہ کہلائے۔"
(فلسفہ شریعت اسلام ص: ۷۹)

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریر فرمایا ہے کہ

"حامیان علیؓ کا گروہ ابتداء میں شیعان علی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اصطلاحاً انھیں صرف شیعہ کہا جانے لگا۔" (خلافت و ملوکیت ص: ۲۱۰)

لغت کی وسعت کے اعتبار سے لفظ شیعہ اپنے متعلق کی نسبت سے

ممدوح یعنی قابل تعریف یا مذموم یعنی قابل نفرت ہوا کرتا ہے۔ اگر کوئی قوم حزب اللہ ہے تو وہ شیعۃ الرحمٰن کہلائے گی جو ممدوح ہے اور اگر کوئی قوم ابلیس رجیم کی تابیدار ہے تو وہ شیعۃ الشیطان کہلائے گی جو مذموم ہے۔ جنگ صفین میں محبان علیؓ کو شیعان علیؓ اور پیروان معاویہ کو شیعان معاویہ کہا گیا۔ یہ ملحوظ رہے کہ رسالتمآبؐ نے جن شیعوں کی مدح فرمائی یا جن کو جنت کی خوشخبری دی وہ شیعان علیؓ ہیں۔

مذہب شیعہ امامیہ: پس مذکورہ بالا بیانات سے بالکل واضح ہو گیا کہ دین اسلام میں جو لوگ رسالتمآبؐ کے بعد حضرت علیؓ کو بہ نص جلی و خفی امام مانتے ہیں اور حضرت علیؓ کے بعد آپ کی معصوم اولاد کو امام تسلیم کرتے ہیں شیعہ امامیہ کہلاتے ہیں اور چونکہ ان آئمہ معصومین کی تعداد بارہ ہے لہٰذا انھیں بارہ امامی شیعہ یا شیعہ اثناء عشری بھی کہتے ہیں نیز یہ لوگ اہلبیت علیہ السلام کی اتباع کرتے ہیں اسلئے شیعان اہلبیت بھی کہلاتے ہیں۔ تاریخ عہد اسلامی میں جہاں کہیں بھی شیعہ کا لفظ استعمال ہوا ہے عموماً اس سے مراد شیعہ امامیہ اثناء عشری ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دیگر شیعہ فرقے جو شیعہ امامیہ ہی سے نکلے ہیں ان کے اپنے الگ الگ نام ہیں مثلاً کیسانیہ' زیدیہ' اسماعیلیہ وغیرہ۔

مخصوص نظریات: شیعہ امامیہ کے مخصوص نظریات درج ذیل ہیں:

۱۔ امامت سے مراد مسلمانوں کی امامت کبریٰ یعنی خلافت' حکومت' قیادت اور ولایت کا مجموعہ ہے۔ امامت سے مراد محض نماز کی امامت نہیں جیسا کہ آج کل اکثر لوگ سمجھتے ہیں۔ امامت مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ امت پر اس کا انتخاب چھوڑ دیا جائے اور امت کے بنانے سے کوئی شخص امام بن جائے' بلکہ وہ دین کا ایک اہم رکن اور اسلام کا بنیادی عنصر ہے۔ اور نبی کے فرائض میں سے ہے کہ امام کا انتخاب امت پر چھوڑنے کے بجائے خود حکم صریح اسکو مقرر کرے۔

۲۔ امام کا معصوم ہونا لازم ہے' یعنی وہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک و محفوظ ہو' اس سے غلطی کا صدور جائز نہ ہو اور ہر قول و فعل جو اس سے صادر ہو بر حق ہو۔

۳۔ حضرت علیؓ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ نے اپنے بعد امام نامزد کیا تھا اور وہ بربنائے نص امام تھے۔

۴۔ ہر امام کے بعد نیا امام لازماً اپنے سے پہلے امام کی نص پر مقرر ہو گا کیونکہ اس منصب کا تقرر امت کے سپرد ہی نہیں کیا گیا ہے۔

۵۔ شیعوں کے تمام گرہوں کے درمیان اس بات پر اتفاق ہے کہ امامت صرف اولاد علیؓ کا حق ہے۔[1]

اب ہم مورخین کے چند بیانات نظر قارئین کر رہے ہیں ملاحظہ فرمایئے:

ابن واضح یعقوبی کا بیان ہے کہ

"اسی طرح رسالتمآبؐ نے حضرت علیؓ کی شان میں بہت سے مواقعوں پر آپ کے خصوصی امتیازات و فضائل اصحاب کے سامنے بیان فرمائے اور اسی طرح حضرت علی نے بہت ہی گرانبہا خدمات انجام دیں۔ حضرت علی کے ساتھ رسول خدا کی بے پناہ محبت والفت کو دیکھتے ہوئے رسول اللہ کے اصحاب میں سے ایک بڑی تعداد کو ان کی فضیلت اور حقیقت کا شیفتہ بنادیا تھا۔ وہ آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کی پیروی اور اطاعت کرنے لگے۔ یہی لوگ شیعہ کہلائے۔ یہ اصحاب پیغمبر اکرم کی جانشینی اور علمی رہبری کو حضرت علی کا حق جانتے تھے اور دوسروں کو حضرت علی کی طرف دعوت دیتے تھے۔" (تاریخ یعقوبی ص: ۱۰۵ ج: ۲)

[1] الملل والنحل ص: ۱۰۸'۱۰۹ ج: ۱ طبع لندن

محمد کرد علی نے اپنی کتاب "خطط الشام" میں لکھا ہے جسے شیخ محمد حسین مظفر نے نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"کبار صحابہ میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو عہد نبی میں علی کا فدائی تھا اور محبت علی ہی ان کا امتیازی نشان بن گئی تھی۔ جس کے ذریعہ ان کا تعارف ہوتا تھا۔ جیسے سلمان فارسی جن کا یہ قول تھا کہ علی بن ابیطالب جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ ناصح تھے ان کی پیشوائی اور سرپرستی پر رسول اللہ سے بیعت کی تھی۔ اور ابو سعید خدری جو کہتے تھے کہ لوگوں کو پانچ چیزوں کا حکم دیا گیا جس میں چار پر تو عمل کیا گیا اور ایک کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ چار چیزیں کون ہیں (جن پر عمل کیا گیا) تو فرمایا نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج۔ پوچھا وہ ایک چیز جسے چھوڑ دیا گیا وہ کیا ہے تو فرمایا ولایت علی ابن ابیطالب' لوگوں نے پوچھا کیا یہ بھی ان چیزوں کیساتھ فرض کی گئی تھی۔ ابو سعید نے کہا ہاں یہ بھی ان چیزوں کے ساتھ واجب کی گئی ہے اور مثل ابوذر غفاری' عمار بن یاسر' حذیفہ یمانی' ذوالشہادتین' ابوایوب انصاری' خالد بن سعید اور قیس بن سعد بن عبادہ ہیں۔ یہ کہنا جیسا کہ بعض (متعصب اور دریدہ ذہنوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ شیعہ مذہب عبداللہ بن سبا کی بدعت ہے۔ یہ خیال محض وہم' ناواقفیت اور شیعہ و شیعت کی حقیقت سے بے خبری اور جہالت کی بنا پر ہے۔"
(تاریخ شیعہ ص: ۹)

علامہ جلال الدین سیوطی نے تحریر فرمایا ہے کہ

"ابن عساکر نے جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ حضرت رسول خداؐ صلعم کے پاس بیٹھے تھے کہ جناب امیر سامنے سے نمودار ہوئے حضرت رسولؐ خدا نے دیکھتے ہی فرمایا خدا کی قسم

جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ اور اس کے شیعہ یقینی قیامت کے دن فائز المرام ہوں گے۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

ترجمہ : بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے یہی لوگ بہترین خلائق ہیں (البینۃ آیت : ۷)

اس دن سے اصحاب رسول جب حضرت علیؑ کو آتا دیکھتے تو کہتے "خیر البریۃ" آیا۔ اور ابن عدی اور ابن عساکر نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن خوش و پسندیدہ ہیں۔" (تفسیر درمنثور ص : ۳۷۹ ج : ۶)

ایک حدیث خود حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ :

"رسولؐ خدا نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے آیت ان الذین آمنو (۹۸ : ۷) نہیں سنی؟ اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں جن کی وعدہ گاہ حوض کوثر ہے جب کہ تمام امتیں حساب کے لئے لائی جائیں گی تو اس وقت تم غرّ المحجلین کے نام سے بلائے جاؤ گے۔"

(غایۃ المرام ص : ۳۲۶)

علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے تحریر فرمایا ہے کہ

"اس دعوے میں شیعہ منفرد نہیں بلکہ جمہور اسلام کے رواۃ اور محدثین اور علمائے اعلام بھی شریک نظر آتے ہیں۔ احمد بن حنبل، سیوطی، ابن حجر، زمخشری، نسائی، ابن اثیر وغیرہ فحول علمائے اکرام نے ابن عباس اور حضرت علیؑ وغیرہ سے یہ روایت کی ہے کہ جناب پیغمبر اسلامؐ حضرت امیر المومنینؑ کو فرمایا کرتے تھے یَا عَلِیُّ اَنْتَ وَشِیْعَتُكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ترجمہ : یا علی : تم اور تمہارے

شیعہ قیامت کے دن کامیاب و کامران ہوں گے۔ ان علماء کے علاوہ اہلحدیث نے بھی اس حدیث کو مختلف طرق سے بیان کیا ہے۔ تاریخ و حدیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے عہد نبوی میں صحابہ کرام کا ایک گروہ جناب امیر کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرت امیر علیہ السلام کو اپنا روحانی پیشوا، تعلیم رسول کا حقیقی مبلغ نیز احکام و اسرار نبوت کا واقعی شارح اور مفسر تسلیم کرتا ہے اور شیعہ کے نام سے شہرت پاتا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی سے نفس رسول کیساتھ تھی مگر پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد سیاسی مناقشات کے دور میں اور بھی بہت سے صحابہ اکرام نے آپکی معیت اختیار کر لی۔ سلمان، عمار، ابوذر، مقداد، حذیفہ، ذوالشہادتین اور ابو ایوب انصاری ایسے قریباً اسی سربرآوردہ اور بعد میں خصائص شیخ صدوق کی روایت کے مطابق بارہ ہزار صحابی بدری اور عقبی مہاجرین و انصار ایسے تھے جو حضرت ابوتراب کی حمایت میں شامل ہو گئے اور ان میں اکثر نے جنگ جمل اور حرب صفین میں اپنی اپنی جانیں نثار کیں۔"

(ماخوذ از اصل اصول ...)

مذکورہ بالا بیانات سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ نہ صرف حیات رسالتمآبؐ میں شیعوں کا وجود اور ان میں سے کچھ معروف شیعان علیؑ کے ناموں کا بھی علم ہوا بلکہ ان شیعوں کی بابت رسالتمآبؐ کی مدح اور انکے جنتی ہونے کی خوشخبری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال سے بڑھ کر کیا کوئی ثبوت ممکن ہے؟ ہر مسلمان یہی جواب دے گا ہرگز نہیں۔ اسکے بعد بھی اگر کوئی شک میں مبتلا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ ذرا غور فرمائیے کیا حادی عالم جنت کی بشارت ابن

سبا کے گروہ کو دے رہے ہیں؟ وہ ابن سبا جس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں بلکہ ایک فرضی نام ہے۔ بہر حال جناب رسالتمآبؐ نے یہ بشارتیں اس وقت دیں جب شیعہ کے علاوہ کوئی دوسرا فرقہ بظاہر موجود نہ تھا۔

بہر حال حضرت نوح علیہ السلام کے وقت میں جس شیعیت کی ممدوح طریقہ سے داغ بیل پڑی تھی اسکی نشو و نما انبیاء کرام کی حقانیت کے سایہ میں ہوتی رہی اور انھیں کی زیر نگرانی یہ شجر طیبہ بارآور ہوا جسے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریاضتوں اور دعاؤں نے سرسبز و شاداب رہنے کا سامان مہیا کر دیا۔ اب انشاء اللہ یہ شجر طیبہ روز محشر تک سارے عالم میں پھولتا اور پھلتا رہے گا۔

جناب آغا سلطان مرزا نے امام پنجم کا ارشاد تحریر فرمایا ہے جو ہم سب کے لئے قابل توجہ ہے ملاحظہ کیجئے۔

"حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم ہمارے شیعہ صرف وہ ہیں جو احکام الٰہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص محض اپنے منہ سے کہہ دے کہ میں اہلبیت رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں۔ قسم خدا کوئی ہمارا شیعہ نہیں ہے سوائے اس شخص کے جو خدا کی اطاعت کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے (اور ہم سے محبت کرتا ہے) ہمارے شیعوں کی علامتیں یہ ہیں :

(۱) تواضع و فروتنی (۲) خشوع (۳) ترک خیانت (۴) کثرت ذکر خدا (۵) صوم (۶) صلوٰۃ (۷) والدین سے حسن سلوک (۸) فقراء و مساکین، قرضداروں اور یتیموں کیساتھ نیکی کرنا (۹) قول کا سچا ہونا (۱۰) تلاوت قرآن (۱۱) لوگوں کی برائی سے اپنی زبان کو روکنا (۱۲) دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان دیانتدار اور امین ہونا۔

جناب محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کی قربت صرف اطاعت

الٰہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ پس تم میں سے جو خدائے تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا پابند ہے اس کو ہی ہماری محبت فائدہ پہنچا سکتی ہے اور تم میں سے جو خداوند تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس کو ہماری محبت فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ دیکھو تم دھوکہ نہ کھاؤ۔ وہ لوگ جو شیعان اہلبیت منہ سے کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں اس پر غور کریں شیعان اہلبیت کے اوصاف و حقوق تو بہت ہیں اور جنت ان کے لئے یقینی ہے لیکن شیعہ ہونے کی شرائط بھی تو پوری کریں۔

(نور المشرقین من حیات الصادقین ص : ۴۱۴)

عقائد شیعہ امامیہ : جہاںتک مذہب شیعہ اثناء عشریہ کا تعلق ہے تو یہ امر قابل غور ہے کہ بنیادی عقیدہ جملہ مسلمانوں کا خواہ وہ شیعہ ہوں، سنی ہوں یا وہابی ہوں سب کا ایک ہی ہے۔ سب اپنے آپکو مسلمان ہی کہتے ہیں اور تمام مسلمان اللہ وحدہ لاشریک پر، اسکے فرشتوں پر، اسکی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ سب مسلمان جنت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ روز محشر اللہ تعالیٰ سب مُردوں کو زندہ کر کے جزا و سزا کیلئے جمع کرے گا۔ اسی طرح سب مسلمان خدا کی کتاب قرآن مجید پر بھی متفق ہیں اور سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔ سب مسلمانوں کا قبلہ ایک ہے، سب کا دین ایک ہے لیکن پھر بھی ان مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہے۔ جو اسلام کے دعویداروں کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔

دین کے نام پر فرقے بندیاں پھر ان فرقوں کی بقا و فروغ کے لئے آپس میں جنگ و جدل اور فساد، جس کا آئے دن مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہر فرقے کی عبادت گاہیں الگ الگ ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ ایک فرقہ کا پیرو دوسرے فرقہ کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جا کر اس خدائے وحدہ

لاشریک کا نام لے سکے جس کی عبادت وبندگی کا تمام مسلمان دم بھرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک فرقہ کی عبادت گاہ دوسرے فرقہ والوں کی نظروں میں کوئی اہمیت واحترام نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بسااوقات مذہب کے نام پر دوسرے فرقے کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ درآنحالیکہ قرآن مجید فرقان حمید کی تعلیم تو یہ ہے کہ

"اور (غور کرو کہ) اُس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اُس کا نام لئے جانے سے (لوگوں کو) روکے اور انکی بربادی (ویرانی) کے درپے ہو۔ (جن لوگوں کے ظلم وشرارت کا یہ حال ہو یقیناً) ایسوں کا خدا کی عبادت گاہوں میں جانا مناسب نہیں بجز اس حالت کے (کہ وہ دوسروں کو اپنی طاقت سے ڈرانے کے بجائے خود اللہ کی طاقت سے ڈرے) اور سہمے ہوئے ہوں۔ (یاد رکھو) ایسے لوگوں کیلئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب ہے۔" (سورۃ البقر آیت : ۱۱۴)

درجات قوت عقلیہ : اسلام کے لفظی معنی اطاعت' حکم الٰہی کے آگے بلاچوں وچرا جھکا دینا ہے۔ جب کہ اسمائے باری میں سے خدا کا ایک نام سلام بھی ہے۔ دین اسلام انسان کو دین ودنیا کے خطرات سے بچانے کیلئے ایک مکمل قانون ہے۔ یعنی اسلام وہ مذہب ہے جو انسان کی حقیقت اور اس کے اغراض آفرینش کو ظاہر کر کے خدا پرستی اور مالک حقیقی کی رضاجوئی کی راہیں بتاتا ہے تاکہ انسان اس مرتبہ کمال وسعادت کو پہنچ جائے جو نفس بشری کو بالطبع مطلوب ہے اور یہی وہ مذہب ہے جس کی ابتدائی تعلیم وتلقین حضرت آدمؑ نے کی اور تمام انبیاء واوصیاء اس کی ہدایت کے لئے معیّن ہوئے۔ اور آخر میں جناب ختمی مرتب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی مقرر کئے گئے۔

اسلام کے اصل اصول توحید اور نبوت ہیں۔ توحید ہمیشہ ایک ہی حیثیت سے ثابت وقائم ہے جبکہ نبوت حسب اضافت ہر پیغمبر کے عہد میں اس سے منسوب ہوتی رہتی ہے۔ توحید کی تعریف نبی آخرالزماں نے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (نہیں ہے کوئی خدا سوائے اللہ کے) کہہ کر فرمائی۔ اللہ اسم ذات اس واجب الوجود کا ہے جس کے قدرت واختیار میں ہر چیز داخل ہے۔ خالقیت ومخلوقیت کی عقدہ کشائی کیلئے یہ پہلی شہادت ہے جس کا اقرار کرنے کے بعد خیال آزادی وصنم پرستی کی گنجائش صحیح وسالم دماغ میں نہیں ہو سکتی۔ اور نبوت کی معرفت کلمہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (محمد بھیجے ہوئے اللہ کے ہیں) سے ہوتی ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ مالک حقیقی نے ہدایت بندگان اور اصلاح وتکمیل نوع بشری کیلئے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبلغ توحید ومعلم قانون اور مفرق حق وباطل مقرر فرمایا۔ اس مفہوم سے واضح ہوا کہ خدا کی خدائی کے ساتھ رسالتمآبؐ کی پیشوائی لازم وملزوم ہوگی اللہ کی شہادت اور رسول اللہ کے اقرار کے بعد ہم اسلام میں داخل ہو کر مسلمان کہلائیں گے اور یہ درجات قوت عقلیہ کا پہلا درجہ ہے۔

کلمہ شہادت کا زبانی اقرار جو ظاہری پابندی ہے غیر مستقل اور نامکمل ہوگی جب تک باطن بھی تعمیل احکام الٰہی کا خوگر نہ ہو اور قلب جو کہ سلطان مملکت بدن ہے اپنے حرکات ارادی میں اس قانون کے عمل پر آمادہ نہ ہو جائے تاکہ ظاہر وباطن میں فرق نہ رہے بلکہ ظاہر راز دل کا آئینہ ہو جائے اور ہر قول وفعل اختیاری رہے نہ کہ اضطراری۔ یہ قوت عملیہ کا دوسرا درجہ ہے جس پر ترقی کرنے سے ایک مسلم لقبِ مومنیت کا سزاوار ہوتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے معنی حفظ وامن کے ہیں اور وہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اولاً اقرار باللسان یعنی زبان سے اقرار کر کے اسلام قبول کیا جائے ثانیاً عمل بالارکان یعنی قواعد اسلام کے موافق عمل کیا جائے ثالثاً

تصدیق بالجنان (قلب) یعنی دل سے قوانین اسلام کی تصدیق کی جائے۔ یہی تعریف ایمان کی ہے۔ اور انہی حالات کی کمی بیشی سے ہر شخص کے مدارج ایمان جدا جدا مقرر ہوتے ہیں۔ اور یہ درجات قوت عقلیہ کا دوسرا درجہ ہے۔

جب انسان ایمان کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر قوت عملیہ کا تیسرا درجہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی وہ حالت کہ دل کو علم وحکمت کا ایسا منظر بنایا جائے جس میں معرفت کی شعاعیں پڑنے لگیں اور ان مصلحتوں سے ماہر ہو جائے جو اس کے حرکات ارادی کے صحت وسقم' حسن وقبح' خیر وشر اور حق وباطل سے متعلق ہیں۔ یہ درجہ علوم عقلیہ حاصل کرنے سے میسر ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان مصنوعات سے صانع اور مخلوقات سے خالق کا پتہ لگا کر اپنے آپ کو اور اپنے مالک کو نہ پہچان لے اور بقدر طاقت بشری قانون قدرت کی مصلحتوں سے واقف نہ ہو جائے اس وقت تک اپنے فرائض کو بدرجہ اتم واکمل انجام نہیں دے سکتا۔ جس قدر موجودات عالم کی نوعیت وماہیت' صنایع وبدایع' عجیب وغریب ترکیبیں' منافع ومضار' عبرت خیز آثار اور حیرت انگیز کرشمے معلوم کئے جائیں گے اسی قدر واجب الوجود کی معرفت اور اپنے فرائض کی معلومات بڑھتی جائیں گی لیکن ممکنات متنوع اور ان کے حقائق کی باریکیاں وپیچیدگیاں اس درجہ ہیں کہ انسانی قوتیں تحقیقات کرتے کرتے صرف ہو جاتی ہیں اور عمر طبعی ختم ہو جاتی ہے مگر پھر بھی عقلاء وحکماء وسالک ومرشد طفلِ دبستان ہی رہتے ہیں اور بالآخر اپنے عجز ونقصان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خالق کی معرفت کجا ادنیٰ ترین مخلوق کی بھی حقیقت وماہیت کو تمام وکمال دریافت کرنے سے قاصر رہے۔ مگر علم وعمل کی برکت اور توفیق ایزدی سے اس بحر ناپیداکنار کے غوطہ خور دُرِّ مراد لے ہی آتے ہیں۔ انھیں کو اصطلاح حکمت میں حکیم کامل' اصطلاح مذہب میں ولی اور اصطلاح تصوف میں مرشد کہتے ہیں۔ یہی حضرات بقدر علم وعمل ان

مدارج پر ممتاز ہوتے ہیں جن کا نام نبوت' رسالت' امامت اور ولایت ہے۔ اور بہ اعتبار اندازہ خدمات رب ذوالجلال ان کو مختلف خطابات سے ملقب فرماتا ہے۔ چنانچہ کسی کو صفی اللہ کا لقب ملا' کوئی نبی اللہ کہا گیا' کسی نے خلیل اللہ کا خطاب پایا کوئی کلیم اللہ کہلایا' کوئی روح اللہ کہہ کر مخاطب کیا گیا' کوئی حبیب اللہ کے لقب سے ملقب ہوا' کوئی ولی اللہ کے نام سے شرفیاب ہوا اور کوئی حجت اللہ کے اسم سے موسوم ہوا۔ الغرض جب یہ مراتب حاصل ہوتے ہیں تو ان حضرات کی قوت عملیہ اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ اپنے ارادات ومرادات کو رضاء الٰہی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنی ذات' ارادہ اور خواہش کے پابند نہیں رہتے بلکہ قوت قدسیہ وملکوتیہ ان کے اقوال وافعال کی محرک بن جاتی ہے اور انکی چشم دل کے سامنے سے عالم اجسام کا پردہ ہٹ جاتا ہے کہ عالم ملکوت کا نظارہ اور عالم لاہوت کا معارف حقہ حاصل کرتے ہیں۔

پس یہ ہے حقیقت دین اسلام جس کی نسبت باری تعالیٰ نے اپنی کتاب فصل الخطاب میں نہایت وضاحت سے ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ یعنی بہ تحقیق کہ دین جو کہ خدا کا تجویز کردہ وپسندیدہ ہے وہ اسلام ہے۔

علوم شرعیہ : اسلام میں علوم شرعیہ سے مراد وہ علوم ہیں جو شارع علیہ السلام سے صادر ہوئے ہوں۔ انھیں علوم دینیہ بھی کہتے ہیں۔ علوم شرعیہ وہ ہیں جو ازروئے نقل حتماً وجزماً ثابت ہوں اور ان میں عقل کو مداخلت نہ ہو۔ ان علوم کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے کہ علوم اعتقادیہ یا تو نقل سے متعلق ہیں یا منقولات کے سمجھے اور ان کو دلائل سے مستحکم ومضبوط کرنے اور ان سے احکام کو استنباط کرنے سے ہیں۔ پھر یہ کہ نقل کا تعلق اگر ایسے قول سے ہے جو بواسطہ وحی ربانی رسول اللہ تک پہنچا تو اس کو علم کتاب یا علم قرآن کہتے ہیں۔ اور اگر نقل کا تعلق ایسے قول سے ہے جو صاحب نفس طاہر اور

مویدؔ بہ عصمت وطہارت سے صادر ہوا ہے تو اس کو علم روایت الحدیث کہتے ہیں۔ اور منقولات کو سمجھنے کیلئے اگر امور اعتقادیہ کا تعلق کلام خدا سے ہے تو اس کا نام علم تفسیر قرآن ہے۔ اور اگر اس کا تعلق قول صاحب عصمت سے ہے تو اس کو درایت الحدیث کہتے ہیں۔ اور ان امور اعتقادیہ کا تقرر اور ان کو مستحکم و مضبوط کرنا اگر بر بنائے رائے و عقل ہے تو وہ علم اصول دین کہا جاتا ہے اور اگر بر بناء افعال ہے تو اسکو علم اصول فقہ کہتے ہیں اور دلائل اصولیہ سے احکام کا استخراج کرنا اسکو علم فقہ کہتے ہیں۔ ان علوم کے منافع یا تو دنیوی ہیں جیسے حفظِ جان و مال' عزت و انتظام جملہ امور' احوال معاش کا حاصل ہونا ہے۔ یا اخروی ہیں جو عذاب الیم سے موجب نجات اور سبب فوز عظیم ہوتے ہیں۔ الغرض شرع سے مراد قرآن مجید ہے جو کہ ان علوم کا ماخذ ہے۔

دلائل شرعیہ : مذہب شیعہ کے نزدیک اصول فقہ' ادلۂ اربعہ ہیں جن سے معرفت استنباط احکام شرعیہ فرعیہ حاصل ہوتی ہے یعنی شریعت اسلامی میں احکام شرع جاری کرنے کے چار اصول ہیں جو دلائل شریعت یا قانون اسلامی کے ماخذ کہلاتے ہیں جو یہ ہیں اول کتاب' یعنی قرآن جس سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے دوئم سنت' یعنی رسول اللہ کا طریقہ عمل (جس میں آپکا ہر قول و فعل اور تقریر شامل ہیں) اس سے مراد احادیث رسولؐ اور آئمہ اہلبیتؑ ہے۔ سوئم اجماع' یعنی کسی حکم شرعی کے بارے میں تمام علمائے امت کا متفق ہونا جس میں قول امام معصوم بھی داخل ہو۔ چہارم ادلۂ عقلیہ' جیسے استصحاب اصل برائت وغیرہ۔ استصحاب سے مراد وہ حکم ہے جو ایک وقت ثابت کہا جائے اس بنا پر کہ اس سے پیشتر زمانہ میں ثابت ہو چکا ہے۔

پس شریعت اسلامی میں یہی چار اصول احکام شرع جاری کرنے کے ہیں اور جو شخص احکام شرع کو ان ادلہ سے بقوتِ قدسیہ استنباط کر کے جاری کرے اس کو مجتہد کہتے ہیں۔

قرآن : اللہ کا وہ کلام ہے جو خدا نے اپنے رسول سے اس کی زبان میں فرمایا اور بذریعہ وحی آپؐ پر نازل فرمایا۔ چونکہ اس کلام کو اپنے پیغمبر کا معجزہ قرار دینا مقصود تھا لہٰذا بہ حسب کمال فصاحت وبلاغت وسلاست تمام علوم واحکام' عبادات وعقائد' ضروریات معاش ومعاد' واقعات انبیاء سلف ودقایق حکمت و اخبار آئندہ اس میں بیان فرمائے جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ بِتْیَانًا لِكُلِّ شَیءٍ (یعنی نازل کی ہم نے تم پر وہ کتاب جس میں ہر شے کا بیان ہے) تاکہ وہ کلام پیغمبر آخر الزماں کے معجزہ کی ایک مستحکم دلیل ہو۔ پس ایسے کلام کے معانی و مطالب کا عقول ناقصہ میں آنا تفسیر کا محتاج ہے اور لازم ہے وہ تفسیر ان قواعد وطریقوں کے مطابق ہو جن کی تصریح اللہ نے اپنے رسول کو بتادی اور خود صراحت فرمادی کہ مَا یَعْلَمُ تَاوِیلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ۔ (نہیں جانتا تاویل قرآن کی مگر خدا اور وہ لوگ جو پختہ ہیں علم میں) رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ سے مراد وہی حضرات ہیں جن کو ہدایتِ خلق کیلئے علوم قرآنی بتائے گئے' جن کے گھر میں قرآن نازل ہوا اور جو اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔ اس علم کو بجز رسول خدا یا جس کو آپ نے تعلیم دی اور کون جان سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص ان امور میں کلام کرنے کا مجاز نہیں سوائے ان ہستیوں کے جن کو خود رسالتمآبؐ نے حکم خدا ان اسرار کا خازن وامین مقرر فرمایا۔ پس ظاہر ہوا کہ قرآن کی تفسیر حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے سوا دوسرے کیلئے جائز نہیں۔

جبکہ اہلسنت قرآن کی تفسیر اور تاویل کے بارے میں صحابہ اور آئمہ اربع (امام ابو حنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام حنبل) میں سے کسی ایک پر اعتماد کرتے ہیں جس کے باعث باہم اہلسنت میں اور شیعہ و سنی میں اختلاف کا پیدا ہونا لازمی نتیجہ ہے۔

سنت : سنت سے مراد حدیث ہے جس کو اخبار بھی کہتے ہیں۔ سنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول' فعل اور تقریر شامل ہے۔ یعنی سنت کا اطلاق جناب رسالتمآبؐ کے ہر اس قول پر جو آپ نے فرمایا ہو' ہر اس فعل پر جو آپ نے کیا ہو اور ہر اس کام پر جس کی آپ نے اجازت دی ہو (اس سے مراد وہ کام ہیں جن کا آپ کو علم ہو جانے کے بعد آپ نے سکوت اختیار کیا ہو یا اپنی رضامندی ظاہر کی ہو)۔ اس طرح سنت کی تین قسمیں سنت قولی' سنت فعلی اور سنت تقریری ہوئیں۔

علم حدیث وہ علم ہے جس سے جناب رسالتمآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے افعال واحوال کی معرفت حاصل کی جائے کیونکہ بہ اعتبار عصمت وطہارت کُل اقوال وافعال ان حضرات کے داخل حدیث ہیں اور ان کی پیروی بہ غرض حصول سعادت دارین ہم پر لازم ہے۔ موضوع اس علم کا ذات رسول بہ حیثیت آپ کے رسول اللہ ہونے کے اور ذات اوصیاء رسول بہ حیثیت ان کے اوصیاء رسول اللہ ہونے کے ہے۔ الغرض قول و فعل و تقریر رسولؐ و اصیاءِ رسول کو حدیث کہتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت سنت نبوی کے ساتھ خلفائے راشدین یعنی حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی سنت کا بھی اضافہ کرتے ہیں جیساکہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے ترجمہ " تم میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا"۔[1] جبکہ بعض اہلسنت' سنت رسول کے ساتھ سنت صحابہ (بغیر کسی تفریق کے تمام صحابہ) کا بھی اضافہ کرتے ہیں کیونکہ انکے یہاں ایک روایت ہے کہ ترجمہ " میرے اصحاب ستاروں کے مانند ہیں جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے "[2]

[1] مسند امام احمد حنبل ص:۱۲۶ ج:۴ [2] مسند امام احمد بن حنبل ص:۳۹۸ ج:۴ اور صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ

اجماع : مذہب شیعہ کے نزدیک کسی حکم شرعی کے بارے میں تمام علمائے امت کا متفق ہونا جس میں قول معصوم بھی داخل ہو اجماع کہلاتا ہے۔ اجماع کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کسی مسئلہ سے متعلق قرآن و سنت میں سرے سے کوئی حکم موجود ہی نہ ہو یا اگر ہو تو صریح حکم نہ ہو ایسے مسائل میں تغیرات زمانہ اور فقہائے مجتہدین کی آراء کے زیر اثر اجماع اسلامی قانون سازی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

شیعہ اثنا عشری کے نزدیک صرف وہی اجماع معتبر ہے جو یا تو اہلبیت علیہم السلام کے اتفاق رائے سے حاصل ہوا ہو یا مجتہدین کے اتفاق میں کوئی امام معصوم بھی شریک ہو۔ چنانچہ شیعوں کے نزدیک اجماع کی تعریف یہ ہے کہ " آئمہ مجتہدین کے متفقہ فیصلے کی تائید امام معصوم کے قول سے بھی ہوتی ہو نہ یہ کہ صرف مجتہدین کسی رائے پر متفق ہو جائیں "[1]

جب کہ اہلسنت کے نزدیک " کسی حکم شرعی پر کسی زمانہ میں مسلمان مجتہدوں کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے "[2] علمائے اہلسنت میں اس امر پر اختلاف ہے کہ یہ مجتہدین صرف مدینہ کے ہوں یا تمام مسلمان مجتہدین ہوں۔ یہ اجماع صحابہ ہی کا ہو یا خلفائے راشدین کا ہو۔

اصول دین : مذہب شیعہ امامیہ کے عقائد کے مطابق اصول دین پانچ ہیں یعنی اول توحید' دوسرے عدل' تیسرے نبوت' چوتھے امامت اور پانچویں معاد (قیامت)۔ ذیل میں ہم ان اصول دین کا سرسری جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

توحید : رفتہ رفتہ وہ زمانہ گذرتا جاتا ہے جس میں خدا کا وجود ایک مشتبہ امر سمجھا جاتا تھا دورِ حاضر میں علوم نے عموماً عقلوں کو روشن کر دیا اور جدید عملی تحقیقات نے اس شک کو مٹا دیا ہے کہ خدا ہے یا کہ نہیں۔ استدلال کے دو

[1] عناوین الاصول ص:۷ ج:۲' تالیف شیخ محمد مہدی الکاظمی طبع بغداد ۱۳۴۳ھ اور حل العقول لعقد الاصول ص:۶۱' تالیف محمد باقر مرتضیٰ طباطبائی طبع تبریز ۱۲۹۱ھ [2] فلسفہ شریعت اسلام ص:۱۷۷

طریقے ہیں ایک یہ کہ سبب کو دیکھو اور اثر کو سمجھو یا یہ کہ اثر کو دیکھو اور سبب کو سمجھو دوسرے یہ کہ مصنوعات سے صانع کی شناخت اور امارات سے وجود خدا کا اثبات یہ ایسی واضح دلیلیں ہیں جن پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ ذات خداوہی قوت قادرہ و قاہرہ ہے جس کے تحت زمانہ کی تمام قوتیں عاجز و قاصر ہیں اور وقت مصیبت ونزول بلا انسان بے اختیار ہو کر اسکو پکار اٹھتے ہیں۔ خدا کی ذات یکتہ ہے اس جیسا کوئی نہیں وہ ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے۔ وہ وحدہ لاشریک ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ ایسا ایک ہے کہ نہ اس کا باپ ہے جو اس کی عزت میں اس کا شریک ہو نہ اس کے کوئی بیٹا ہے جو کہ اس کا وارث قرار پائے۔ خدا وہ ہے جس میں تمام صفات کمالیہ' جلالیہ و جمالیہ جمع ہیں وہ ہر قسم کے نقص و عیب سے مبرا اور فقر و احتیاج سے منزہ ہے۔ خدا کی صفات دو قسم کی ہیں اول صفات ثبوتیہ یعنی وہ صفات جو خدا کی ذات میں ہر حیثیت سے کامل ہیں انھیں صفات اکرام اور صفات کمالیہ بھی کہتے ہیں۔ دوئم صفات سلبیہ یعنی وہ صفات جو ذات خداوندی کے شایان شان نہیں ہیں انہیں صفات جلال بھی کہتے ہیں۔ ہر دو اقسام کی صفات یہ ہیں :

صفات ثبوتیہ : وہ صفات جو خداوند عالم میں پائی جاتی ہیں :

(۱) قدیم : یعنی خدا واجب الوجود ہے اس پر عدم محال ہے اس لئے ازلی وابدی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۲) قادر : یعنی خدا قادر و مختار ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس کام کو جب چاہتا کرتا ہے۔

۳) عالم : یعنی خدا عالم و حکیم ہے ہر چیز اسکے علم میں ہے کوئی شے اس سے غائب و پوشیدہ نہیں۔

۴) حیٔ : یعنی وہ حیٔ و قیوم ہے زندہ رہنے والا اور قائم رہنے والا ہے

یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۵) مرید : یعنی خدا صاحب ارادہ ہے جب کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسی وقت اس کو پیدا کر دیتا ہے۔

۶) مدرک : یعنی خدا ہر شہ کے ظاہر و باطن کا ادراک رکھتا ہے۔ کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۷) متکلم : یعنی خدا جس چیز میں چاہے کلام کو پیدا کر دیتا ہے۔

۸) صادق : یعنی خدا کا کلام درست و بر حق ہے۔ صادق کی ضد کذب ہے جو قبیح ہے اور باری تعالیٰ ہر قبیح سے منزہ ہے لہٰذا وہ صادق ہے۔

صفات سلبیہ : وہ صفات جو خداوند عالم میں نہیں پائی جاتیں :

(۱) مرکب نہیں : یعنی خدا کسی چیز سے مل کر نہیں بنا اور نہ ہی کوئی اس کا جز ہے۔ مرکب کی نقیض بسیط ہے اور بسیط وہ ہے جسکا کوئی جز نہ ہو۔

۲) جسم نہیں : یعنی باری تعالیٰ نہ جسم ہے نہ عرض نہ جوہر' ورنہ مکان کی احتیاج لازم آتی۔ وہ لامکان ہے۔ وہ اپنی قدرت کاملہ سے ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔ اگر اس کیلئے جسم مانا جائے تو اسے حادث ماننا پڑیگا جبکہ وہ قدیم ہے۔ اگر اسے قدیم بھی مانا جائے اور جسم جو کہ حادث ہے۔ اسطرح دو ضد جمع ہوتی ہیں قدیم اور حادث اور یہ محال ہے۔

۳) محل حوادث نہیں : یعنی باری تعالیٰ مختلف حالات و کیفیات سے بری ہے جیسے بچپن' جوانی' بڑھاپا وغیرہ۔ خدا کا غیر سے متاثر ہونا محال ہے۔

۴) مرئی نہیں : باری تعالیٰ لائق دید نہیں نہ دنیا میں نہ عقبیٰ میں۔ باری تعالیٰ کیلئے رویت بصر یہ محال ہے۔ عدم رویت پر قول باری تعالیٰ ہے لَنْ تَرَانِی (یعنی اے موسیٰ تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو گے) موجود ہے۔ اس صفت باری کی بابت شیعہ سنی اختلاف واضح ہے۔ جسے مختصراً یہاں درج کر رہے ہیں۔

اہلسنت والجماعت کہتے ہیں کہ جنت میں سب مومنین کو رویت باری تعالیٰ نصیب ہو گی۔ ان کی مستند کتب حدیث مثلاً بخاری' مسلم وغیرہ میں ایسی روایتیں مرقوم ہیں جن میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ یہ رویت مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہو گی۔[1] ان کتب میں ایسی روایتیں بھی لکھیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے گویا خدا انسانوں کے مشابہ ہے۔ وہ ہنستا ہے۔[2] چلتا پھرتا ہے اور ساتویں آسمان سے پہلے آسمان پر اتر آتا ہے۔[3] حتیٰ کہ اپنی پنڈلی کھولتا ہے جس پر شناختی علامت بنی ہوئی ہے۔[4] اور یہ کہ جب وہ اپنا ایک پاؤں دوزخ میں رکھے گا تو دوزخ بھر جائے گی۔[5] الغرض ایسی ہی باتیں اور ایسے ہی اوصاف حق تعالیٰ سے منسوب کئے گئے ہیں جن سے وہ پاک و منزہ ہے۔

جبکہ اہل تشیع ان قرآنی آیات کو جن میں تجسیم یا تشبیہ کا شبہ ہوتا ہے انہیں مجاز پر محمول کرتے ہیں حقیقت پر نہیں اور وہ مطلب نہیں لیتے جو ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں حضرت علی کا ارشاد ہے کہ

"نہ ہمتوں کی بلندیاں اس کا ادراک کر سکتی ہیں اور نہ ذہانتوں کی گہرائیاں اس کی تہہ تک پہنچ سکتی ہیں۔ اس صفت ذات کے لئے نہ کوئی معین حد ہے نہ توصیفی کلمات' نہ مقررہ وقت ہے اور نہ آخری مدت۔" (نہج البلاغہ خطبہ اول ص : ۲۷)

اسی خطبہ کے آخر میں فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ

"وہ اپنے پروردگار کے بارے میں شکل و صورت کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے حق میں مخلوقات کی صفات کو جاری کرتے ہیں وہ نہ اسے مکان میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف اشباہ و نظائر سے اشارہ کرتے ہیں۔" (نہج البلاغہ خطبہ اول ص :۳۱)

---

[1] صحیح بخاری ص : ۳۷ ج : ۴' ص : ۱۷۸ ج : ۵' اور ص : ۳۳ ج : ۹' [2] صحیح بخاری ص : ۲۲۵ ج : ۴' ص : ۲۷ ج : ۵' صحیح مسلم ص : ۱۱۴' ۱۲۴ ج : ۱ [3] صحیح بخاری ص : ۱۹۷ ج : ۸' [4] صحیح بخاری ص : ۱۸۲ ج : ۸' [5] صحیح بخاری ص : ۱۸۷ ج : ۸

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ

"ہم چاہے جس چیز کا تصور ذہین میں لائیں اور اس کے بارے میں جتنا بھی سوچیں ہمارے ذہین میں جو بھی تصویر ابھرے گی وہ ہماری طرح کی مخلوق ہو گی۔" (عقائد الامامیہ ۔ شیخ مظفر ص :)

اس سلسلہ میں جناب اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

جو عقل میں گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا ۔۔۔ جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

رُویت' تجسیم اور تشبیہ کے رد میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں خود ارشاد فرمایا ہے کہ لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیٌ یعنی اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ لَاتُدرِکُہُ الاَبصَارُ یعنی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کے علاوہ حضرت موسیٰؑ کے واقعات میں جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش کی تو اللہ نے جواب دیا لَن تَرَانِی یعنی تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ ان قرآنی بیانات سے اقوال تشیع کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

۵) شریک نہیں : یعنی خدا کا کوئی شریک نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے۔ اس صفت باری تعالیٰ پر جملہ مسلمان متفق ہیں۔

۶) حلول نہیں کرتا : یعنی خدا کسی چیز میں حلول نہیں کرتا۔ وہ نہ کسی محل کا محتاج ہے اور نہ کسی جہت میں ہے۔ وہ کسی میں سما نہیں سکتا۔ نصاریٰ باری تعالیٰ کا حضرت عیسیٰؑ میں حلول کرنا اور بعض صوفیا باری تعالیٰ کا بعض عارفین میں حلول کرنیکا عقیدہ رکھتے ہیں جو باطل ہے۔

۷) احتیاج نہیں : یعنی باری تعالیٰ ذات و صفات میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں اسلئے کہ باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی واجب الوجود نہیں ہے۔

۸) صفات زائد بر ذات : یعنی خدا کی صفات اس کی ذات کے سوا علیحدہ نہیں اس کی ذات عین صفات اور اس کی صفات عین ذات ہیں۔

عدل : شیعہ امامیہ کے عقیدے کے مطابق اصول دین میں سے دوسری اصل عدل باری تعالیٰ ہے جس سے مراد باری تعالیٰ کو ارتکاب فعل قبیح و ترک فعل واجب سے منزہ و مبرّا سمجھنا ہے۔ بعض حضرات اہلسنت عدل باری تعالیٰ کو توحید میں داخل سمجھتے ہیں جس طرح اور صفات ثبوتیہ مثلاً قدرت و علم وغیرہ۔ لیکن ایسا ممکن نہیں کیونکہ توحید میں صرف وہ صفات شامل ہو سکتی ہیں جو صفات ذات ہوں۔ اور عدل صفت ذات نہیں بلکہ صفت فعل ہے اس لئے صفات ذات میں عدل کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ اہلسنت کے عقیدے کے مطابق صرف توحید' نبوت اور معاد اصول دین ہیں لہٰذا عدل و امامت کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ فرقہ شیعہ نے ان دونوں (عدل و امامت) کو اصول دین میں داخل کر لیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عدل و امامت کے بغیر دین نامکمل رہتا ہے۔

اصول دین وہ ہیں جن پر دین کی بنیاد قائم ہے اگر ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دیا جائے تو دین کی اصل عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔ عدل باری تعالیٰ سے مراد ہے کہ وہ واجب ترک نہیں کرتا اور فعل قبیح کا ارتکاب نہیں کرتا۔ واجب سے مراد واجب عقلی ہے یعنی جسکے ترک پر عقلاء مذمت کریں۔ عدل باری تعالیٰ کو شیعوں نے اصول دین میں داخل نہیں کیا جیسا کہ اہلسنت کا خیال ہے بلکہ جب سے دین ہے اسی وقت سے عدل اصول دین میں داخل ہے۔

باتفاق مسلمین سجدہ اصول دین میں داخل نہیں ہے اور یہ امر بھی مسلم ہے کہ کسی فروع کے ترک پر دائمی سزا نہیں دی جا سکتی۔ تو پھر ابلیس کو ترک سجدہ پر دائمی سزا کیوں دی گئی اور ہمیشہ کیلئے اس کے گلے میں لعنت کا طوق کیوں ڈالا گیا۔ کیا شیطان نے توحید' نبوت یا معاد میں سے کسی اصول کا انکار کیا تھا۔ قرآن کریم شاہد ہے کہ وہ نہ توحید کا منکر تھا نہ نبوت سے انکاری تھا اور نہ معاد سے انحراف کرتا تھا۔ پھر جب اہل سنت کے اصول

دین میں سے کسی اصل کا انکار نہ کرتا تھا تو وہ دائمی سزا کا مستحق کیوں قرار پایا۔ اگر ایک سجدہ کا ترک کر دینا ہی اس طولانی سزا کا سبب ہے تو اگر کوئی ایک مسلمان صبح کی نماز ترک کر دے تو وہ چار سجدوں کا تارک قرار پائے گا اس کی سزا کتنی ہونی چاہیئے۔

بفرض محال یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ سزا ترک سجدہ ہی کی بناء پر تھی تو باری تعالیٰ نے شیطان سے یہ دریافت کیوں فرمایا" (شیطان ذرا یہ تو بتا) کہ تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا جبکہ میں نے تجھ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا۔" اس ملعون نے جواب میں کہا "میں آدم سے افضل ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو خاک سے" اور افضل کو مفضول کے سامنے جھکانا خلاف عدالت ہے۔ اس جواب کو سننا تھا کہ ارشاد ہوا " فاخرُج " ملعون نکل جا۔ دور ہو جا مجھے غیر عادل سمجھتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ سزا ترک سجدہ پر نہ تھی بلکہ اس ترک سجدہ کے ضمن میں عدل باری تعالیٰ کا انکار تھا۔ عدل باری تعالیٰ کے انکار پر اس کو یہ سزا دی گئی۔

اگر عدل باری تعالیٰ اصول دین میں نہ ہوتا تو شیطان کو دائمی سزا نہ دی جاتی کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ کسی اصول کے انکار پر ہی دائمی سزا دی جاتی ہے کسی فروع کے ترک پر سزا دائمی نہیں دی جا سکتی۔ پس ثابت ہوا کہ عدل باری تعالیٰ اس وقت سے اصول دین میں داخل ہے جس وقت دین روئے زمین پر آیا بھی نہ تھا۔[1]

نبوت : علامہ حلی علیہ رحمۃ نے نبی کی تعریف اسطرح فرمائی ہے کہ " نبی وہ انسان ہے جو باری تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ انسانی خبر پہنچانے والا ہو۔"[2] علامہ کی اس مختصر مگر جامع تعریف سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نبی اس انسان کو کہتے ہیں جو کسی بشر کے واسطہ کے بغیر اللہ کی جانب سے

[1] ماخوذ از احسن العقائد ص: ۱۱۲ [2] احسن العقائد ص: ۱۵۰

خبر پہنچانے والا ہو۔ یہاں علامہ صاحب نے انسان کی قید لگا کر فرشتہ کو تعریف سے خارج کر دیا ہے فرشتہ بھی اللہ کی جانب سے خبر لانے والا ہے لیکن اسکو نبی نہیں کہا جائیگا۔ نیز بلاواسطہ بشر کی قید سے آئمہ اور علماء بھی تعریف نبوت سے خارج ہو گئے۔ اسلئے کہ آئمہ و علماء بھی اللہ کی جانب سے خبر دینے والے ہیں لیکن بواسطہ نبی جو اللہ کی جانب سے خبریں پہنچانے والے ہیں۔

اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث فرمائے لیکن قرآن کریم کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے صرف پانچ نبی یعنی حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں بقیہ تمام پیغمبر انہی اولوالعزم پیغمبروں کی شریعت کے تابع ہیں۔

فرقہ امامیہ کے مطابق :

(۱) نبوت منجانب اللہ ہے یعنی نبی کو اللہ مبعوث فرماتا ہے۔ بندے کسی کو نبی مقرر نہیں کر سکتے۔

(۲) انبیاء کا علم اکتسابی نہیں ہوتا بلکہ وھبی ہوتا ہے یعنی نبی دنیا میں کسی سے علم حاصل نہیں کرتا بلکہ پیدا ہی عالم ہوتا ہے۔ علم نبی کی صفت ذاتی ہے۔

(۳) نبی معصوم ہوتا ہے یعنی انبیاء علیہم السلام تمام گناہان کبیرہ و صغیرہ سے پاک ہوتے ہیں ان سے کسی قسم کا کوئی گناہ نہ عمداً صادر ہوتا ہے نہ سہواً۔ یعنی عصمت کی وجہ سے معصوم ترک طاعت و ارتکاب معصیت نہیں کرتا باوجودیکہ وہ اس پر قادر ہوتا ہے۔ عصمت اللہ کا ایک لطف خفی ہے جو معصوم کو اس کے ملکۂ نفسانی کی وجہ سے عنایت ہوتا ہے۔

(۴) نبی کیلئے ضروری ہے کہ وہ افضل اہل زمانہ ہو اس لئے کہ مفضول کو فاضل پر مقدم کرنا عقلاً و شرعاً جائز نہیں۔

(۵) نبی کے آباء و اجداد اللہ کے دین پر ہوتے ہیں اور ان کی امہات بھی پاکیزہ اور خدا کے دین پر ہوتی ہیں۔ یعنی نبی اخلاقی کمزوریوں اور پیدائشی عیوب سے پاک و صاف ہوتا ہے۔

نبوت سے متعلق شیعہ سنی اختلاف کا بنیادی مسئلہ عصمت پیغمبر کا ہے۔ مذہب شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ جملہ انبیاء و مرسلین خدا کی طرف سے مبعوث و مامور ہوتے ہیں اور یہ سب برحق ہیں۔ جو کتابیں اور صحیفے ان پر نازل ہوئے وہ سب من جانب اللہ ہیں۔ انبیاء بعثت سے قبل ہی معصوم ہوتے ہیں۔ یعنی مہد سے لحد تک تمام گناہان کبیرہ و صغیرہ سے پاک ہوتے ہیں۔ ان سے کسی قسم کا کوئی گناہ نہ عمداً صادر ہو سکتا ہے نہ سہواً بلکہ ترک اولیٰ بھی ہمارے علما کے نزدیک ان سے سرزد نہیں ہوتا۔ انبیاء تمام مذموم صفات اور قابل نفرت امراض مثلاً برص وغیرہ سے مبرا و محفوظ ہوتے ہیں خصوصاً پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابت ان کا عقیدہ ہے کہ آپؐ تمام خطاؤں' لغزشوں اور چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک ہیں۔ آپؐ پاک ہیں ہر غلطی اور بھول چوک سے' سحر و جادو کے اثر اور ہر اس چیز سے جس سے عقل متاثر ہوتی ہو آپ پاک ہیں ہر اس عمل سے جو اخلاق حمیدہ کے منافی ہوں اور آپ پاک ہیں ہر اس فعل سے جو عقلاء کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔

شیعہ نظریہ کے مطابق نبی اس شخص کو کہتے ہیں جسکے تمام انسان اپنے امور معاش اور امور معاد کے محتاج ہوں یعنی نبی دنیاوی و اخروی امور میں ہمارا ہادی ہوتا ہے۔ اور اللہ کے حکم کے مطابق ہم پر اسکی اطاعت لازم ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمَا اَرْسَلْنَامِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ ۔[1]

ترجمہ : اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا لیکن اسلئے کہ باذن خدا اسکی اطاعت کی جائے۔

[1] سورۃ النساء آیت : ۶۴

اس طرح شیعہ عصمت انبیاء کے قائل ہیں جبکہ اہلسنت کے مختلف فرقوں کے مختلف نظریات ہیں مثلاً فرقہ خوارج کے نزدیک انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صدور ہوتا ہے اور ہر گناہ ان کے نزدیک کفر ہے۔ فرقہ حشویہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ کبیرہ کے صدور کو جائز سمجھتا ہے۔ اس فرقہ کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے عمداً گناہ کبیرہ کا صدور نہیں ہوتا سہواً گناہ کبیرہ صادر ہو سکتا ہے اور گناہ صغیرہ کا صدور عمداً ہو سکتا ہے۔ فرقہ اشاعرہ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام سے گناہ کبیرہ نہ عمداً صادر ہوتا ہے نہ سہواً البتہ گناہ صغیرہ کا صدور سہواً ہو سکتا ہے۔[۱]

اہل سنت کا ایک قول یہ بھی ہے کہ جہاں تک کلام اللہ کی تبلیغ کا تعلق ہے بے شک انبیاء معصوم ہیں لیکن دیگر معاملات میں وہ بھی عام انسانوں کی طرح ہیں جن سے غلطی سرزد ہونا ممکن ہے۔ پیغمبر اسلام کے بارے میں متعدد روایتیں کتب احادیث اہلسنت میں ایسی منقول ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی موقعوں پر نبی آخر الزماں نے غلط فیصلے کئے اور صحابہ نے آپ کی اصلاح کی۔

جیسے جنگ بدر کے اسیران کے معاملہ میں رسول اللہ کی رائے درست نہیں تھی جب کہ حضرت عمر کی درست رائے تھی۔[۲] اسی طرح کھجور کے درخت میں گابھا دینے کے واقعہ میں آپ کی بات درست ثابت نہ ہوئی لوگوں نے شکایت کی تو آپ نے کہا "تم اپنے دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔" دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے کہا: میں بھی انسان ہوں، جب میں تمہیں دین کی کوئی بات بتاؤں تو اس پر ضرور عمل کرو مگر جب کسی دنیاوی معاملے میں اپنی رائے دوں تو میں محض انسان ہوں"[۳]

[۱] احسن العقائد ص: ۱۹۱، [۲] البدایہ والنہایہ، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی وغیرہ
[۳] صحیح مسلم ص: ۹۵ ج: ۷، مسند احمد بن حنبل ص: ۱۶۲ ج: ۱

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار آپ پر جادو کر دیا گیا جس کے اثر سے آپ کو یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آپ نے کیا کیا۔ بعض دفعہ آپ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ نے ازواج سے صحبت کی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا تھا۔[۱] یا کسی اور کام کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ یہ کام کیا ہے مگر وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔[۲] اہل سنت کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو نماز میں سہو ہو گیا یہ یاد نہیں رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔[۳] ایک مرتبہ آپ نماز میں بے خبر سو گئے، یہانتک کہ لوگوں نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی، پھر جاگ گئے اور وضوع کی تجدید کئے بغیر نماز پوری کی۔[۴] ایک روایت عبید بن میمون کی سند سے یوں بیان ہے کہ "رسول اللہ نے مسجد میں ایک بینا شخص کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحم کرے اس نے مجھے فلان سورۃ کی فلان آیتیں یاد دلا دیں جو میں بھول گیا تھا۔"[۵]

(نعوذ باللہ من ذالك)

الغرض اسی قسم کی بہت سی روایتیں کتب احادیث کی زینت ہیں جن کو نقل کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے اور شان رسالتمآبؐ سے ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن کا بیان لوگ خود اپنے سے منسوب کرنا پسند نہیں کرتے مثلاً رمضان المبارک میں جنب کی باعث نماز کا فوت ہو جانا۔[۶] یا مثلاً حضرت زینب بنت جحش کو بالوں میں کنگھی کرتے دیکھ کر آپ کا فریفتہ ہو جانا جبکہ وہ زید بن حارثہ کی منکوحہ تھیں۔ یا مثلاً حضرت عائشہ کی جانب دیگر ازواج سے زیادہ طبیعت کا جھکاؤ جس کے باعث دیگر ازواج کا حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت زینب بنت جحش کو آپؐ کے پاس بھیجنا اور عدل کا مطالبہ کرنا[۷] وغیرہ۔ عصمت پیغمبرؐ کی تنقیص سے متعلق اس قسم کی تمام روایتیں

[۱] صحیح بخاری ص: ۲۹ ج: ۷، [۲] صحیح بخاری ص: ۶۸ ج: ۴، [۳] صحیح بخاری ص: ۱۲۳ ج: ۱،
[۴] صحیح بخاری ص: ۳۰۷ ج: ۱، [۵] صحیح بخاری باب شہادۃ الاعمیٰ ج: ۳، [۶] صحیح بخاری ص: ۲۳۲
ج: ۲، [۷] صحیح مسلم ص: ۱۳۶ ج: ۷

امویوں اور انکے حامیوں کی گھڑی ہوئی ہیں جن کا مقصد بنی ہاشم کی تحقیر و تذلیل اور شان رسالتمآبؐ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ایسے بیانات و روایات کی موجودگی میں اگر پنڈت راجپال مردود نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رنگیلا رسول بنا کر پیش کیا تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ یا اس دور میں سلمان رشدی ملعون اور حال ہی میں بنگلہ دیش کی ایک ملعونہ نے رسول مقبولؐ کی شان میں نازیبا لیڑیچر دنیا میں پھیلا تو ان کو یہ مواد کس نے فراہم کیا؟

بحث طویل ہے ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں بنی نوانسان کے معلم کامل کو عملی و عقلی اعتبار سے ناقص قرار دینا کسی طرح بھی دین کے حق میں نہیں۔ جبکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (ترجمہ) رسول تمہیں جو بتلائیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

امامت: علامہ حلی علیہ رحمہ نے امامت کی تعریف یوں فرمائی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں امور دینی و دنیاوی میں ریاست عامہ کا نام امامت ہے۔"[۱] یعنی نائب رسولؐ کی امامت جس طریقہ سے دینی امور میں ہوتی ہے اسی طریقہ سے دنیاوی امور میں بھی ہوتی ہے اور نائب رسول وہ شخص انسانی ہوتا ہے جسے اللہ اور اس کا رسولؐ مقرر و متعین فرماتے ہیں ہر شخص امام نہیں ہو سکتا۔ امامت سے مراد مسلمانوں کی امامت کبریٰ ہے جس سے متعلق رسول اکرمؐ ختمی مرتبت نے کہیں امامت، کہیں خلافت، کہیں ولایت اور کہیں امارت سے تعبیر کیا ہے لہٰذا امامت کبریٰ اپنے وسیع مفہوم میں خلافت و حکومت و قیادت و ولایت کا مجموعہ ہے۔ امامت سے مراد محض نماز کی امامت نہیں ہے جیسا کہ لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں۔

[۱] احسن العقائد ص: ۲۲۲

مذہب شیعہ میں امامت کو خصوصی اہمیت ہے جس کے باعث امامت اصول دین میں شامل ہے اور ایک اصل ہے۔ ایک زمانہ میں صرف ایک ہی امام ساری امت کیلئے ہوتا ہے۔ اور امامت خیر الامت کی قیادت فراہم کرتی جس کے متعدد فضائل ہوتے ہیں مثلاً علم، حلم، شجاعت، نزاہت، عفت، زہد، تقویٰ وغیرہ۔

امامت کے وجوب کی بابت مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ خوارج کا نظریہ ہے کہ نصب امام نہ خدا پر واجب ہے اور نہ بندوں پر۔ فرقہ اشاعرہ اور معتزلہ کے نزدیک نصب امام بندوں پر واجب ہے یعنی بندے جس کو چاہیں امام بنالیں۔ فرقہ اشاعرہ کے نزدیک یہ وجود سمعی (شرعی) ہے اور فرقہ معتزلہ اس کو وجود عقلی تصور کرتے ہیں۔ جبکہ فرقہ امامیہ اثناء عشریہ کے نزدیک نصب امام اللہ تعالیٰ پر واجب ہے وہ اپنے برگزیدہ بندوں میں سے جسے چاہے منتخب فرمائے۔ اور یہ وجوب عقلی ہے۔ وجوب نصب امام کی بابت علامہ تفتازانی کا بیان ہے کہ

"ترجمہ: پھر اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ نصب امام واجب ہے اختلاف صرف اس بارے میں ہے کہ نصب امام اللہ پر واجب ہے یا بندوں پر اور وجوب عقلی ہے یا سمعی۔ مذہب اہل سنت اشاعرہ یہ ہے کہ نصب امام بندوں پر واجب ہے اور یہ وجوب سمعی ہے جس کی دلیل جناب رسالتمآب صلعم کا یہ قول ہے کہ جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانتا ہو وہ کفر کی موت مرتا ہے۔ اسی لئے امت نے نصب امام کو دفن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مقدم رکھا۔" (شرح عقائد للنسفی ص: ۱۳۹ بحوالہ احسن العقائد ص: ۲۲۶)

جن مسلمانوں کے نزدیک نصب امام کا تعلق بندوں سے نہ تھا وہ نصب امام کے فریضہ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ فریضہ دفن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم میں شریک رہے۔ الغرض مذکورہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوا کہ اہل سنت بھی امت کی قیادت کیلئے وجوب امامت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن لوگ جس کو چاہیں اپنا امام و قائد بنالیں چنانچہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکر کو اپنا امام بنالیا۔

اس کے برعکس شیعہ اثناء عشریہ کا عقیدہ ہے کہ امامت ایک خدائی منصب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے جسے منتخب کرتا ہے اسے عطا کردیتا ہے۔ چنانچہ اس منصب کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کو منتخب کر کے بذریعہ وحی اپنے رسول سے کہا کہ علیؑ کی امامت کا اعلان کرو للہذا اللہ کے رسولؐ نے غدیر خم کے مقام پر وسیع مجمع کے روبرو لفظاً و عملاً حضرت علیؑ کے تقرر امامت کا اعلان فرمایا اور مسلمانوں نے مبارک باد کی شکل میں حضرت علیؑ کی بیعت کی۔

وجوب: وجوب امامت پر رسالتمابؐ کی واحد حدیث "مَنۡ مَاتَ وَلَمۡ یَعۡرِفۡ الخ" میں یہ چند امور غور طلب ہیں۔

۱) ایک وقت میں تمام دنیا کے لئے ایک ہی امام ہو سکتا ہے۔
۲) ہر زمانہ میں امام کا وجود ضروری ہے اگر کسی زمانہ میں امام موجود نہ ہو تو اس زمانہ والوں کی موت کفر کی موت ہوگی۔
۳) نصب امام کا تعلق بندوں سے ہرگز نہیں ہے۔
۴) امام کیلئے حضور ضروری نہیں بلکہ غیبت بھی ہوسکتی ہے۔
۵) شیعہ امامیہ کے مسلک میں امامت اصول دین میں داخل ہے۔ اس لئے کہ رسالتمابؐ نے عدم معرفت امام زمانہ کی حالت میں مرجانے کو کفر کی موت فرمایا ہے اور باتفاق مسلمین فروع دین میں سے کسی فروع کی عدم معرفت کی حالت میں مرنا کفر کی موت نہیں ہے۔

عصمت: مذہب امامیہ اثناء عشریہ عصمت امام کے قائل ہیں یعنی امام کا

معصوم ہونا لازمی ہے جبکہ مذہب اہل سنت کے مطابق عصمت شرط امامت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے الطاف میں معصوم اور غیر معصوم دونوں شریک ہیں لیکن معصوم کو اس کے ملکۂ نفسانیہ کے باعث ایک مخصوص لطف عنایت ہوتا ہے جسے عصمت کہتے ہیں۔ عصمت کی وجہ سے معصوم اطاعت کو ترک نہیں کرتا اور معصیت کا مرتکب نہیں ہوتا حالانکہ وہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت پر قادر ہوتا ہے۔ اور چونکہ امام شرع کا محافظ ہوتا ہے لہٰذا محافظِ شریعت کا معصوم ہونا لازم و ضروری ہے۔

نص: امام کیلئے ضروری ہے کہ وہ منصوص من اللہ ہو یعنی نص کے ذریعہ امام کا تعین کیا گیا ہو۔ چونکہ عصمت ان امور باطنیہ میں سے ہے جس پر اللہ کے سوا کوئی مطلع نہیں ہوتا لہٰذا امام کا تعین بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

فضیلت: امام کا افضل امت ہونا ضروری ہے اگر امام افضل نہ ہوگا تو اطاعت تامہ حاصل نہ ہوگی جس کے باعث نصب امام ختم ہوجائیگا کیونکہ تقدیم مفضول علی الفاضل لازم آئے گی یعنی فاضل کے ہوتے ہوئے مفضول کو مقدم کرنا جو عقلاً قبیح ہے۔

معاد: معاد کے لفظی معنی جائے واپسی ہے کتب آسمانی کی بنیاد پر قائم ہونے والے تمام مذاہب کے نزدیک معاد سے مراد آخرت ہے یعنی ہر چیز ایک روز فنا ہوجائے گی اور پھر روز آخرت باری تعالیٰ بندگان خدا کو دوبارہ زندہ کریں گے اور انھیں اجسام موجودہ میں روحیں داخل ہونگی۔ پھر ان سے ان کے اعمال کی بازپرس کی جائے گی جو انہوں نے اس زندگانی دنیا میں کئے ہیں۔ یہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کا تعلق محض خدا اور بندہ کے درمیان ہے یعنی اللہ کی اطاعت و معصیت سے متعلق ہیں۔ دوسرے وہ افعال جو مخلوق کے مقابل ہیں یعنی باہم بندگان خدا کی ایذا دہی و راحت رسانی سے متعلق ہیں۔ ہر دو اقسام کے اعمال کی سزا و جزا ضرور دی جائے گی اس طرح کہ نیکی

کے عیوض عیش دائمی ہوگا جس کا نام بہشت ہے اور بدی کا ثمرہ عذاب الیم ہوگا جس کا نام دوزخ ہے۔ بہشت سے مراد جائے سلامتی وبقائے دائمی اور مقام راحت و سرور جاودانی ہے اور دوزخ سے مراد جائے عذاب و عتاب و مقام شدائد و مصائب ہے۔

چونکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا و سزا دی جائے گی جس کے لئے معاد جسمانی لازم آتی ہے اور معاد جسمانی حق ہے جس کا وقوع ہونا یقینی ہے۔ قرآن کریم میں معاد جسمانی کے ثبوت اور منکرین معاد جسمانی کی تکذیب پر دلالت کرنے والی متعدد آیات موجود ہیں۔ اسی طرح جنت و دوزخ کی تفصیلات کتب آسمانی میں بیان کی گئی ہیں تاکہ شوق بہشت اور خوف دوزخ سے انسان اپنے افعال و اعمال کو دنیا میں درست رکھے اور آخرت میں ان کے موافق نعمتوں اور زحمتوں کا مستحق قرار پائے چونکہ معاد عقلاً ثابت ہے اور جنت و دوزخ اس کا جزو ہیں لہٰذا وجود بہشت و دوزخ کا یقین لانا عقلاً لازم ہے۔

شیعہ فرقے: دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں بہت سے چھوٹے بڑے فرقے ہوتے ہیں حتیٰ کہ چاروں آسمانی ادیان یعنی یہودیت، عیسایت، مجوسیت اور اسلام میں مختلف مذاہب ہیں اور ہر مذہب میں مختلف فرقے موجود ہیں مثلاً اہل سنت میں چار فقہی فرقے حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی ہیں ان کے علاوہ متعدد فرقے ہیں بقول ڈاکٹر صبحی محمصانی "اہل سنت کے کئی فقہی مذاہب تھے جن کی تعداد دس سے تجاوز کر گئی تھی۔"[1] اصولی مسائل میں ان کے دو بڑے فرقے معتزلہ اور اشاعرہ ہیں۔ معتزلہ اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں اگر کہیں ہوں گے بھی تو بہت ہی کم۔ البتہ تمام اہلسنت اصولی عقائد میں اشعریت کے پیرو ہیں ان کو اشاعرہ کہتے ہیں کیونکہ ان کے عقائد

---

[1] فلسفہ شریعت اسلام ص: ۷۰

کا ماخذ شیخ ابوالحسن اشعری ہیں۔ اسی طرح مذہب شیعہ میں بھی چند فرقے پیدا ہوئے جو آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہوگئے۔ ان فرقوں کے وجود کی بنیاد امام کا تعین اور پیروی تھا۔ ہر فرقے نے حضرت علیؑ کی اولاد میں سے جس کو مناسب جانا اپنا امام تسلیم کرلیا۔

مذہب شیعہ میں پہلے تین اماموں یعنی حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام کے زمانوں میں کوئی فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد شیعوں کی ایک قلیل تعداد نے حضرت علی زین العابدینؑ کے بجائے حضرت علیؑ کے تیسرے فرزند محمد حنفیہ کو اپنا چوتھا اور آخری امام قرار دیا۔ یہ فرقہ "کیسانیہ" کہلایا جو جلد ہی ختم ہوگیا۔

حضرت امام علی زین العابدینؑ کے بعد تمام شیعوں نے حضرت محمد باقرؑ کی بیعت کی مگر ایک مختصر گروہ نے امام محمد باقرؑ کے بھائی حضرت زید شہید کو اپنا امام، ہادی اور رہنما تسلیم کیا یہ فرقہ "زیدیہ" کہلایا۔ حضرت محمد باقرؑ کے بعد آپ کے شیعوں نے آپ کے فرزند حضرت جعفر الصادقؑ کو اپنا امام تسلیم کیا اور حضرت جعفر صادقؑ کے بعد حضرت موسیٰ کاظمؑ کو اپنا امام مانا لیکن ایک قلیل تعداد نے حضرت جعفر صادقؑ کے بڑے فرزند اسمٰعیل، جنکا انتقال آپؑ کی حیات ہی میں ہوگیا تھا کو اپنا امام بنالیا۔ یہ فرقہ "اسمٰعیلیہ" کہلایا۔ ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؑ کے بعد تمام شیعوں نے حضرت محمد رضاؑ کی بیعت کی اور امام تسلیم کیا جبکہ ایک گروہ نے آپ کے بھائی جناب عبداللہ افطح کی پیروی اختیار کرلی۔ بعض نے امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظمؑ کو آخری امام سمجھا۔ لہٰذا ان کو "واقفیہ" کہا گیا۔

اس کے بعد آٹھویں امام سے بارھویں امام حضرت امام مہدی آخرالزمانؑ تک کوئی فرقہ قائم نہیں ہوا۔ اس طرح شیعہ مذہب میں پیدا ہونے والے فرقے تھوڑے عرصہ میں خود بخود ختم ہوگئے۔ البتہ

فرقہ زیدیہ اور اسمعیلہ ابھی تک مختلف ممالک میں موجود ہیں۔ ذیل میں ہم کسانیہ، زیدیہ اور اسمعیلہ فرقوں کی بابت قدرے تفصیل سے تحریر کرتے ہیں۔

کیسانیہ : اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ جناب محمد بن حنفیہ ان کے چوتھے اور آخری امام ہیں۔ وہ لوگ آپ کو مہدی موعود تصور کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ نے وفات نہیں پائی بلکہ یمن کے پہاڑی سلسلہ میں واقع کوہِ رضوی کے ایک غار میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ روپوش و اقامت گذین ہیں۔ اور آخر زمانہ میں ظہور فرمائیں گے۔ درآنحالیکہ جناب محمد حنفیہ نے اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا وہ ہمیشہ اپنے زمانہ کے آئمہ معصومین یعنی حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام علی زین العابدینؑ کی پیروی کرتے تھے۔ فرقہ کیسانیہ کے لوگوں نے آپ کی عبادت و ریاضت، نیک نفسی و دینداری کے پیش نظر آپ کی وفات کے بعد آپ کو اپنا امام تسلیم کیا اور آپ کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ کو ان کا جانشین بنالیا۔ جن کی بابت مورخین نے لکھا ہے کہ ۱۰۰ھ میں وہ اموی حکمران عبدالملک سے ملاقات کیلئے گئے جس نے انھیں کھانے میں زہر دلوادیا۔ جس کے اثر سے وہ راستہ میں ہی مقام حمیمہ میں فوت ہوگئے۔ اپنی وفات سے قبل انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس کے پوتے محمد کو جو اس وقت ان کے ساتھ تھے اپنا جانشین مقرر کیا۔ بہر حال فرقہ کیسانیہ اس کے بعد خود بخود ختم ہوگیا۔ اب اس کا ذکر صرف کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

زیدیہ فرقہ : حضرت علی زین العابدینؑ کے فرزند حضرت زید نے اموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے خلاف کوفہ میں تحریک چلائی۔ شہر کوفہ کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد اس تحریک میں شامل ہوگئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کردیں لیکن اموی فوجوں کے حملہ کے پیش نظر وقت سے پہلے مقابلہ پر مجبور ہوئے۔ کوفہ شہر میں جنگ شروع ہوئی تو بہت سے کوفی

آپکا ساتھ چھوڑ گئے۔ آپ اپنے چند جانثار ساتھیوں کے ہمراہ بڑی بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ آپکی شہادت کے بعد کوفہ والوں نے آپ کو اپنا امام قرار دیا۔ اس ضمن میں شاہ معین الدین ندوی تحریر کرتے ہیں کہ :

"ان (زید شہید) کے قتل کے بعد ان کی اتباع کا ایک مستقل فرقہ پیدا ہوگیا، جو امام زین العابدین کے بعد امام باقرؑ کے بجائے زید کو امام مانتا ہے اور زیدیہ کہلاتا ہے۔ یہ فرقہ اب بھی یمن اور دوسرے مقامات پر موجود ہے۔" (تاریخ اسلام ص: ۲۸۱ ج: ۲)

ان کوفیوں نے حضرت زید شہید کے بیٹے یحیٰی کو آپ کا جانشین قرار دیا۔ یحیٰی نے بھی ۱۲۵ھ میں خروج کیا اور میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد کوفیوں نے محمد بن عبداللہ (محمد نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم کو اپنا امام سمجھا۔ یہ دونوں بھائی بھی یکے بعد دیگرے منصور دوانقی کے فوجوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ اس کے بعد کچھ مدت تک زیدیہ فرقہ منتشر رہا۔ بالآخر حضرت زید شہید کے بھائی عبداللہ الباہر کی نسل میں عبداللہ اطروش (جنہیں بعض نے ناصر اطروش بھی لکھا ہے) نے خراسان میں امامت کا دعویٰ کیا وہاں کی حکومت نے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی تو وہ خراسان سے نکل کر مازندران پہنچ گئے جہاں کے لوگوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہاں انہوں نے تیرہ سال تک اسلام کی تبلیغ کی اور کثیر تعداد کو مسلمان بنا کر زیدیہ فرقہ کا گرویدہ بنالیا تھا۔ پھر انہی لوگوں کی مدد سے طبرستان پر قبضہ کرکے اپنی امامت کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد ان کی اولاد نے کافی عرصہ تک اس علاقہ میں اپنی حکومت اور امامت جاری رکھی۔

زیدیہ فرقے کے عقیدے کے مطابق ہر وہ شخص جو فاطمی نسل سے ہو نیز زاہد و فاضل اور سخی دیار سا بھی ہو اور حق کی خاطر ظلم و ستم کو ختم کرنیکی تحریک چلائے وہ امام ہوسکتا ہے۔ شروع شروع میں زیدیہ فرقے

کے لوگ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو اپنے آئمہ میں شمار کرتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد انہوں نے ان خلفاء کے نام اپنے اماموں کی فہرست سے نکال دیئے اور اپنی امامت کا سلسلہ حضرت علیؑ سے شمار کرنا شروع کیا۔

تاریخی شہادت کے مطابق زیدیہ اصول اسلام میں معتزلہ کا ذوق رکھتے تھے اور تقریباً اسی مذہب کے پیروکار تھے۔ فروعی اور فقہی عقائد میں امام ابو حنفیہ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے درمیان بعض فقہی مسائل کے بارے میں تھوڑا اختلاف تھا۔ [1]

جب کہ ڈاکٹر صبحی محمصانی کا بیان ہے کہ

"زیدیؒ مجتہدین میں یہ مشہور ہیں: حسن بن صالح بن حی (متوفی ۱۶۸ھ)، حسن بن زید بن محمد جن کا لقب الامام الداعی الی الحق تھا اور جو ۲۵۰ھ سے اپنے سن وفات (۲۷۰ھ) تک طبرستان کے بادشاہ رہے، قاسم بن ابراہیم علوی، ان کے پوتے حادی یحیٰی اور ابو جعفر مرادی وغیرہم۔" (فلسفہ شریعت اسلام ص: ۸۱)

زیدی اور زیدیہ : عام طور سے مورخین زیدی اور زیدیہ کے فرق کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر نظر انداز کردیتے ہیں جس کے باعث قارئین میں زیدی سادات سے متعلق غلط تاثر پیدا ہوتا ہے اور لوگ زیدی سادات پر فرقہ زیدیہ سے ہونے کا گمان کرنے لگتے ہیں جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے کیونکہ زیدی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید کے تینوں فرزندان یعنی حسین ذوالدمعہ، محمد اور عیسیٰ موتم الاشبال میں سے کسی بھی فرزند کے توسل سے حضرت زید شہید تک پہنچتا ہو۔ جب کہ زیدیہ وہ اہل کوفہ تھے جنہوں نے حضرت زید بن علی زین العابدین کی شہادت کے

[1] ماخوذ از اسلام میں شیعہ۔ مولفہ علامہ محمد حسین طباطبائی ص ۳۰ یہاں ڈاکٹر صاحب نے زیدیہ کے بجائے زیدی لکھا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے زیدیہ ہی زیدی ہیں جو حقائق کے خلاف ہے

بعد آپ کو اپنا امام تسلیم کیا اور بعد میں وہ عرصہ دراز تک بغیر امام کے رہے جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔

لہٰذا زیدی اور زیدیہ میں واضح فرق یہ ہے کہ زیدی حضرت زید شہید کی نسل سے ہونے کے باعث قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت زید شہید کو امام نہیں مانتے بلکہ اپنے جد کی سنت پر عمل کرتے ہوئے آئمہ معصومین کی پیروی کرتے ہیں۔ جب کہ زیدیہ کوفہ و دیگر علاقہ جات کے وہ باشندے تھے جو بنی ہاشم کے علاوہ دیگر مختلف قبائل سے متعلق تھے اور حضرت زید شہید کو اپنا امام مانتے تھے۔

ہم اپنی زیر تالیف کتاب " زید الشہید " میں اس عنوان کے تحت مزید تفصیل سے بحث کریں گے۔ انشاءاللہ

اسمٰعیلہ فرقہ : اس فرقے کے آغاز کی بابت مورخین نے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کے سب سے بڑے فرزند جناب اسمعیل کو اپنا امام تسلیم کیا گوکہ جناب اسمٰعیل اپنے والد کی حیات ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ جناب اسمٰعیل کو امام ماننے والوں کی ابتداء ہی مختلف نظریات پر تھی۔ ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ جناب اسمٰعیل فوت نہیں ہوئے بلکہ روپوش ہوگئے ہیں وہ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور وہ ہی مہدی موعود ہیں۔ درآنحالیکہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے ان کی وفات کی شہادت دی اور حاکم مدینہ نے اس امر کی تصدیق بھی کی۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے عباسی حکمران منصور کے خوف سے جان بوجھ کر اسمٰعیل کی وفات کی گواہی دی۔ ہمارے خیال میں یہ تصور انتہائی ناقص اور مجہول ہے کیونکہ امام صادقؑ سے اس قسم کی غلط بیانی کسی بھی حالت میں قابل قبول نہیں۔ انہی لوگوں میں سے ایک گروہ کا خیال تھا کہ " اگرچہ اسمٰعیل اپنے والد کی حیات میں فوت ہوگئے ہیں لیکن امامت پھر بھی انہی کا حق ہے اور

اسمٰعیل کے بعد امامت خود بخود ان کے بیٹے محمد کو مل جاتی ہے اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہو گئی ہے۔"

مذکورہ نظریات کے حامیوں میں سے پہلے دو تو تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو گئے جب کہ تیسرے نظریہ کے حامی باقی رہے۔ جو آگے چل کر کئی مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ مجموعی طور پر اسمٰعیلیوں کا فلسفہ ستارہ پرستوں کے فلسفہ سے مشابہ ہے۔ قرآنی معارف اور اسلامی احکام کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کیلئے ایک باطن اور ہر باطن کیلئے ایک ظاہر موجود ہے۔ نیز یہ لوگ ہر تنزیل کی ایک تاویل پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ یہ دنیا ہرگز حجت خدا (یعنی خدا کے نمائندوں' اولیاء اللہ اور اماموں) سے خالی نہیں ہوتی۔ اور حجت خدا دو طرح کی ہے ایک ناطق اور دوسری صامت۔ حجت ناطق تو خود پیغمبر ہیں اور حجت صامت ولی یا امام ہوتے ہیں۔ جو خدا کے مظہر اور خدا کے وصی و جانشین ہوتے ہیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حجت کی بنیاد ہمیشہ سات کے عدد کے گرد گھومتی ہے۔ اس طرح کہ ایک نبی آتا ہے جس کو خدا کی طرف سے نبوت (شریعت) اور ولایت عطا ہوتی ہے۔ اس نبی یا پیغمبر کے سات جانشین ہوتے ہیں جن کو ولایت ملتی ہے ان سب جانشینوں کا یکساں درجہ یا مقام ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ساتواں جانشین نبی بھی ہوتا ہے جس کے تین درجے یعنی نبوت' جانشینی اور ولایت ہیں۔ اس کے بعد پھر جانشینی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور پہلے کی طرح پھر سات جانشین ہوتے ہیں۔ الغرض کبھی ختم نہ ہونے والا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔

اسمٰعیلی کہتے ہیں کہ حضرت آدم نبوت اور ولایت کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ ان کے سات جانشین تھے جن میں ساتویں حضرت نوح تھے جن کو نبوت' ولایت اور جانشینی عطا ہوئی تھی۔ پھر

ابراہیم ساتویں جانشین اور حضرت نوح کے وصی تھے۔ حضرت ابراہیم کے ساتویں جانشین حضرت موسیٰ تھے۔ حضرت موسیٰ کے ساتویں جانشین حضرت عیسیٰ تھے اور حضرت عیسیٰ کے ساتویں جانشین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اسی طرح حضرت محمدؐ کے ساتویں جانشین محمد بن اسمٰعیل تھے۔ حضرت محمدؐ کے جانشین بالترتیب حضرت علیؑ' حضرت امام حسینؑ' حضرت امام علی زین العابدینؑ' حضرت امام محمد باقرؑ' حضرت امام جعفر صادقؑ' جناب اسمٰعیل بن جعفر صادق اور جناب محمد بن اسمٰعیل ہوتے ہیں۔ (یہ لوگ حضرت امام حسنؑ کو اپنا امام نہیں مانتے ہیں) محمد بن اسمٰعیل کے بعد ان کی اولاد سے سات افراد جانشین ہوئے جن کے نام پوشیدہ ہیں۔ اس کے بعد فاطمی بادشاہوں میں سے پہلے سات افراد جن میں سب سے پہلے عبید اللہ مہدی تھے جو فاطمی سلطنت کے بانی ہوئے۔

اسمٰعیلیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ روئے زمین پر بارہ افراد موجود رہتے ہیں جن کو حواری' خواص یا حجت کہا جاتا ہے۔ لیکن اسمٰعیلیوں کے ذیلی فرقے باطنیہ اور دروزیہ ان کی تعداد چھ بتاتے ہیں اور باقی چھ اماموں میں سے لیتے ہیں۔

باطنیہ فرقہ: مورخین کا خیال ہے کہ چونکہ اسمٰعیلیوں کے نزدیک آئمہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک ظاہری اور دوسری ستوری (باطنی یا پوشیدہ) اور ان کے نزدیک ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے اس لئے ان کو باطنی کہتے ہیں۔[1] جب کہ بعض کا خیال ہے کہ باطنیہ فرقے کے لوگ اپنے عقائد اور اپنی دعوت کو دوسروں سے پوشیدہ رکھتے تھے اس لئے انہیں باطنیہ کہا جاتا تھا۔ فرقہ اسمٰعیلیہ کے ذیلی فرقوں یعنی باطنیہ' قرامطہ' ملاحدہ اور فداویہ کو کسی نہ کسی سبب مختلف نام دیئے گئے حالانکہ عقائد اور طریقہ عمل کے اعتبار

[1] الملل والنحل ص: ۲۷ ج: ۲

سے ان میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ باطنیہ اور قرامطہ میں تو اتنی ہم آہنگی تھی کہ مورخین کو یہ طے کرنا دشوار تھا کہ کونسا فرقہ پہلے اور کونسا بعد میں ظاہر ہوا۔ بعض کا خیال تھا کہ باطنیہ فرقہ قرامطہ سے نکلا جبکہ بعض کا کہنا تھا کہ قرامطہ کا ظہور باطنیہ سے ہوا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے تیسری صدی ہجری میں پہلے باطنیہ کی بنیاد بحرین میں پڑی اس کے بعد سلطان ملک شاہ کے دور حکومت میں اس فرقے کی نشوونما ہوئی اور سب سے پہلے اس فرقہ کے حامیوں کا ظہور اصفہان میں ہوا۔ عبدالقادر بغدادی کا بیان ہے کہ

> " ۲۷۱ھ میں قرامطہ کا ظہور ہوا۔ یہ فرقہ باطنیہ کی ایک شاخ ہے اور باطنیت ایران کے مجوسی مذہب سے نکلی تھی۔" (کتاب الفرق بین الفرق ص: ۲۹۹)

باطنیہ فرقے کے ظہور کی بابت ابن اثیر کا بیان ہے کہ

> " فرقہ باطنیہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کے دور حکومت میں عراق' فارس اور خراسان میں ظاہر ہوا"۔ (تاریخ کامل ص: ۲۱۳ ج: ۱۰)

تاریخ میں یہ بھی تحریر ہے کہ حمدان قرمط نامی ایک شخص کوفہ کے نواح میں وارد ہوا جو دن کو روزے رکھتا اور رات عبادت میں گذارتا۔ اپنے ہاتھ سے روزی کما کر کھاتا تھا۔ یہ لوگوں کو اسمٰعیلیہ مذہب کی دعوت دیا کرتا تھا اسکی تبلیغ سے بہت سے لوگ اسکے گرد جمع ہو گئے اس نے اپنے پیروکاروں میں سے بارہ افراد کو اپنا "نقیب" یعنی مبلغ کے طور پر منتخب کیا اور خود کوفہ سے شام کی طرف چلا گیا۔ اس کے نقیب باطنیہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔

باطنیہ فرقے کے گروہ ملاحدہ اور فداویہ کے افراد اپنے مخالفین کی جان و مال کا احترام نہیں کرتے تھے یہ مختلف شہروں اور ملکوں میں بے شمار لوگوں کا قتل عام کیا کرتے تھے اور انکا مال و متاع لوٹ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے کئی بار حاجیوں کے قافلوں پر حملے کئے۔ چونکہ ملاحدہ کا کوئی عقیدہ انکار دین سے خالی نہیں تھا اس لئے یہ ملاحدہ کہلائے۔ جب کہ فداویہ کی وجہ

تسمیہ یہ ہے کہ فدائی کو جس کے قتل پر مقرر کیا جاتا وہ اس کے قتل میں اپنے جان و مال کی پرواہ کئے بغیر اسے قتل کر دیتا تھا اور اپنے شیخ کے حکم پر فدا ہو جاتا تھا۔ شیخ اس کے جنتی ہونے کی دستاویز عطا کرتا تھا۔ فدائیوں کے ہاتھوں ارخان کے قتل کے بعد سلطان جلال الدین نے اپنی زبردست فوج کے ساتھ بلاد اسمٰعیلیہ پر چڑھائی کی اور قلعہ الموت سے کرد کے پہاڑ تک فدائیوں کا صفایا کر دیا جس سے اسمٰعیلیہ فرقے کی قوت ختم ہو گئی۔[1]

قرامطہ: باطنیہ فرقے کے سرکردہ لوگوں میں ایک شخص ابو طاہر قرمطی تھا جس کے نام کی نسبت سے اس کے حامیوں کو قرامطہ کہا گیا۔ ابو طاہر قرمطی نے ۳۱۱ھ میں بصرہ پر قبضہ کر لیا اور ۳۱۷ھ میں ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ زمانہ حج میں مکہ معظمہ پر حملہ کر کے مسجد الحرام اور خانہ کعبہ میں خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس نے خانہ کعبہ کے پردوں کو پھاڑ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کیا اور حجر اسود کو خانہ کعبہ سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ یمن لے گیا جو بائیس سال تک قرمطیوں کے قبضہ میں رہا۔ انہی واقعات کے باعث مسلمانوں نے انہیں دین سے خارج کر دیا۔ یہانتک کہ عبید اللہ مہدی فاطمی جو مصر کا حاکم اور اسمٰعیلیوں کا امام و مہدی موعود کہا جاتا تھا اس نے بھی قرمطیوں سے بیزاری کا اظہار و اعلان کیا۔

عبید اللہ مہدی ۲۹۶ھ میں افریقہ میں ظاہر ہوا اور اسمٰعیلیہ فرقہ کا امام بنا۔ اس نے فاطمی سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور مصر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اسکی سات پشتوں نے فاطمی سلطنت اور اسمٰعیلیہ فرقے کی امامت کی۔ اس خاندان کے ساتویں حکمران مستنصر باللہ کے دو بیٹے نزار اور مستعلی کے درمیان خلافت کیلئے جھگڑا ہو گیا۔ خونریز جنگوں کے بعد مستعلی کو فتح ہوئی اور اس نے اپنے بھائی نزار کو قید کر دیا جو اسیری کے دوران فوت ہو گیا ان جنگوں

[1] تاریخ ابن خلدون ص: ۳۹۶ ج: ۷

کے دوران اسمٰعیلی دو فرقوں میں بٹ گئے جو نزاریہ اور مستعلیہ کہلائے۔
نزاریہ : یہ فرقہ حسن بن صباح کا پیرو ہوا جو مستنصر باللہ کا نزدیکی اور مقرب تھا چونکہ حسن بن صباح نزار کا حامی تھا لہٰذا مستعلی کے حکم سے اسے ملک بدر کردیا گیا۔ وہ پہلے ایران گیا پھر قزوین کے علاقہ میں واقع قلعہ الموت میں چلا گیا جہاں اس نے ایک فوج تیار کر کے گردونواح کے دوسرے قلعوں پر قبضہ کرلیا اور اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔ حسن بن صباح کی موت کے بعد "بزرگ امید رودباری" اور اس کے بعد اس کے بیٹے "کیا محمد" نے حسن بن صباح کے آئین اور طریقے پر حکومت کی۔ اس کے بیٹے "حسن علی ذکرہ اسلام" نے الموت کے چوتھے حکمران کی حیثیت سے حکومت سنبھالی اور حسن بن صباح کے طریقے اور نزاری آئین کو منسوخ کر کے باطنیہ فرقے کی پیروی کی۔ یہانتک کہ ہلاکوں خان تاتاری نے حملہ کر کے اسمٰعیلیوں کے فلک بوس قلعوں کو مسمار کردیا۔

۱۲۵۵ھ میں نزاریہ فرقے کے آغاخان محلاتی نے کرمان کے علاقہ میں تحریک چلائی اور محمد شاہ قاچار سے جنگ میں شکست کھائی اور وہ بمبئی کی طرف چلا گیا۔ جہاں نزاریہ فرقے کی تبلیغ کا کام جاری رکھا اور اپنی امامت کا اعلان کیا۔ نزاریہ فرقے کو اب "آغاخانیہ" فرقہ کہا جاتا ہے۔
مستعلیہ : یہ فرقہ فاطمی بادشاہ مستعلی کے پیروکار تھا اور ان کی امامت فاطمی خلفائے مصر میں ہی باقی رہی جو ۵۵۷ھ میں ختم ہو گئی لیکن بعد میں اس فرقے کے لوگوں نے بر صغیر ہندوستان میں "بوہرہ فرقہ" کی بنیاد ڈالی جو پاک و ہند میں اب بھی جاری ہے۔
دروزیہ : ملک شام کے پہاڑی علاقوں میں دروزیہ کے مقام پر آباد دروزی قبیلہ ابتداء میں فاطمی خلفاء کا پیروکار تھا لیکن محسن دروزی کی تبلیغات کے زیر اثر باطنیہ فرقے سے ملحق ہو گیا۔ دروزیہ فرقے کی امامت الحاکم باللہ

فاطمی خلیفہ پر آکر رک گئی۔ جو دوسروں کے اعتقاد کے مطابق قتل ہو گیا تھا لیکن دروزیہ فرقے کا عقیدہ ہے کہ وہ غائب ہو گیا اور آسمان پر چلا گیا پھر دوبارہ لوگوں کے درمیان آئیگا یعنی امام مہدی کی شکل میں ظہور کریگا۔
مقنع : اس فرقے کے لوگ ابتداء میں عطا مروی المعروف بہ مقنع کے پیروکار تھے۔ مورخین کے قول کے مطابق یہ مقنع ابو مسلم خراسانی کے مریدوں میں سے تھا اس نے ابو مسلم کی وفات کے بعد دعویٰ کیا کہ ابو مسلم کی روح اس کے اندر حلول کر گئی ہے تھوڑے عرصہ بعد اس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور پھر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا جس پر ۱۶۲ھ میں عباسی خلیفہ مہدی نے ماوراء النہر کے علاقہ میں محاصرہ کرلیا۔ جب مقنع کو اپنی گرفتاری اور موت کا یقین ہو گیا تو اس نے آگ جلائی اور اپنے چند پیروکاروں کے ہمراہ اس میں کود گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تیزاب سے بھرے ہوئے حوض میں کود پڑا اس طرح اس کی جسم اور ہڈیاں تیزاب میں حل ہو گئیں جب قلعہ کیش فتح ہو گیا تو مقنع کی لاش کہیں نہیں ملی جس پر اسکے ماننے والوں کو یقین ہو گیا کہ وہی حقیقی خدا تھا جو آسمان پر چلا گیا۔ مقنع کے پیروکاروں نے کچھ عرصہ بعد اسمٰعیلیہ مذہب اختیار کرلیا اور پھر باطنیہ فرقے میں شامل ہو گئے۔
چند حقائق : یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ درندہ صفت طاقتور کمزور پر حملہ کرتا ہے اگر حالات سے مجبور ہو کر وہ حملہ نہ کرپائے تو غراتا ضرور رہتا ہے۔ تاریخ انسانیت عموماً اور تاریخ مذہب خصوصاً اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہب کو ہمیشہ کمزوروں کی حمایت حاصل رہی ہے۔ جبکہ طاقت' دولت اور اکثریت ہمیشہ مذہب کے آڑے آتی رہی ہے پہلے تو یہ طاقتور اکثریت اور اسکے حامی اپنی مقابل کمزور اقلیت کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن جب یہ اپنے مقصد یعنی مذہب کو

مٹانے اور اسکے حامیوں کو نیست ونابود کرنے میں ناکام رہتی ہے تو پھر یہ طاقتور اکثریت اسی کمزور اقلیت کے مذہب میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ عمل دین کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ اپنے مقصد کے حصول کی ایک درمیانی تدبیر ہوتی ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ باطل اکثریت حق کی شیدائی اقلیت سے خلوص نیت کیساتھ صلح نہیں کرتی بلکہ اسکے پیش نظر صلح کا مطلب التوائے جنگ ہوتا ہے نہ کہ اختتام جنگ اور التوائے جنگ کا مقصد چھوٹی جنگ کو ملتوی کر کے بڑی جنگ کی تیاری کرنا ہوتا ہے اور اسطرح باطل اکثریت مجبوراً کلمہ پڑھنے کے بعد حق کی حامی اقلیت کے خلاف گرم جنگ کو موقوف کر کے سرد جنگ پر آمادہ ہو جاتی ہے جس میں اسلحہ کے بجائے پروپیگنڈہ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ پروپیگنڈہ ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے عوام کا تو ذکر ہی کیا خواص بھی اس کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا دینا پروپیگنڈے کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

انبیاء ماسبق کی امتوں میں بھی طاقتور اکثریت اور کمزور اقلیت کا یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے اور ختمی مرتبتؐ کے زمانہ میں بھی یہ اصول ظہور پذیر رہا۔ مذہب اسلام جو حضرت خدیجہ' جناب ابو طالب اور حضرت علی کی اقلیت سے شروع ہوا۔ تیرہ سال تک باطل اکثریت سے اپنے ہی وطن میں مظالم سہتے اور پتھر کھاتے زندہ رہا۔ حتیٰ کہ جلاوطنی پر مجبور ہوا۔ اس جلاوطن اسلام کو دیار غیر میں بھی باطل پرست اکثریت نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ جنگ بدر سے صلح حدیبیہ تک متعدد حملے کئے گئے اور بالآخر ناکام ونامراد اکثریت مجبوراً کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ شب ہجرت ہو یا بدر' احد' خیبر' خندق اور حنین کے خونی معرکے ہوں یا جناب رسالتمآبؐ کی تجہیز و تکفین کا اہم ترین موقع ہو اللہ کے رسولؐ اور ان کے اسلام کیساتھ اقلیت ہی رہی۔

حصول مقصد کیلئے کلمہ پڑھنے والی اکثریت نے جب اپنا مقصد حاصل کرلیا تو غریب اقلیت کو نشانہ حدف بنانا شروع کردیا۔ احراق بیت فاطمہؑ' علیؑ کی گرفتاری' پچیس سال کی گوشہ نشینی' جمل' صفین و نہروان کی بغاوتیں' امام حسنؑ سے بے وفائی و بد عہدی' کربلا کا دل ہلا دینے والا واقعہ' اہلبیت رسول کی اسیری و تشہیر' زہر کے ذریعہ ہلاکتیں اور نسلی قتل عام کے ذریعے صدیوں انتقام کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ لیکن طاقتور اکثریت کی تمام ترکوششوں کے باوجود سخت جان شیعت اور اس سے زیادہ سخت جان اس کی حامی شیعہ اقلیت نہ جھک سکی اور نہ مٹ سکی۔ بالآخر ظالم اکثریت کے ہاتھ میں تلوار نہ رہی' قدموں کے نیچے سے خلافت و حکومت کی مسند کھسک گئی اور ملوکیت کا تاج پہننے والا سر ننگا ہو گیا۔ مگر پھر بھی بغض و عناد سے بھرے قلب و دماغ شیعیت کی دشمنی کی آگ کے آتش کدہ بنے رہے جنکا آتش فشانی لاوا پروپیگنڈے کے دھانے سے ابلتا رہا اور شیعت کو بدنام کرنے کیلئے رکیک حملے' من گھرت قصے' بدعت کے طعنے اور کفر کے فتوے جاری ہوتے رہے۔ اللہ کا وہ دین جس کی تبلیغ کیلئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے اور وہ قرآنی مذہب جس کیلئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں اسی مذہب کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ابن سباء یہودی کا ایجاد کردہ ہے۔ اس کے پیروکاروں کی تحقیر و تذلیل کے لئے انہیں رافضی' سبائی اور کافر تک کہا جاتا ہے۔
شیعت سے تعصب : اس پروپیگنڈہ مہم نے عام مسلمانوں میں شیعہ اور شیعت کے خلاف نفرت و تعصب کا مرض پھیلا دیا جو رفتہ رفتہ کینسر کی شکل اختیار کر گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر کسی کو یہ کہا جاتا کہ تو یہودی ہے تو وہ اسکا اتنا برا نہیں مانتا تھا جتنا کہ اگر اسکو یہ کہدیا جائے کہ تو شیعہ ہے! لہٰذا پتہ چلا کہ عام مسلمانوں کے لئے لفظ شیعہ گالی بن گیا تھا۔ اور وہ ہر معاملے

میں شیعوں کے عمل کے بر خلاف عمل کرتے تھے۔ آج بھی بعض انتہا پسند حلقے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ "شیعہ کافر ہیں' سبائی ہیں اور ان کی جان ومال محترم نہیں ہے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔" جب کہ شیعہ کہتے ہیں جو کوئی لا آلہ الا اللہ مُحَمَّدٌ الرَّسُولُ اللہ کہہ دے وہ مسلمان ہے اور اس کی جان واملاک محترم ہیں۔

اہلسنت کے ایک مشہور عالم دین شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی کا کہنا ہے کہ "اگرچہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا سنت رسول ہے لیکن چونکہ یہ شیعوں کا شعار بن گیا ہے اس لئے اس کا ترک واجب ہے۔" زمخشری نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں لکھا ہے کہ "معاویہ بن ابو سفیان نے سب سے پہلے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کی جو خلاف سنت ہے۔"[1] ان دونوں بیانات پر غور کریں تو یہ مطلب نکلتا ہے کہ چونکہ شیعہ سنت رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے ہیں لہٰذا اہلسنت نے سنت رسول کو ترک کر کے سنت معاویہ پر عمل کرتے ہوئے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کر دی۔ اسی طرح متعدد دیگر امور کی بابت بھی علماء نے لکھا ہے ان میں سے چند ایک ملاحظہ ہوں :

حجتہ الاسلام ابو حامد غزالی کہتے ہیں کہ

> "قبر کی سطح کو ہموار کرنا اسلام میں مشروع ہے مگر رافضیوں نے اسے اپنا شعار بنا لیا ہے اس لئے ہم نے اسے چھوڑ کر قبروں کو اونٹ کی کوہان کی شکل دے دی۔" (حوالہ عکم اذان ص: ۲۱۷)

ابن تیمیہ کا بیان ہے کہ

> "بعض فقہا کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مستحب شیعوں کا شعار بن جائے تو اس مستحب کو ترک کر دینا بہتر ہے گو ترک کرنا واجب نہیں۔

[1] ماخوذ از عکم اذان ص: ۲۱۷

> کیونکہ اس مستحب پر عمل میں بہ ظاہر شیعوں سے مشابہت ہے۔ سنیوں اور رافضیوں میں فرق کی مصلحت' مستحب پر عمل کی مصلحت سے زیادہ قوی ہے۔" (منہاج السنتہ النبویہ حوالہ عکم اذان ص: ۲۱۸)

حافظ عراقی سے جب یہ پوچھا گیا کہ تحت الحنک کس طرف کیا جائے تو انہوں نے کہا :

> "مجھے کوئی ایسی دلیل نہیں ملی جس سے داہنی طرف کی تعیین ہوتی ہو' سوائے اس کے طبرانی کے یہاں ایک ضعیف حدیث ضرور ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو تو شاید آپ داہنی طرف لٹکا کر بائیں طرف لپیٹ لیتے ہیں جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں مگر چونکہ یہ شیعوں کا شعار بن گیا ہے' اس لئے تشبہ سے بچنے کیلئے اس سے احتراز ہی مناسب ہے۔"
> (زرقانی' شرح المواہب حوالہ عکم اذان ص: ۲۱۸)

ملاحظہ فرمایا یہ ہے وہ تعصب جو سنت رسول پر عمل کے دعویدار ہمارے سنی مسلمان بھائی کسی سنت کو اس لئے ترک کر دیتے ہیں کہ اس سنت پر شیعہ پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ الحمد اللہ کہ اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ شیعہ ہی ہیں جو سنت رسول کا اتباع کرنے والے ہیں۔

اکثریت کا برتاؤ : جناب رسالتمآب کی وفات کے بعد ہی سے شیعان علیؑ وقتی سیاست کے محکوم ہو گئے تھے کیوں کہ انکے پیش نظر احکام خداوندی اور تعلیمات نبوی کے تحت اسلام کی بقاء وسربلندی تھی جسکے باعث وہ اپنی انقلابی قوت وطاقت کو بروئے کار لانے سے گریزاں تھے۔ البتہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دینی فریضے کی ادائیگی پر کاربند رہتے ہوئے قابل اعتراض امور پر اعتراضات کرتے رہتے تھے۔ انہی اعتراضات کے باعث وہ اکثریت سے علیحدہ ایک اقلیت نظر آتے تھے اور خلافت وحکومت کی حامی اکثریت اس اعتراض کرنے والی اقلیت کو ہتک آمیز نظروں سے دیکھتی تھی۔

ویسے تو ابتدا ہی سے شیعوں کو شدائد کا سامنا کرنا پڑا لیکن امیر المومنین حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد سے مشکل حالات میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور امیر شام کے دور اقتدار میں مشکل ترین صورتحال پیدا ہو گئی۔ حصول اقتدار کے فوراً بعد امیر شام عراق پہنچے اور اپنی پہلی تقریر میں لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ

> "میں تمہارے ساتھ نماز' روزے کیلئے جنگ نہیں کر رہا تھا' بلکہ میں چاہتا تھا کہ تم پر حکومت کروں اور اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔۔۔ میں نے حسن کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا وہ اب باطل ومنسوخ ہو چکا ہے"۔
> (تاریخ طبری ص ۱۲۴ ج: ۴' تاریخ ابن اثیر ص: ۲۰۳ ج: ۳)

یہ سن کر لوگ حیران وششدر ہو گئے اور ہر شخص سمجھ گیا کہ اب خاندان بنی ہاشم اور شیعان اہلبیت کو امن نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد امیر شام نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی بنی ہاشم کی تعریف اور ان کی شان میں کوئی حدیث بیان کریگا اس کی جان ومال کی ضمانت نہیں دی جائے گی۔[1] اس کے بعد امیر المومنین حضرت علیؑ کے خاص پیروکاروں کے قتل کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ عام شیعوں کو حضرت علیؑ کی پیروی اور اہلبیت و بنی ہاشم کی الفت کے جرم میں اسیر کر کے اذیتیں دی جانے لگیں۔ شکنجوں میں جکڑا جانے لگا اور ان کو تلقین وتاکید کی جانے لگی کہ وہ حضرت علیؑ کی حمایت وپیروی ترک کر دیں۔ جو اس تاکید کو قبول نہیں کرتا قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہانتک کہ معاویہ بن ابو سفیان اپنی بیعت لیتے وقت بیعت کرنے والے پر یہ شرط عائد کرتے تھے کہ وہ علیؑ پر تبرا کرے۔[2] جس کا آغاز امیر شام نے اقتدار میں آتے ہی کر دیا تھا اور جو مسلسل اسی برس تک پورے دنیائے اسلام

[1] النصائح الکافیہ ص: ۸۷' [2] عقد الفرید ص: ۱۹ ج: ۱

کی مساجد کے ممبروں سے علی الاعلان کیا جاتا رہا۔ جیسا کہ متعدد مورخین کے حوالوں سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ :

> "ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود' اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر' خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے' حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسولؐ پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؑ کی اولاد اور انکے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔"
> (خلافت وملوکیت ص: ۱۷۴ حوالہ الطبری ص: ۱۸۸ ج: ۴' ابن الاثیر ص: ۲۳۴ ج: ۳' البدایہ ص: ۲۵۹ ج: ۸ وغیرہ)

چودویں صدی کے مشہور ومعروف صاحب قلم ومحقق جناب علامہ ابو الکلام آزاد اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

> "پھر کیوں نہ وہ لوگ مستثنیٰ ہوں کہ ایسے مستثنیٰ لوگوں میں سے وہ بزرگ حق ومجدد شریعت الہیہ محی السنہ قامع بدعات مروانیہ و بنی امیہ یعنی حضرت عمر عبدالعزیزؒ تھے جن کو حکمت الہیہ نے اسی خاندان میں پیدا کیا تاکہ ان کے دست پرست پر شریعت اسلامیہ کا احیا ہو اور ملک عضوض کے اباطیل ومحدثات کا استیصال فرمائیں۔ پس اس وجود گرامی نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تجدید کی اور ایک ایک کر کے بنی امیہ وآل مروان کی پیدا کی ہوئی ان محدثات وبدعات ومنکرات شنیعہ کا انسداد کیا جنھوں نے خیر القرون کی شریعت خالص کو آلودہ ومکدر فسق ومعاصی شنی کر دیا تھا۔ ۔۔۔ سب سے پہلے سرزمین اسلام میں جو رحم ومحبت اور صلح واخوت ہی کی تخم ریزی کیلئے بنی تھی سب وشتم ولعن وجھڑے کا تخم بنوامیہ نے بویا اور مقدس مساجد اسلام میں جو صرف عبادت وطاعت الٰہی واذکار واشغال

مقدسہ کیلئے بنائی گئی تھیں اپنے اغراض نفسانیہ منکرۃ سیاسیہ سے اہلبیت نبوت اور حضرت امیر علیہ السلام پر اعلانیہ لعنت بھیجنا شروع کی اور جمعہ کے خطبہ ثانیہ میں اس فعل شنیع و منکر کو (کہ نہیں جانتا اس کو کن لفظوں سے تعبیر کروں) داخل کر دیا چنانچہ تکبیر و تسبیح کی صداؤں میں خطیب منبر پر چڑھتے تھے اور تحمید و تقدیس و صلوٰۃ و تسلیم کے بعد آخر میں حضرت علی علیہ السلام پر اعلانیہ لعنت بھیجتے تھے اور پھر شمشیر ظلم سے لوگوں کی زبانوں کو اس طرح لرزاں و ترساں رکھتے تھے کہ کسی کو اس صریح فسق عظیم و معصیتِ کبری و ہتک شریعت الٰہیہ کے خلاف لب کشائی کی جرات نہ ہوتی تھی۔ الا ماشاء اللہ وھم الذین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ لیکن تاریخ اسلام حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہمیشہ رہین منت رہے گی کہ انہوں نے تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی اس بدعت کا انسداد کیا اور مساجد اسلام کو انکی چھینی ہوئی عزت و حرمت واپس دلا دی چنانچہ لعن و حجرے کی جگہ خطبہ ثانیہ میں ان اللہ یامر بالعدل الخ داخل کیا یہ آیہ کریمہ آج تک خطبہ جمعہ کا جزو آخری ہے اور ہر ہفتہ سیاست بنی امیہ و حسنات عمر بن عبدالعزیز پر گواہی دیتی ہے۔

(الہلال جلد: ۳ ص: ۲۱ مورخہ ۱۹۱۳: ۵: ۲۸) (حوالہ تاریخ معاویہ و یزید ص: ۲۳۰)

حجر بن عَدَی کا قتل : معاویہ بن ابوسفیان کی شمشیر ظلم کا نشانہ بننے والوں میں خاندانِ بنی ہاشم کے افراد ہی نہ تھے بلکہ ایسے اصحابِ رسول بھی تھے جو حضرت علیؑ کی محبت کو جزو ایمان اور آپؑ کی حمایت و پیروی کو فرض جانتے تھے۔ انہی مظلومین میں سے ایک حجر بن عدی بھی تھے جو ایک زاہد و عابد صحابی رسول اور صلحائے امت میں بلند مرتبہ شخصیت تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کے قتل کا واقعہ تفصیل سے تحریر ہے[1] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

[1] ملاحظہ ہو الطبری ص: ۱۹۰-۲۰۷ ج: ۴' الاستیعاب ص: ۱۳۵ ج: ۱' ابن الاثیر ص: ۲۳۴-۲۴۲ ج: ۳' خلافت و ملوکیت ص: ۱۶۵' البدایہ والنہایہ ص: ۵۰-۵۵ ج: ۸' ابن خلدون ص: ۳ ج: ۳

جب معاویہ بن ابوسفیان کے حکم سے تمام مساجد کے ممبروں سے خطبوں میں حضرت علیؑ پر علانیہ سب و شتم کی مکروہ بدعت کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کو صدمہ پہنچا اور صلحا کے دل مجروح ہوئے۔ لیکن لوگ ظلم کے خوف سے خون کا گھونٹ پی کر خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ مگر حجر بن عدی کوفہ کے گورنر زیاد کے مقابل کھڑے ہو کر حضرت علیؑ کی تعریف و توصیف بیان کرتے اس جرم کی پاداش میں حجر بن عدی اور ان کے بارہ ساتھیوں کو زیاد نے گرفتار کر لیا اور ان پر فرد جرم عائد کی کہ

"انہوں نے ایک جتھا بنالیا ہے' خلیفہ کو اعلانیہ گالیاں دیتے ہیں' امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں' ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کیلئے درست نہیں ہے' انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا' یہ ابوتراب (حضرتُ علیؑ) کی حمایت کرتے ہیں' ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور انکے مخالفین سے اظہار براءت کرتے ہیں"۔

(خلافت و ملوکیت ص: ۱۶۴)

اس فرد جرم کے ساتھ ان اسیروں کو امیر معاویہ کے پاس بھجدیا جنھوں نے حکم دیا کہ " اگر یہ لوگ علی سے براءت کا اظہار کریں اور ان پر لعنت بھیجیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے"۔ جب ان لوگوں کے سامنے یہ شرط پیش کی گئی تو حجر بن عدی نے کہا "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو اللہ کو ناراض کرے"۔ آخر کار وہ اور انکے سات ساتھی قتل کر دیے گئے۔ اور ایک ساتھی عبدالرحمن بن حسان کو معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھجدیا اور اسکو لکھا کہ انھیں بدترین طریقہ سے قتل کرو۔ چنانچہ زیاد نے انھیں زندہ دفن کرادیا۔

امیر معاویہ کے اس اقدام پر مسلمانوں نے ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ حسن بصری فرماتے ہیں کہ

"حضرت معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک' ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا' حالانکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے' ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا' ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے' ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا' حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو' اور زانی کیلئے کنکر پتھر ہیں۔ چوتھے' ان کا حجر اور انکے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔" (خلافت و ملوکیت ص: ۱۹۶ حوالہ ابن اثیر ص: ۲۴۲ ج: ۳' البدایہ ص: ۱۳۰ ج: ۸)

ان بیانات سے اُس وقت کے ماحول کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ جب حضرت علیؑ کی حمایت و محبت کی وجہ سے معزز اصحاب رسول کے ساتھ حکمرانوں کا یہ طرز عمل ہو تو افراد بنی ہاشم و اولاد علی اور شیعانِ اہلبیت کے ساتھ ان کا برتاؤ کس قسم کا ہو گا۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ بنی ہاشم پر ڈھائے جانے والے مظالم کا سلسلہ اموی دورِ حکومت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ عباسی حکمرانوں نے' جن کا تعلق بنی ہاشم ہی سے تھا اور واقعہ کربلا کے ضمن میں چلنے والی تحریکوں کے باعث مسند حکومت پر بیٹھے تھے' اپنے پیش روؤں سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوئے۔ صدیاں گذر جانے کے باوجود خاندان بنی ہاشم اور دوستداران اہلبیت کے قتل و غارت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہمارے ملک میں منظم طریقے سے شیعوں کا قتل روز کا معمول بن گیا ہے آئے دن کہیں نہ کہیں سے کسی عالم دین' کسی مذہبی رہنما' کسی قابل شخصیت یا کسی سرگرم کارکن کے قتل کی خبر ملتی رہتی ہے۔ بہر حال ہم نے اپنے اس سلسلہ کتاب میں خاندان بنی ہاشم اور شیعان اہلبیت پر بنو امیہ اور بنو عباس کے مظالم کی بابت ان کے اپنے اپنے مقام پر ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ آلِ حرب اور آلِ مروان کے غیر انسانی و غیر شرعی اقتدامات اور افراد بنی ہاشم پر ڈھائے جانے والے مظالم کے پیش نظر اہلسنت والجماعت' جو خلفاء کی اطاعت کو اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں' یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ خلافت کو دو ادوار میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلا دور جو حضرت ابوبکرؓ سے شروع ہو کر صلح حسنؑ پر ختم ہوتا ہے اسے خلافت راشدہ کا نام دیا گیا۔ دوسرا دور جس کا آغاز صلح حسنؑ کے بعد معاویہ بن ابوسفیان کی حکمرانی سے شروع ہوتا ہے اس کو صرف خلافت کا نام دیا گیا ہے۔

تمت با الخیر

نگرانئ اِمام میں ہو گا یہ نیک کام
اچّھا ہے وقت خواب کی تعبیر کے لئے
محشر میں فاطمہؑ تجھے کر دیں گی سرخرو
اٹھ جنّت البقیع کی تعمیر کے لئے
آصف لکھنوی

Nigrani-e-Imam main hoga yeh nek kaam,
Achchha hai waqt khwab ki tabeer ke liye,
Mahshar main Fatema (s.a) tujhe kardengi surkhroo,
Uth Jannatul Baqi ki tameer ke liye.
Late: - Asif Lucknowi

ارتضٰی بن رضا نوازپوری
کی ایک اور مایۂ ناز کاوش
تاریخ بنی ہاشم
قدیم و جدید مستند کتب کی روشنی میں خاندانِ بنی ہاشم کے
آباء و اجداد، پسران و دختران، اُمہات و ازواج کے واقعات و حالات، عقائد و نظریات،
دینداری و دینی خدمات، نسلی و نسبی تسلسل اور باہمی رفاقت و رقابت کو
اس کتاب میں نئے زاوئیے اور نئے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ سلسلہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے

باب اوّل	آدمؑ	تا	ہاشمؑ	جلد اوّل 75/-
باب دوئم	ہاشمؑ	تا	خاتمؑ	
باب سوئم	خاتمؑ	تا	دائمؑ	جلد دوئم اور سوئم 90/- 90/-
باب چہارم	دائمؑ	تا	کاظمؑ	جلد چہارم (زیرِ طبع)
باب پنجم	کاظمؑ	تا	قائمؑ	جلد پنجم (زیرِ طبع)

اس کتاب کی معلوماتی اہمیت اپنی جگہ، اس کے علاوہ شجرہ جات
اور نقشہ جات کی شمولیت سے کتاب کی افادیت دوبالا ہوگئی ہے۔